McGill University Library
3 103 289 617 A

[illegible] میرے دل کی پوشیدہ بیتابیاں
میرے نالۂ نیم شب کا نیاز میری خلوت و انجمن کا گداز

یعنی

سلیم کے نام خطوط

جلد دوم

پرویز

شائع کردہ
ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵-بی-گلبرگ-لاہو

MH1 .P276sn

INSTITUTE
OF
ISLAMIC
STUDIES

50903 ★ v.2

McGILL
UNIVERSITY

میرے دیدہ تر کی بیخوابیاں   میرے دل کی پوشیدہ بیتابیاں
میرے نالہ نیم شب کا نیاز   میری خلوت و انجمن کا گداز

یعنے

سلیم کے نام

خطوط

Salim ke nam

پرویز

v. 2

جلد دوم

شائع کردہ

ادارۂ طلوع اسلام ۲۵۔ بی۔ گل برگ۔ لاہور

ملنے کا پتہ:

مکتبہ طلوع اسلام

۲۷۔ بی — شاہ عالم مارکیٹ — لاہور

Parvez
"

2630172
islm
v. 2
pb72

اِنتساب

MHI
P2768m
v.2

اُس کے نام

مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ (۲۶/۸۹)
جو اللہ (کے قانون) کی طرف قلبِ سلیم لے کر آئے۔

اگر یک قطرہ خوں داری اگر مُشتِ پرے داری
بیا من با تو آموزم طریقِ شاہبازی را

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست مشمولات

صفحہ

فہرست مشمولات ... (ج)
پیش لفظ ... (ض)

اٹھارواں خط

(خدا کا تصور)

ہر فرد کا الگ الگ خدا، یعنی خدا کا انفرادی تصور ... ۴
ایسا خدا ذہن انسانی کا تراشیدہ ہے ... ۵
خدا کے متعلق قرآنی تصور ... ۷
خدا اپنی صفات کے ساتھ ازل سے موجود ہے، ابد تک رہے گا ۸
یہ صفات مستقل بالذات اور موجود فی الخارج ہیں ... ۸
ان صفات کا علم بذریعۂ وحی عطا کیا گیا ... ۸

صفحہ

قرآن اسی تعارف خداوندی کا آخری خریطہ ہے ... ۸
خدا کا ماننا اور نہ ماننا ہنسی کی بات نہیں ... ۹
زندگی کی تمام حرکتیں اسی محور کے گرد گردش کر رہی ہیں ... ۹
کسی فرد کو انسان بننے کے لئے کونسا نمونہ سامنے رکھنا چاہئے ... ۱۱
ایمان کے معنی کیا ہیں؟ ... ۱۲
توحید کیا ہے؟ ... ۱۳
توحید کا لازمی نتیجہ وحدت انسانیت ہے ... ۱۴
صحیح ایمان ہی صحیح اعمال کی بنیاد ہے ... ۱۵
انسانی ذات کی تربیت اجتماعی نظام میں ہوگی ... ۱۶

50903

صفحہ

قانون خداوندی کی وضاحت ... ۱۸
اس قانون کی محکمیت اور عالمگیریت ... ۲۱
انسانی زندگی میں اس قانون کی کارفرمائی ... ۲۵
خدا کی صفت ربوبیت ... ۳۰
قرآنی معاشرے میں توحید کا آئینی پہلو اور اس کا عملی اثر ... ۳۳
خدا کا تعارف ان صفات کی رو سے ہوتا ہے جو وحی کے ذریعے متعین ہوں ... ۳۶
یہ وحی آج صرف قرآن کے اندر ہے۔ ۳۶
لہذہ قرآن کی وحی پر ایمان کے بغیر، ایمان کوئی شے نہیں ... ۳۸

آنیسواں خط

(مقام محمدیؐ)

مقام نبوت، ماورائے سرحد ادراک ہے ... ۴۰

صفحہ

مروجہ عیسائیت کے باعث، مغربی محققین کی نفس وحی سے بد گمانی ... ۴۱
ہیومن ازم کی فکری تحریک ... ۴۲
قرآن ایسے عناصر کو للکار کر پکارتا ہے ... ۴۲
مستقل اقدار پر ایمان ضروری ہے ... ۴۵
مغربی مفکرین نے اپنے مسلک کی غلطی محسوس کر لی ہے ۴۶
عرب کے بادیہ نشینوں کو مقام نبوت سمجھانے کا قرآنی انداز ... ۴۸
سورۂ والنجم کی تفسیر ... ۵۰
مقام محمدیؐ کا تذکرۂ جلیلہ ... ۵۹
نبی کو پہلے ہی دن سے منصب نبوت کے لئے تیار کیا جاتا ہے ... ۶۲
وہ افق اعلیٰ جس پر نبی فائز ہوتا ہے ... ۶۶
نبی کا فریضہ اور منصب ... ۶۸
نبوت اور رسالت ــ ایک ہی حقیقت کے دو گوشے ... ۷۴

صفحہ
نبی جو کچھ دیکھتا ہے، وہ خواب نہیں بلکہ، اٹل حقیقت ہوتی ہے ... ۷۸
عقل انسانی اور نگہ نبوی میں فرق ... ۸۱
نبوت، نبی اکرمؐ کے ساتھ ختم ہو گئی — لیکن، وحی کی روشنی میں، نظام خداوندی کا قیام اُمت کا فریضہ ہے ... ۸۳
انسانی نجات و سعادت کی اب صرف ایک ہی راہ ہے یعنی، اتباع نبوی سے، پھر اُسی نظام کا قیام ... ۸۳

بیسواں خط

(کائنات کے دو عظیم انقلاب)

انسانی ذات کے استحکام کے معنی! ... ۸۶
تقلید کی زنجیریں ... ۸۶
تخلیق کائنات ایک محیر العقول کارنامہ ہے ... ۸۷
اس پروگرام میں دو عظیم مقام ۸۷
کائنات کی تخلیق بالمقصد ہوئی ہے یعنی ایک پلان کے مطابق ۸۸
کائنات کی ہر شے از خود ایک قانون کی پابند چلی آ رہی ہے ... ۸۹
سلسلۂ کائنات میں پہلا عظیم انقلاب ... ۹۲
— یعنی انسان کی پیدائش — ۹۲
انسان کو صاحب اختیار و ارادہ پیدا کیا گیا ... ۹۲
اور منتخب افراد کے ذریعہ اسے وحی کا علم پہنچایا گیا ... ۹۲
یہ منتخب اور برگزیدہ انسان نبی اور رسول کہلائے ... ۹۲
انسان کی منفرد خصوصیتیں ۹۶
وحی، عقل انسانی کی راہ نمائی کرتی ہے ... ۹۸

(دوسرا عظیم انقلاب)

وحی ہمیشہ کے لئے قرآن میں محفوظ کر دی گئی اور نبوت کا خاتمہ ہو گیا ... ۱۰۰
ہر دو انقلابات کس حقیقت کا اعلان تھے؟ ... ۱۰۱
ختم نبوت کا مفہوم ... ۱۰۱

صفحہ

کشف و الہام اور مہدئ آخر الزماں کے عقائد ... ۱۰۳
یہ عقائد ختم نبوت کے اعلان کے منافی ہیں ... ۱۰۳
ختم نبوت کے بعد امت کا طریق کار — وحی کے غیر متبدل اصولوں کے اندر رہتے ہوئے جزئیات مرتب کرنے کی آزادی ... ۱۰۶
لیکن ہوا کیا ؟ ... ۱۰۷
خلاصہ مبحث ... ۱۰۸

اکیسواں خط

(عید میلاد النبی)

رسول اللہ ص قرآنی سیرت کے درخشندہ پیکر تھے ... ۱۱۱
رسالت محمدیہ ص کا مقصود کیا تھا ؟ ... ۱۱۳
انسانیت کن زنجیروں میں جکڑی چلی آرہی تھی ؟ ... ۱۱۵
افراد کے بجائے صرف قانون کی اطاعت ... ۱۱۷

صفحہ

انسانیت کی تاریخ میں ختم نبوت کا اعلان سب سے بڑا انقلاب تھا ... ۱۲۰

بائیسواں خط

(رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ)

قومی تیوہار اجتماعی جذبات کے ترجمان ہوتے ہیں ... ۱۲۷
نزول قرآن کا جشن ... ۱۲۸
نبی اکرم ص نے قرآنی حقائق کو محسوس و مشہود نظام میں متشکل کیا ... ۱۲۸
اس لئے ان کی حیات طیبہ کی یاد ایک جشن مسرت ہے ... ۱۲۹
حضور ص تمام اقوام عالم کے لئے کیوں کر رحمت تھے ؟ ... ۱۳۲
غیر مسلم مشاہیر کا اعتراف ۱۳۳
ملوکیت اور پیشوائیت کے استبداد کا خاتمہ ... ۱۳۷
ختم نبوت کا مفہوم علامہ اقبال کے نقطۂ نظر سے ... ۱۳۸
برفو کا اعتراف حقیقت ... ۱۴۳
لیبرٹائن کا خراج تحسین ... ۱۴۵

صفحہ

تئیسواں خط

(درود کا مفہوم)

سورۂ ابراہیم کی پہلی آیت — اور اس کا مفہوم ... ۱۵۳
" ظلمت سے نور کی طرف لانے " کی حقیقت کیا تھی ؟ ... ۱۵۴
نبی اکرمؐ نے پوری نوع انسانی کے لئے اس مقصد کی تکمیل کی ... ۱۵۵
" نزول ملائکہ " کا مفہوم کیا ہے ؟ ... ۱۵۶
مختلف آیات سے " صلوٰۃ " کے مفہوم کی وضاحت ... ۱۵۷
یہ مجاہدانہ سعی و عمل اور جانفروشانہ طاعت و فرماں پذیری کا ایک عملی پروگرام ہے ... ۱۶۴
'یہ کرنے' کا پروگرام تھا جو رفتہ رفتہ 'پڑھنے' میں بدل گیا ۱۶۴

چوبیسواں خط

(اطاعت رسول)

صفحہ
دین کا مطلوب و مقصود — انسانی محکومی کا خاتمہ اور خدا کی اطاعت ... ۱۶۵
یہ اطاعت کتاب اللہ کی رو سے ہوگی ... ۱۶۸
مذہب اور دین میں خدا کی اطاعت کا مفہوم الگ الگ ہے ... ۱۶۹
خدا کی اطاعت ، رسول کی وساطت سے کی جا سکتی ہے ... ۱۷۰
خدا اور رسول کی اطاعت — ایک ہی اطاعت کا نام ہے ۱۷۴
اولی الامر سے اختلاف کی صورت میں معاملہ مرکز کے حوالے کیا جائیگا ... ۱۷۸
جزئیات کا تعین باہمی مشاورت سے ہوگا ... ۱۸۰
دین میں کتاب اللہ کی اطاعت محسوس شخصیت کے ذریعے ہو سکتی ہے ... ۱۸۲
" سبیل المومنین " اور " خلافت علی منہاج نبوت " کا مفہوم ۱۸۳
نبی اکرمؐ کے بعد جزئیات کا تعین کیسے ہوتا تھا ؟ ... ۱۸۴
خلفائے راشدین کے بعد یہ سلسلہ منقطع ہو گیا ... ۱۸۸

صفحہ

اور دین، مذہب میں تبدیل ہوگیا ۱۸۸
موجودہ حالات میں باز آفرینی کی صورت کیا ہو؟ ... ۱۸۹

پچیسواں خط

(اسلامی قانون شریعت کے مآخذ)

پاکستان میں اس مسئلہ کی اہمیت بڑھ گئی ہے ... ۱۹۳
مروجہ چار مآخذ، مسلمہ کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں ۱۹۳
اس مسلمہ کی حقیقت کیا ہے؟ ۱۹۴
"قیاس" کے جواز اور عدم جواز میں اختلاف۔ "اہل الرائے" کے نزدیک بھی اب اجتہاد کا دروازہ بند ہو گیا ہے ... ۱۹۶
ایسا کیوں ہوا؟ ... ۱۹۷
ایک اہم حقیقت کا بیان، علامہ اقبال رح کے الفاظ میں ... ۱۹۸
"اجماع" سے کیا مراد ہے؟ یہ آجتک طے نہیں پا سکا - ۲۰۱
"اجماع" کی فنی تعریف اور مختلف شکلیں - ... ۲۰۲
حدیث اور سنت کا مفہوم - ان میں فرق کیا ہے؟ ... ۲۰۳

صفحہ

اس سلسلے میں جو مختلف سوالات پیدا ہوئے ... ۲۰۵
یہ مباحث نئے نہیں - بہت پہلے سے چلے آ رہے ہیں ... ۲۰۸
قانون سازی کے سلسلے میں سنت کی متفقہ علیہ تعبیر طے کرنی پڑے گی - چشم پوشی سے کام نہیں چل سکتا ... ۲۰۹
قرآن — یہ کتاب اللہ بھی اختلافی عقائد سے محفوظ نہیں ۲۰۹
قرآن تمام انسانوں اور تمام زمانوں کے لئے غیر متبدل اصول لایا ... ۲۱۲
جزئیات کا تعین (ان اصولوں کے تحت امت کی باہمی مشاورت پر چھوڑ دیا گیا - ۲۱۲
خلافت راشدہ میں حسب ضرورت سابقہ فیصلوں میں تبدیلیاں ہوتی رہیں ... ۲۱۳
انسانی صلاحیتوں کی نشو و نما اسی صورت میں ممکن تھی ۲۱۴

صفحہ

قانون شریعت کا ماخذ — درحقیقت — ایک ہی ہے یعنی کتاب اللہ ۔ ... ۲۱۶
باقی تین شقیں دراصل قانون کی تدوین و تنفیذ کے طریقے ہیں ... ۲۱۶

چھبیسواں خط

(پاکستان میں قانون سازی کا اصول)

خارجی کائنات — یہ ہر آن تغیر پذیر ہے ۔ ... ۲۱۸
مادی تصورات — انسان بھی دیگر اشیائے کائنات کی طرح ایک مادی تخلیق ہے ۔ ... ۲۱۹
لیکن اسلام کے نزدیک انسان عبارت ہے جسم اور ذات سے ۲۲۰
لہذا یہ مظہر ہے ثبات اور تغیر کا ... ۲۲۰
تغیر سے متعلق قوانین عقل کی رو سے متعین کئے جا سکتے ہیں
لیکن ثبات سے متعلق قوانین وحی کی رو سے ملتے ہیں ... ۲۲۱

صفحہ

انہیں "مستقل اقدار" یا "سنت اللہ" کہا جاتا ہے ۲۲۱
اس ضمن میں علامہ اقبال رح کی تفصیلی بحث ... ۲۲۵
ایک مکتب فکر کا نظریہ — احادیث، قرآن کی طرح غیر متبدل ہیں ... ۲۲۷
دوسرے مکتب فکر کی رائے — حالات کے تغیر سے احکام سنت میں تغیر ضروری ہے ۲۳۰
یہ مسلک نیا نہیں، قدیم سے چلا آ رہا ہے ... ۲۳۱
امام ابو حنیفہ رح اور شاہ ولی اللہ رح کا مسلک یہی تھا ۲۳۱
علامہ اقبال رح کی تائیدی رائے ۲۳۱
قرآنی دلائل و بینات کا ملخص ۲۳۴
خلافت راشدہ میں جزئیات کا تعین کیسے ہوتا تھا ... ۲۳۹
قرآن کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں، معاشرے کی تشکیل جدید اسلام کی اصل و غایت ہے — اقبال رح کا محاکمہ ... ۲۴۲

صفحہ

ستائیسواں خط

(جشن نزول قرآن)

کائنات کی ہر شے خدا کے مقرر و متعین قانون کے مطابق سرگرم عمل ہے ... ۲۵۰
انسانی زندگی کے لئے بھی مستقل اقدار مقرر ہیں ... ۲۵۱
قرآن ان مستقل اقدار کا سرچشمہ ہے ... ۲۵۱
اور بڑے ہی شرف و مجد کا حامل اور نوع انسانی کے لئے عزت بخش ... ۲۵۲
قرآن کا لانے والا رسول بھی معزز اور واجب التکریم ... ۲۵۲
قرآن کا آغاز نزول ایک مبارک رات میں ہوا ... ۲۵۵
" لیلة القدر " میں قدر کا مفہوم کیا ہے ... ۲۵۶
مستقل اقدار ہی انسانی زندگی کا سہارا ہیں ... ۲۵۶
" ملائکہ " اور " الروح "

صفحہ

سے مراد کیا ہے ... ۲۵۹
وحیٔ خداوندی کے مطابق نظام زندگی کی تشکیل کا نتیجہ کیا ہوتا ہے ... ۲۶۰
نزول قرآن کا جشن مناؤ ــ سورۂ یونس میں اعلان ... ۲۶۳
نزول قرآن کا مقصد کیا ہے اور اسکی عملی تشریح کیا ؟ ۲۶۵
یہ ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے ۲۶۷
اس میں نہ کوئی اختلاف ہے ، نہ تضاد ... ۲۶۸
یہ ایک غیر منقسم وحدت ہے۔ ۲۶۹
تدبر فی القرآن کا طریق کیا ہو؟ ۲۶۹
قرآن نے انسان کو صحیح مقام سے آگاہ کیا ... ۲۷۲
بعثت محمدیہ ص کا مقصد نوع انسان کی غلامی کی زنجیروں کو توڑنا تھا ... ۲۷۳
لیکن یہ تمام زنجیریں امت نے احترام سے پھر گلے میں ڈال لیں ... ۲۷۴
بلکہ قرآن کو بھی مستعار نظریات کی رسیوں سے باندھ دیا ... ۲۷۴

صفحہ

قرآن پھر وهی آزادی اور سربلندی عطا کر سکتا هے ۲۷۶

اٹھائیسواں خط

(اندھے کی لکڑی)

اسلاف پرستی کوئی نئی چیز نہیں۔ اندھوں کی یہ قطار پہلے هی دن سے چلی آ رهی هے ... ۲۷۹
حضرت نوحؑ نے ان اندھوں کو پکارا — ان کا جواب ... ۲۷۹
حضرت صالحؑ کی دعوت حق ۲۸۰
پھر حضرت ابراهیمؑ یہی دعوت لے کر آئے ... ۲۸۰
حضرت شعیبؑ نے بھی انہیں دعوت حق دی ... ۲۸۱
آخری نبیؐ کی دعوت کا بھی وهی جواب ... ۲۸۱
هر دور میں اسلاف پرستوں کا جواب ایک هی تھا ... ۲۸۳
یہ روش (اسلاف پرستی) کیوں اس قدر پسندیدہ هے۔ ... ۲۸۴
موسیٰؑ و فرعون کا مکالمہ ... ۲۸۷

صفحہ

اسلاف پرستی کے نتائج دور رس اور تباہ کن هوتے هیں ... ۲۸۸
قومیں فکر و نظر کی روشنی سے محروم هو جاتی هیں۔ .. ۲۸۹
اور انسانی سطح سے گر کر حیوانی سطح پر پہنچ جاتی هیں ... ۲۹۰
ایک عجیب مقولہ — خطائے بزرگاں گرفتن خطاست ... ۲۹۳
تدبر و تفکر کی قرآنی دعوت هر دور کے لئے هے ... ۲۹۸
اسلاف پرستی نے یہ دروازہ بند کر دیا ... ۳۰۰
جہنم میں قومی پیشواؤں اور متبعین کا مکالمہ ... ۲۳۸
اُمت کو اس چکر سے اب قرآنی دعوت هی نجات دلا سکتی هے ... ۳۰۵
اسلاف پرستوں کی طرف سے اس دعوت کی مخالفت ضرور هوگی ... ۳۰۶
لیکن اُمت کو بچانے کے لئے اور کوئی چارۂ کار نہیں ۳۰۷

صفحہ

انتیسواں خط

(فرقے کیسے مٹ سکتے ہیں؟)

ضابطۂ خداوندی کو محکم طور پر تھام لو ... ۳۰۸
اس قرآنی محاکمہ کی توضیح ... ۳۰۸
یہ کوئی نیا اصول زندگی نہیں ۳۱۰
تفرقہ بازی شرک سے بڑھ کر ہے۔ ہارونؑ و موسیٰؑ کا مکالمہ ... ۳۱۱
فرقہ سازی کا جذبۂ محرکہ کیا ہے؟ ... ۳۱۳
نزول قرآن کا مقصد وحدت امت تھا ... ۳۱۴
تفرقہ بازی کے خلاف قرآنی انتباہ ... ۳۱۶
تفرقہ بازی شرک ہے۔ ... ۳۱۷
فرقہ سازوں سے رسولؐ کا کوئی تعلق نہیں ... ۳۱۸
صلوٰۃ وجۂ جامعیت ہے ... ۳۱۹

صفحہ

مسجد ضرار کی قرآنی تفصیل ۳۲۰
امت واحدہ کی تشکیل ... ۳۲۱
بعد میں امت پر کیا گذری ۳۲۱
میری امت کا اختلاف رحمت ہے ــ ایک حدیث ... ۳۲۲
صرف ایک فرقہ ناجی ہوگا ــ ایک اور حدیث ... ۳۲۳
’’مسلمہ فرقوں‘‘ کو آئینی سند مل گئی ... ۳۲۵
اختلافات مٹانے کا قرآنی طریق ۳۲۷
’’فیکم رسولہ‘‘ ــ کا مفہوم۔ ۳۲۹
رسولؐ خدا کی طبیعی موت کے بعد ... ۳۲۹
رسول خدا کے بعد اب جانشین پوری امت ہے ... ۳۳۲
دور ملوکیت میں سیاست اور مذہب کی تفریق ... ۳۳۳
پارٹی بازی عدالت خداوندی میں سنگین جرم ہے ... ۳۳۷
قرآنی نظام کے سوا اور کوئی علاج نہیں ... ۳۳۸

پیش لفظ

"سلیم کے نام خطوط" کا تفصیلی تعارف جلد اول کے پیش لفظ میں کرایا جا چکا ہے۔ اس کے دہرانے کی یہاں ضرورت نہیں۔ اس جلد میں سترہ خطوط شامل ہو گئے تھے۔ خیال یہ تھا کہ بقایا خطوط جلد دوم میں درج ہو جائیں گے، لیکن طباعت کے وقت معلوم ہوا کہ ایسا ہونا مشکل ہے۔ چنانچہ زیر نظر جلد میں بارہ خطوط شامل ہو سکے ہیں۔ اب بقایا خطوط تیسری جلد میں شامل ہوں گے۔

دین کی ساری عمارت خدا، رسول اور وحی کے تصور پر استوار ہوتی ہے۔ اگر یہ تصورات صحیح ہیں تو دین کے متعلق بھی صحیح تصور قائم ہوگا۔ اگر ان میں کوئی غلطی یا خامی ہے تو دین کا صحیح نقشہ ذہن میں نہیں آ سکتا۔ زیر نظر جلد میں جو خطوط شائع ہو رہے ہیں، وہ بیشتر انہی تصورات پر مشتمل ہیں۔ ان میں سب سے پہلے "خدا کا تصور" سامنے آتا ہے۔ خدا کے متعلق

عام تصور یہی ہے کہ وہ کائنات سے باہر، انسانی دنیا سے الگ، اپنے عرش حکومت پر بیٹھا ہے۔ ہمارا فریضہ یہ ہے کہ ہم اس کے احکام بجا لاتے رہیں۔ اس سے وہ خوش ہو جاتا ہے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو وہ ناراض ہو کر انسانوں کو جہنم میں ڈال دیتا ہے۔ یہ تصور غیر قرآنی ہے۔ اس جلد کے پہلے خط میں (جو سلسلہ کے اعتبار سے اٹھارواں خط ہے) یہ بتایا گیا ہے کہ قرآن کی رو سے خدا کا صحیح تصور کیا ہے اور اس کا ہمارے ساتھ کیا تعلق ہے؟

خدا کے بعد اس کے رسول کا مقام ہے۔ رسول کی ایک حیثیت تو یہ ہے کہ اسے خدا کی طرف سے وحی عطا ہوتی ہے اور دوسری حیثیت یہ کہ وہ اس وحی کی رو سے انسانی معاشرے کو صحیح خطوط پر متشکل کرتا ہے۔ رسول کی یہ حیثیتیں عجیب و غریب حقائق کو سامنے لاتی ہیں جن کا تفصیلی تذکرہ انیسویں خط میں سامنے آئے گا۔

اس کے ساتھ ہی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسانوں کی راہ نمائی کے لئے یہ طریق کیوں اختیار کیا گیا کہ ایک فرد کو وحی دی گئی اور باقی انسانوں کو اس وحی پر ایمان لانے کے لئے مکلف کر دیا گیا؟ اس سوال کا جواب بیسویں خط کے پہلے حصے میں دیا گیا ہے۔ اس کے دوسرے حصے میں یہ بتایا گیا ہے کہ ختم نبوت کا فلسفہ کیا ہے؟

اکیسواں خط بھی نبوت اور رسالت کے مقامات کی مزید تفاصیل کو اپنے آغوش میں لئے ہے اور بائیسویں خط میں اس حقیقت کو نمایاں کیا گیا ہے کہ نبی اکرمؐ کی بعثت کس طرح تمام دنیا کے لئے موجب ہزار رحمت ہے؟

تئیسویں خط میں یہ حقیقت سامنے لائی گئی ہے کہ نبی اکرمؐ پر جو درود پڑھا جاتا ہے، اس کا قرآنی مفہوم کیا ہے؟

دین کی پوری عمارت ” خدا اور رسول کی اطاعت “ کے سہارے قائم ہوتی ہے ۔ رسول اللہؐ کی حیات طیبہ میں حضورؐ کی اطاعت کا طریق واضح تھا ۔ سوال یہ ہے کہ حضورؐ کی وفات کے بعد یہ اطاعت کس طرح سے کی جائے گی ؟ چوبیسواں خط اس اہم سوال کے جواب پر مشتمل ہے ۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اسلامی شریعت کے چار مآخذ ہیں ۔ قرآن ، حدیث ، اجماع اور قیاس ۔ پچیسویں خط میں یہ بتایا گیا ہے کہ ان چار مآخذ کی پوزیشن کیا ہے۔ اور چھبیسواں خط یہ واضح کرتا ہے کہ اسلامی مملکت میں قانون سازی کا اصول کیا ہے۔

اسلامی مملکت میں قانون کی بنیاد ، قرآن کریم کے غیر متبدل اصول ہوتے ہیں ۔ ستائیسویں خط میں قرآن کی عظمت کی یاد تازہ کرائی گئی ہے ۔

لیکن قرآن کو تدبر سے سمجھا جا سکتا ہے ، اندھی تقلید سے نہیں ۔ اٹھائیسویں خط میں یہ بتایا گیا ہے کہ قرآن کریم اندھی تقلید کو کس طرح تباہیوں اور بربادیوں کا موجب قرار دیتا ہے اور علم و بصیرت اور دانش و بینش سے کام لینے کی کتنی سخت تاکید کرتا ہے ۔

اٹھائیسواں خط اس خار در خار سوال کا جواب پیش کرتا ہے کہ مسلمانوں کے فرقے مٹ کر یہ قوم پھر سے کس طرح امت واحدہ بن سکتی ہے ؟ سوال کی اہمیت اور پیچیدگی خود اس کے جواب کی اہمیت کی دلیل ہے ۔

یوں یہ تمام خطوط ایک ہی سلسلے کی کڑیاں بن جاتے ہیں ۔ ان خطوط کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان میں کا ہر خط فی ذاتہ مکمل ہے ، لیکن جب انہیں مسلسل پڑھا جائے تو ان میں عجیب و غریب ربط نظر آتا ہے ۔

تیسری جلد کے لیے حسب ذیل خطوط اس وقت موجود ہیں :

۱۔ علماء کون ہیں ؟
۲۔ تصوف کی تاریخ ۔
۳۔ صوفیائے کرام ۔
۴۔ تصوف اور قرآن ۔
۵۔ قوموں کے تمدن پر جنسیات کا اثر ۔
۶۔ تقدیر آمم کیا ہے ؟
۷۔ فقط ایک بار دیکھا ہے ۔
۸۔ ہماری تاریخ ۔
۹۔ اسلامک آئیڈیالوجی ۔
۱۰۔ اسلام آگے کیوں نہ چلا ؟

ہو سکتا ہے کہ طباعت کے وقت ان میں اور خطوط کا بھی اضافہ ہو جائے ۔ تیسری جلد کی اشاعت کے بعد ہم اطمینان سے کہ سکیں گے کہ دین کے متعلق جو کچھ نوجوانان ملت سے اس وقت تک کہا گیا ہے، اسے ہم نے عمدہ پیکروں میں ان کے سامنے پیش کر دیا ہے ۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمْ

والسلام

ناظم ادارہ طلوع اسلام
۲۵۔ بی ۔ گلبرگ ۔ لاہور

دسمبر ۱۹۵۹ء

سلیم کے نام

خطوط

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اٹھارھواں خط

خدا کا تصوّر

ارے بابا! تم تو چاھتے ھو کہ بس اللہ میاں کو تمہارے سامنے لا کر کھڑا کر دیا جائے تو پھر تمہارا اطمینان ھو ۔ غنیمت یہ ھے کہ تم جناب کلیم اللہؑ کی طرح رَبِّ اَرِنِیْ اَنْظُرْ اِلَیْکَ (یا اللہ! مجھے اپنا آپ دکھا کہ تجھ سے نگاہ کامیاب ھو سکے) ھی کہتے ھو، بنی اسرائیل کی طرح یہ نہیں کہتے کہ لَنْ نُّؤْمِنَ لَکَ حَتّٰی نَرَی اللّٰہَ جَھْرَۃً (ھم اس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے جب تک خدا کو اپنے سامنے نہیں دیکھ لیں گے)۔ یہی فرق ھے ایک قلبِ سلیم اور ذھنِ سرکش میں ۔

سلیم! پہلے تو یہ سمجھ لو کہ دنیا جب بھی خدا کے متعلق بات کرے گی وہ بات درحقیقت خدا کے متعلق نہیں ھوگی بلکہ خدا کے متعلق انسانی تصوّرات (Our ideas about God) کی بات ھوگی ۔ اس لئے کہ انسانوں کے خود ساختہ مذاھب نے خدا کا انفرادی تصوّر دیا ھے ۔ یعنی ھر فرد کے ذھن میں خدا کا

الگ الگ تصوّر۔ اور انفرادی تصوّر ہمیشہ داخلی (Subjective) ہوتا ہے۔ اس لئے ہر فرد کا خدا الگ الگ ہوتا ہے۔ اس قسم کے (Subjective God) کے تصوّر میں حقیقی توحید آ ہی نہیں سکتی۔ غریب کا خدا اور قسم کا ہوگا، امیر کا اور قسم کا۔ مایوس کا خدا اور قسم کا ہوگا، کامیاب کا اور قسم کا۔ فاتح و منصور کا خدا اور قسم کا ہوگا، مفتوح و محکوم کا اور قسم کا۔ اور آگے بڑھئے تو جیمس جینز (James Jeans) کا خدا اور قسم کا ہوگا، وائٹ ہیڈ کا اور قسم کا۔ حتیٰ کہ ایک ہی فرد کی مختلف حالتوں میں مختلف خدا ہوں گے۔ ہماری بیماری کی حالت کا خدا اور قسم کا ہوگا، تندرستی کی حالت کا خدا اور قسم کا۔ صفراوی غلبہ کی حالت میں خدا اور قسم کا ہوگا، بلغمی مزاج میں اور قسم کا۔ افراد سے آگے بڑھئے تو قبائلی خدا (Tribal God) کی باری آتی ہے۔ ایک جابر و سرکش قوم کا خدا اور قسم کا ہوگا، اور مظلوم و مقہور قوم کا خدا اور قسم کا۔ ٹھگوں کا خدا اور قسم کا ہوگا اور کبیر پنتھیوں کا اور قسم کا۔ بنی اسرائیل کے دور شوکت و سطوت کا خدا اور قسم کا تھا اور زوال و انحطاط (بیت المقدس کی بربادی اور اس کے بعد ”مسیح کی بھیڑوں“) کے زمانہ کا خدا اور قسم کا۔ وہ جو کہا گیا ہے کہ اگر تم نے دیکھنا ہو کہ فلاں دور میں فلاں قوم کا تمدن کیسا تھا تو یہ دیکھو کہ کہ اس دور میں اس قوم نے اپنی پرستش کے لئے کس قسم کا خدا وضع کر رکھا تھا تو وہ اسی تفصیل کی سمٹی ہوئی شکل ہے۔ انسان اپنے سے باہر کسی مجرّد (Abstract) شے کا تصوّر کر ہی نہیں سکتا۔ اس لئے ذہن انسانی کا تراشیدہ خدا ہمیشہ انسانی جذبات و عواطف کا پیکر ہوتا ہے۔ جس قسم کے امیال و عواطف اور جذبات و احساسات، اسی قسم کا خدا۔ کہنے کو تو یہ کہا جاتا ہے کہ ”خدا نے انسان کو اپنی شکل پر ڈھالا ہے“ لیکن حقیقت یہ

ہے کہ انسان خدا کو خود اپنی شکل پر ڈھالتا ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ انسان کے ہاتھ، پاؤں، سر، آنکھیں، ناک، کان، چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں، خدا کے بڑے بڑے ہوں گے۔ انسان کے دو ہاتھ ہوتے ہیں خدا کے دس ہوں گے۔ انسان اپنی مٹھی میں ذرا سی چیز دبا سکتا ہے، ایشور اپنی مٹھی میں جوالا مکھی پہاڑ لے سکتا ہے۔ انسان دو چار گھونٹ پانی پی سکتا ہے، دیوتا پورے کا پورا سمندر چڑھا لیتے ہیں۔ یا یہ کہ انسان غصے میں آکر کسی ایک انسان کے تھپڑ مار دیتا ہے، خدا غصے میں آکر قوم کی قوم کو تباہ و برباد کر دیتا ہے۔ وقس علیٰ ھذا۔

تم نے دیکھا سلیم! کہ اس قسم کے (Subjective God) کا تصوّر کس قدر کمزور بنیادوں پر قائم ہوتا ہے اور کس طرح انسانی تصوّرات کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ جب (Allan Grant) یا اسی قسم کے دیگر مغربی مصنّفین یہ کہتے ہیں کہ خدا ذہن انسانی کے تدریجی ارتقاء کا پیدا کردہ ہے تو ان کا مطلب اسی قسم کے (Subjective God) سے ہوتا ہے جس کا تصوّر "مذہب*" پیش کرتا ہے۔ اس قسم کا خدا چونکہ ذہن انسانی کا تراشیدہ ہوتا ہے، اس لئے وہ ذہن انسانی کی ارتقائی منازل کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے۔

اب آگے بڑھو سلیم! اس قسم کے (ذہن انسانی کے پیدا کردہ) خدا کی صورت میں ایک دقت اور بھی ہوتی ہے۔ تم نے خود ہی یہ قصہ سنایا تھا کہ جب عمربخش اور خداداد کا مقدمہ چل رہا تھا تو دونوں، نماز کے بعد، اپنی اپنی کامیابی کی دعائیں مانگا کرتے اور دونوں خدا کے حضور منّتیں مانا

---

*اس حقیقت کو ہمیشہ سامنے رکھئے کہ مذہب کا لفظ انسانوں کے خود ساختہ مذاہب کے لئے بولا گیا ہے اور دین کا لفظ صحیح اسلام کے لئے۔

کرتے تھے ۔ اور ساتھ ھی ساتھ ایک دوسرے سے کہا کرتے تھے کہ تم نے دیکھ لینا کہ میرا سچا خدا کس طرح میری مدد کرتا ھے ۔ اب ظاھر ھے کہ اگر ان دونوں کا " خدا " ایک ھی تھا تو اس کے لئے یہ مقام کس قدر کشمکش کا ھوگا ۔ مدعی اور مدعا علیہ دونوں اس سے مدد مانگ رھے ھیں ۔ یہ ظاھر ھے کہ مقدمہ کا فیصلہ بہرحال ایک ھی کے حق میں ھو سکتا تھا (اور ایک ھی کے حق میں ھوا) اگر یہ فیصلہ اُس کے حق میں ھوا تھا جس نے زیادہ دعائیں مانگیں اور زیادہ منّتیں مانی تھیں ، تو اس کے معنی یہ ھوئے کہ دونوں (فریقین) " خدا " کو اپنی اپنی طرف جھکانا چاھتے تھے ۔ " خدا " اس کی طرف جھک گیا جس نے زیادہ دعائیں مانگیں ، یا زیادہ چڑھاوا چڑھا دیا ۔ اس شکل میں سلیم ! سوچو کہ معاملہ کی صورت کیا ھوئی ؟ دنیا میں ھزاروں انسان ایسے ھوتے ھیں جن کے مفاد ایک دوسرے سے ٹکراتے ھیں ۔ بعض اوقات پوری کی پوری قوم ، دوسری قوم کے خلاف نبرد آزما ھو جاتی ھے اور ھر قوم اپنی کامیابی کے لئے خدا سے دعائیں مانگتی ھے (تمہیں یاد ھوگا کہ گزشتہ جنگ میں ھٹلر بھی خدا کا نام لے کر حملہ کیا کرتا تھا اور چرچل بھی خدا کی مدد سے اس کا جواب دیا کرتا تھا) یعنی ھزاروں بلکہ لاکھوں انسان بیک وقت " خدا " کو ایک طرف کھینچتے ھیں اور لاکھوں انسان دوسری طرف ۔ اس لئے کہ ھر شخص سمجھتا ھے کہ اس کا " خدا " اس کے ساتھ ھے ۔ وہ اس کی مدد ضرور کرے گا ۔ سوال یہ ھے کہ ان حالات میں (ذھنِ انسانی کا تراشیدہ) " خدا " کیا کرتا ھے ؟ اگر وہ کچھ نہیں کرتا اور دنیا کے معاملات یوں ھی چلے جارھے ھیں تو پھر سوال پیدا ھوتا ھے کہ ایسے " خدا " کے ماننے سے حاصل کیا ھے ؟ ھر شخص خدا کو اس لئے مانتا ھے کہ وہ سمجھتا ھے کہ اس کا خدا مشکلوں اور مصیبتوں میں

اس کی مدد کرے گا ۔ لیکن اگر اس کا خدا اس کی مدد نہیں کرتا تو وہ ایسے خدا کو مان کر کیا کرے گا ؟ اور اگر خدا مدد کرتا ہے تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ عمر بخش اور خدا داد (ہٹلر اور چرچل) میں سے کس کی مدد کرتا ہے ؟ اگر وہ اس کی مدد کرتا ہے جو سب سے زیادہ منّتیں مانتا ہے تو یہ وہی کھینچا تانی کا سلسلہ ہو گیا جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے ۔ مذہب (یعنی ذہن انسانی کے تراشیدہ خدا) کے سلسلے میں، پہلی منزل (First Stage) یہی منّتوں اور چڑھاووں کی ہوتی ہے ۔ اس سے آگے بڑھئے تو عصر سحر (Magic Age) آتی ہے جس میں خاص قسم کی رسومات، خاص قسم کے ورد اور وظائف (منتر جنتر) سے ''خدا'' کو مجبور کر دیا جاتا ہے کہ وہ اس شخص کی مرضی کو پورا کرے ۔ ''صبح کے وقت ندی میں کھڑے ہو کر ، سوا لاکھ مرتبہ ، یہ کچھ پڑھو ، مقدّمہ میں کامیابی لازمی ہے'' ۔ یعنی اگر تم نے ایسا کر دیا تو خدا مجبور ہوگا کہ مقدّمہ کا فیصلہ تمہارے حق میں کرائے ۔ اس کے برعکس اگر یہی کچھ ، یا اس سے زیادہ زور دار چلہ فریق ثانی نے کر دیا تو خدا کو اُس کے حق میں فیصلہ کرانا پڑے گا ۔

یہ کیفیت ہوتی ہے سلیم ! اُس وقت جب خدا انسانی ذہن کا تراشیدہ (Subjective) قرار پا جاتا ہے ۔ انسانوں کا خود ساختہ مذہب اسی قسم کے خدا کا تصوّر پیش کرتا ہے ۔ اور یہی ہے وہ خدا جس پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ محض انسانی تصوّرات کی تخلیق ہے ۔ یعنی یہ اعتراض کہ انسان نے اپنے لئے خود خدا بنا لیا ہے ۔ خدا درحقیقت موجود نہیں ہے ۔

لیکن دین (قرآن) خدا کے متعلق ایک جداگانہ تصوّر عطا کرتا ہے ۔ وہ کہتا ہے کہ خدا، ذہن انسانی کا تراشیدہ نہیں، بلکہ وہ خارج میں (Objectively) موجود ہے۔ وہ اُس وقت بھی موجود تھا جب کوئی تصوّر کرنے والا ذہن موجود نہیں

تھا اور اُس وقت بھی موجود ہوگا جب کوئی تصوّر کرنے والا ذہن موجود نہیں ہوگا۔ وہ موجود ہے اور اپنی خصوصیات کے ساتھ موجود ہے۔ اس کی یہ خصوصیات (جنہیں صفات ''Attributes'' کہا جاتا ہے) مستقل بالذّات اور موجود فی الْخارج ہیں۔ وہ نہ عمر بخش کی آرزوؤں کے مطابق بدلتی ہیں نہ خدا داد کی تمناؤں کے مطابق ڈھلتی ہیں۔ نہ اُنہیں ہٹلر کھینچ کر اُن کی جگہ سے ہٹا سکتا ہے نہ چرچل۔ لَیْسَ بِاَمَانِیِّکُمْ وَلَآ اَمَانِیِّ اَھْلِ الْکِتَابِ (نہ تمہاری آرزوؤں کے مطابق نہ اہل کتاب کی خواہشات کے)۔

اب یہ ظاہر ہے کہ جب خدا، ذہن انسانی کا پیدا کردہ نہیں تو ذہن انسانی اس کے متعلق کچھ بھی نہیں بتا سکتا۔ ذہن انسانی تو اسی چیز کے متعلق کچھ بتا سکتا ہے جس کا وہ تصور کر سکتا ہے۔ یہاں سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر اس خدا کے متعلق ذریعہ معلومات کیا ہے؟ یہی وہ مقام ہے جہاں وحی کی ضرورت پڑتی ہے۔ یعنی وہ علم جو ذہن انسانی کا پیدا کردہ (Subjective) نہیں بلکہ خارج سے عطا شدہ (Objective) ہے۔ یہ علم خود خدا کی طرف سے حضرات انبیاء کرام کو براہ راست ملتا ہے (یعنی ملتا تھا۔ کیونکہ اب تو سلسلۂ نبوّت ختم ہوگیا) اور اس کے ذریعے خدا اپنا تعارف کراتا ہے۔ بالفاظ دیگر یوں سمجھو کہ خدا نے اپنے متعلق جس قدر معلومات بہم پہنچانی تھیں، اس خارجی ذریعہ علم (وحی) کی رو سے از خود بہم پہنچادیں۔ جس قدر اپنا تعارف کرانا تھا اس کے ذریعہ کرا دیا۔ اب دنیا میں قرآن، اسی تعارف خداوندی کا خریطہ ہے۔ انہی تعارفی تفاصیل کو صفات خداوندی (Attributes) کہتے ہیں۔ یعنی حقیقت مطلق (Absolute Reality) کے مختلف گوشے (Facets)۔ ان ہی کو قرآن کی اصطلاح میں اَلْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی کہا جاتا ہے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے سلیم! کہ اس خدا سے میرا کیا تعلق ہے؟ میں اسے کیوں مانوں؟ اس پر ایمان کیوں لاؤں؟ ایک شخص کہتا ہے کہ خدا ہے۔ دوسرا کہتا ہے نہیں ہے۔ ان دونوں میں فرق کیا ہے؟ نہ ماننے والے میں کیا کمی رہ جاتی ہے، جو ماننے والے میں پوری ہو جاتی ہے۔ اگر خدا ہے، تو ہوا کرے۔ اگر نہیں ہے، تو نہ سہی۔ مجھے اس سے کیا واسطہ؟ یہ سوالات بڑے اہم ہیں اور جب تک ان کا اطمینان بخش جواب وجہِ طمانیّتِ قلب نہیں ہوتا، ایمان کی ضرورت اور اہمیت سمجھ میں نہیں آسکتی۔ اس لئے اسے ذرا غور سے سنو! میں آج تک تمہارے اس سوال کو ٹالتا رہا کیونکہ میں جانتا تھا کہ یہ موضوع کس قدر مشکل اور دقیق ہے۔ مجھے ڈر تھا کہ میں نے بات شروع کی اور تم بدکے، اور اگر بدکے نہیں تو سو ضرور جاؤ گے۔ لیکن اب جو تم نے اس قدر اصرار کیا ہے تو غور سے سنو! اس لئے کہ انسانی زندگی پر اس کا اثر بڑا گہرا ہوتا ہے۔ خدا کا ماننا اور نہ ماننا یوں ہی ہنسی کی بات نہیں کہ یوں ہوگیا تو کیا اور ووں ہو گیا تو کیا؟ اس یوں اور ووں میں زندگی کا نقشہ بدل جاتا ہے۔ بلکہ یوں سمجھو کہ ساری کی ساری کائنات کی بساط اُلٹ جاتی ہے۔ یہی وہ محور ہے جس کے گرد زندگی کی تمام حرکتیں گردش کرتی ہیں۔

لو اب سنو!

دنیا میں ہر شخص کے سامنے زندگی کا کوئی مقصد ہوتا ہے۔ بشرطیکہ وہ بالکل حیوانوں کی سی زندگی بسر نہ کر رہا ہو۔ ہر شخص کچھ نہ کچھ بننا چاہتا ہے۔ اس کے لئے ہر شخص اپنے سامنے کوئی نہ کوئی نصب العین، کوئی نہ کوئی منزل، کوئی نہ کوئی نمونہ (Pattern) رکھتا ہے۔ کوئی امیر بننا چاہتا ہے تو اُس کے سامنے کسی بہت بڑے دولتمند کا نمونہ ہوگا۔

کوئی صاحب علم بننا چاھتا ہے تو اُس کے پیش نظر کسی ذی علم ممتاز ہستی کی مثال ہوگی۔ کوئی بہت بڑا (Industrialist) بننا چاھتا ہے تو وہ اپنے سامنے یورپ اور امریکہ کے بڑے بڑے ارباب صنعت و حرفت اور کار خانہ داروں کی زندگی رکھے گا۔ کوئی شجاعت اور بہادری میں نام پیدا کرنا چاھتا ہے تو اُس کے سامنے بڑے بڑے فاتح جرنیلوں کے کارنامے ہوں گے۔ لیکن یہ سب مقاصد اضافی (Relative) ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص، "انسان" بننا چاہے تو اسے اپنے سامنے کونسا نمونہ (Pattern) رکھنا چاھئے۔

آدمی کی ایک حیثیت تو وہ ہے جسے حیوانی سطح (Animal Level) کہا جاتا ہے۔ اس کی حیوانی زندگی، خالص مادی پیکرِ آب و گل کی زندگی ہے، جس کا مقصد تحفّظِ خویش (Preservation Of Self) اور تولیدِ نسل (Procreation) ہے۔ اس کے لئے نہ اسے کسی نصب العین کی ضرورت ہے نہ کسی تمثیلی نمونہ کی۔ لیکن جس چیز کو انسانیت کہا جاتا ہے وہ اس حیوانی زندگی سے الگ ہے۔ قرآن میں تخلیق آدم کی مختلف کڑیوں پر غور کرو سلیم! پہلے اس کی حیوانی تخلیق کے مختلف مَدارج کو گنایا گیا ہے (بَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِیْنٍ) تخلیق انسانی کی ابتدا مٹی سے ہوئی۔ یہ ہوئی جمادات کی زندگی (ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّاءٍ مَّهِیْنٍ) پھر اس کی نسل کو بذریعہ تولید آگے بڑھایا۔ یہ حیوانات کا درجہ آ گیا (ثُمَّ سَوّٰهُ) پھر اس میں خاص توازن پیدا کیا۔ یہ حیوانات سے اگلی ارتقائی منزل آئی جہاں اس نے انسان بننا ہے۔ اس کے بعد کہا (وَنَفَخَ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ) پھر اللہ نے اس میں اپنی (روح) توانائی پھونکی۔ اب یہ انسان تخاطب کے قابل ہو گیا۔ (وَجَعَلَ لَکُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ) ($\frac{۳۲}{۷-۹}$) اس کے بعد تمہیں سماعت،

بصارت اور قلب عطا کر دیا۔ غور کرو سلیم! ان تمام مدارجِ تخلیق میں ”نفخِ روح“ کا وہ مقام ہے جہاں سے انسانیت کی ابتدا ہوتی ہے۔ اسی کا نام انسانی ذات (Personality) ہے۔ اسی کو اقبال ”خودی“ کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ لہٰذا انسان نام ہے ”روحِ خداوندی“ کے مظہر کا۔ یعنی خدائی صفات کا حامل۔ یہ صفات ہر فرزند آدم (ہر آدمی) کے اندر بطور ممکناتِ زندگی (Realisable Possibilities) موجود ہیں۔ پیدائشی اعتبار سے ہر انسان میں یہ صفات مستتر (Potent) ہوتی ہیں۔ ان صفات کو بارز (Actualise) کرنا یا مشہود (Manifested) بنانا مقصود آدمیت ہے۔ اسی کو خودی کی نمود یا تکمیل ذات کہا جاتا ہے۔ خدا کی ذات میں یہ صفات اپنی انتہائی حقیقی شکل (Realised Form) اور مکمل ترین صورت میں موجود ہیں۔ نہ صرف مکمل ترین صورت میں بلکہ ایسے توازن و تناسب کو لئے ہوئے جس سے بہتر اور مکمل توازن کا تصوّر بھی ممکن نہیں۔ اسی لئے ان صفات کو اسماء الحسنیٰ (بہترین توازن، حسن کارانہ انداز کی حامل) کہا گیا ہے۔ انسان کا اسی انداز سے اپنی صفات کو تکمیل تک پہنچانا مقصد حیات ہے۔

اب تم خود فیصلہ کر لو سلیم! کہ کسی فرد کو ”انسان“ بننے کے لئے اپنے سامنے کونسا نمونہ (Pattern) رکھنا ہوگا؟ جواب ظاہر ہے کہ یہ نمونہ خدا کی صفات کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ انسان جن صفات کا پیکر ہے، وہی صفاتِ اپنی مکمل ترین شکل میں، اس کی تکمیل ذات کے لئے نمونہ بن سکتی ہیں۔ صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً (۲/۱۳۸) ”اللہ کا رنگ، جس کے رنگ سے زیادہ حسین رنگ اور کوئی نہیں“۔ یہ ہے وہ نمونہ (Pattern) جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ اسے ہر انسان کا مقصود

حیات ہونا چاہئے۔ اسے کہتے ہیں سلیم! قرآن کی اصطلاح میں ”اللہ پر ایمان لانا“۔ یہ ہے وہ ایمان جس کا مطالبہ تمام نوع انسانی سے کیا گیا ہے، خواہ وہ پہلے اپنے طور پر خدا کو مانتے ہی کیوں نہ ہوں۔ اسی لئے صِبْغَةَ اللهِ کی آیت سے پہلے یہ آیت ہے۔ فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنْتُمْ بِهِ فَقَدِ اهْتَدَوْا اگر یہ لوگ اس انداز سے اللہ پر ایمان لائیں جس انداز سے تم ایمان لائے ہو۔ تو پھر سمجھو کہ یہ زندگی کی صحیح راہ پر گامزن ہو سکیں گے۔

لہذا اللہ پر ایمان کے معنی ہوئے سلیم! صفات خداوندی کے حسین مجموعے (اسماء الحسنٰی) کو (جن کا تعارف قرآن میں کرایا گیا ہے) اپنی زندگی کا نصب العین بنانا۔ یعنی وہ صفات الٰہیہ جو حدودِ بشری کے مطابق خود انسان کے اندر مضمر ہیں انہیں مشہود کرتے چلے جانا، یہ مضمر (Latent) یا (Potential) صفات جس قدر مشہود (Actualise) ہوتی جائیں گی، انسان ”خدا کے قریب“ ہوتا جائے گا۔ جب یہ تمام صفات اپنی آخری انسانی حد تک مشہود ہو جائیں گی۔ تو ”انسان اپنے رب تک پہنچ جائے گا“۔ قرآن نے انسانی زندگی کے نصب العین (Goal) کو ان ہی الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔

وَإِنَّ إِلَىٰ رَبِّكَ الْمُنْتَهَىٰ (۵۳/۴۱)۔

غور کرو سلیم!

۱۔ چونکہ انسان، صفاتِ خداوندی (روحِ خداوندی) کا حامل ہے اس لئے اس کی تکمیلِ ذات کے لئے نمونہ صرف خدا کی صفات ہو سکتی ہیں۔

۲۔ اور یہ صفاتِ خداوندی، ہر فردِ انسانیہ کے لئے نمونہ ہوں گی۔ یعنی

تمام نوع انسانی کے سامنے ایک ھی نمونہ (Pattern) کیونکہ ھر انسان ان ھی صفات کا حامل ھے ۔

اسے ” توحید “ کہتے ھیں ۔ یعنی انسانی زندگی کے لیے صرف ایک نمونہ ، ایک نصب العین ھونا ۔ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِیْکَ لَهٗ ۔

اور یہ نصب العین اس خدا کی صفات کا ھو سکتا ھے جس کا تعارف خود خدا نے وحی کی رو سے کرایا ھو (نہ کہ ذھن انسانی کا تراشیدہ خدا) ۔ اس لئے دنیا کے ھر انسان کے لئے اس خدا پر ایمان لانا (یعنی اسے نصب العینِ حیات بنانا) ضروری ھے جسے قرآن نے پیش کیا ھے ۔ یہ اس لئے کہ وحی اپنی اصلی اور خالص شکل میں قرآن کے سوا اور کہیں موجود نہیں (دنیا کے تمام مذاھب کے متبعین اس حقیقت کے معترف ھیں کہ ان کے ھاں وحی اپنی اصلی اور غیر مخلوط شکل میں موجود نہیں ۔ اس تفصیل کو تم ” معراج انسانیت “ کے پہلے باب میں خود دیکھ چکے ھو) ۔

اور چونکہ قرآن کے علاوہ خدا کا صحیح تعارف و تصوّر کہیں اور نہیں مل سکتا ۔ اس لئے قرآن کا پیغام تمام دنیا میں بے مثل و بے نظیر ھے ۔ ذھن انسانی کے لئے ناممکن ھے کہ وہ اس خدا کا تصوّر پیدا کر سکے جسے قرآن نے پیش کیا ھے اس لئے کہ (جیسا کہ تم اوپر دیکھ چکے ھو) ذھنِ انسانی کا پیدا کردہ خدا کا تصور ، انفرادی اور (Subjective) ھوتا ھے ، موجود فی الخارج (Objective) خدا کا تصوّر نہیں ھوتا ۔

کچھ سمجھے ؟

* * *

اب ایک قدم اور آگے بڑھو سلیم !

دنیا میں کوئی دو انسان جب اپنی زندگی کا نصب العین ایک ھی مقرر کر لیں ۔ یعنی ان کے سامنے نمونہ (Pattern) ایک ھی ھو ، تو ان انسانوں میں قلب و نگاہ کی ھم آھنگی کا پیدا ھو جانا لازمی ھے ۔ اسی کا نام وحدتِ فکر و نظر ھے ۔ للھذا جب تمام نوع انسانی کے سامنے ایک ھی نمونہ (Pattern) ھو تو تمام افرادِ انسانیہ میں وحدت فکر و نظر پیدا ھو جائے گی ۔ بالفاظ دیگر ، توحید کا لازمی نتیجہ وحدتِ انسانیت ھے ، اس کے سوا وحدتِ انسانیت کا اور کوئی ذریعہ ھی نہیں اِنَّ ھٰذِہٖ اُمَّتُکُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّکُمْ فَاتَّقُوْنِ (۲۳/۵۲) ۔

یہ بھی ظاھر ھے سلیم ! کہ جب ھم نے خدا کی صفات کو اپنے سامنے بطور نمونہ (Pattern) رکھا ھے تو ان صفات ، یا اسماء الحسنیٰ (Various Aspects of Reality) کے متعلق ھمیں پوری پوری معلومات ھونی چاھئیں تاکہ ھم دیکھ سکیں کہ ھم میں کون کون سی صفات نشو و نما پا رھی ھیں اور کون سی صفات ھنوز خوابیدہ یا خام ھیں ۔ اس کا نام ھے تعلیم الکتاب یعنی قرآن کا علم ۔ علم سے مراد محض کتاب کا پڑھ لینا نہیں ، بلکہ اس کے نقوش کو دل کی گھرائیوں میں مرتسم کر لینا ھے ۔

———: o :———

اس سے تم سمجھ گئے ھوگے سلیم ! کہ دین میں خدا پر ایمان کی اھمیت کیا ھے ؟ یہ وہ بنیاد ھے ، جس پر انسانی زندگی کی ساری عمارت استوار ھوتی ھے اور چونکہ دین نام ھی اس اسلوب و انداز کا ھے ، جس کے مطابق

زندگی بسر کی جائے ، اس لئے خدا پر ایمان کے بغیر صحیح زندگی بسر کرنے کا تصوّر ھی نہیں ھو سکتا ۔ جس قسم کا نمونہ (Pattern) اُسی قسم کی انسانی زندگی ۔ جس قسم کا نصب العین ، اُسی قسم کے اعمال ۔ اس لئے کہ عمل نام ھے حصولِ نصب العین کے لئے جد و جہد کا ۔ یہاں ذریعہ اور مقصد (Means and Ends) میں کوئی فرق نہیں ھوتا ۔ تمہیں یاد ھے سلیم ! اگلے دنوں تم نے (Ferdinand Lassalle) کا ایک اقتباس نقل کیا تھا جس میں وہ کہتا ھے کہ :

> ایسا نہ ھو کہ ھمیں نصب العین کا پتہ تو دے دو لیکن اُس تک پہنچنے کی راہ نہ بتاؤ ۔
>
> اس لئے کہ دنیا میں ذرائع اور مقاصد اس طرح باھمدگر گتھے ھوئے ھیں کہ اگر ایک کو بدل دیا جائے تو دوسرا خود بخود بدل جاتا ھے ۔ ھر مختلف راہ ، مختلف منزل کی نشان دھی کرتی ھے ۔

اس لئے خدا پر صحیح ایمان ھی ، صحیح اعمال کا موجب بن سکتا ھے ۔ یہی وجہ ھے سلیم ! کہ قرآن نے واضح الفاظ میں کہہ دیا ھے کہ اگر خدا پر صحیح ایمان نہیں ھے تو تمہارے اعمال کبھی نتیجہ خیز نہیں ھو سکتے ۔ یہ ، ھر رنگ کی ، ”خدا پرستی“ میں ”نیک عملی“ کی راھیں بتانے والے ”برھمو ساجی مسلمان“ کیا جانیں کہ قرآن کی رُو سے ”خدا پرستی“ کسے کہتے ھیں اور ”نیک عملی“ کیا ھوتی ھے ؟ یاد رکھو سلیم ! سفر اور آوارگی ، دونوں میں قدم تو یکساں اُٹھتے ھیں ، لیکن ایک میں ھر قدم جانبِ منزل اُٹھتا ھے ۔ اس لئے کچھ وقت کے بعد مسافر منزل تک پہنچ جاتا ھے اور دوسرے میں فقط قدم اُٹھتے ھیں ، منزل کوئی بھی سامنے نہیں ھوتی ۔

اس لئے اس میں سوائے تکان اور درماندگی کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اُولٰئِکَ حَبِطَتْ اَعْمَالُھُمْ ۔

——:o:——

اس مقام پر اس اہم حقیقت کو بھی سمجھ لو سلیم! کہ انسان کے اندر ان صفات خداوندی کی تربیت، تکمیل اور شہود، معاشرے (اجتماعی نظام) کے بغیر ناممکن ہے۔ خودی (انسانی ذات، یا انسان کے اندر صفاتِ خداوندی) کی بیداری اور نمود کا مقام ہی وہ ہوتا ہے جب انسان کا واسطہ کسی دوسرے انسان سے پڑے۔ اور یہی وہ محک (کسوٹی) ہے جس پر انسان اس حقیقت کو پرکھ سکتا ہے کہ اس کی خودی کس حد تک بیدار ہو چکی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ انسانی خودی (Personality) اپنی ذات میں یکتا (Unique) ہے لیکن اس کی تربیت ہمیشہ اجتماعی نظام میں ہوتی ہے۔ بقول اقبال رحہ —

زندگی انجمن آرا و نگہ دار خود است
ایکہ در قافلۂ با ہمہ رَوْ بے ہمہ شو

یہ ’’بے ہمہ شدن‘‘ انسانی ذات کی یکتائی ہے (کیونکہ یکتائی، خودی کی بنیادی خصوصیت ہوتی ہے) اور ’’با ہمہ رفتن‘‘ جماعتی زندگی ہے جس کے بغیر تربیتِ خودی ناممکن ہے۔ اسی لئے قرآن، انسانی تکمیلِ ذات کے لئے اجتماعی ندزگی کو لاینفک قرار دیتا ہے۔ اس کے لئے وہ ایسے معاشرے کی تشکیل کرتا ہے جس میں ہر فرد، دوسرے فرد کی خودی کی رُبوبیّت (پرورش، تکمیل و نمود) کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ یہ معاشرہ ربّانیوں پر مشتمل ہوتا ہے جن کے

صرف بدن ھی ایک جگہ نہیں ھوتے ، بلکہ قلوب باھمدگر پیوست ھوتے ھیں ۔ اس معاشرے میں ھر فرد ، دوسرے کے لیے جیتا ھے اور اسے ھر مقام پر اپنی ذات پر ترجیح دیتا ھے ۔ یُؤْثِرُوْنَ عَلٰی اَنْفُسِھِمْ وَ لَوْ کَانَ بِھِمْ خَصَاصَۃٌ (۵۹/۹) ۔ اس قسم کا باھمی ربط (یعنی ایسے معاشرے کی تشکیل) بھی صرف اس ایمان کے ذریعہ ممکن ھے جس کا ذکر اُوپر کیا گیا ھے یعنی اس امر کا یقین محکم کہ تمام معاشرے کا نصب العین ایک ھے اور ھر فرد ، دوسرے فرد کی پرورش اور نشو و نما کو اپنا فریضۂ زندگی سمجھتا ھے ۔

* * *

اس مقام پر تمہارے دل میں لازماً یہ خیال پیدا ھوگا کہ کیا خدا کا ھمارے ساتھ اتنا ھی تعلق ھے کہ ھم نے اپنی زندگی کی تکمیل کے لئے اُس کی صفات کو بطور نمونہ سامنے رکھا ھے ؟ اتنا ھی تعلق نہیں ۔ یہ تو اُس تعلق کا صرف ایک گوشہ ھے ، اب دوسرا گوشہ تمہارے سامنے آتا ھے ۔ لیکن دیکھنا کہیں پھر سو نہ جانا ۔ بات بڑی اھم ھو رھی ھے ۔

ذات (Personality) کی خصوصیتِ کبریٰ (Main Characteristic) استغناء (Independence) اور حریّت و صمدیّت (Freedom) ھے ۔ استغناء ، یعنی بغیر کسی خارجی سہارے کے ، از خود موجود رھنا ، اپنی ذات میں کسی کا محتاج نہ ھونا ، اور حرّیت ، کامل اختیار و ارادہ کا مالک ھونا ۔ خدا ، جو ذات مطلق ھے ، وہ انتہائی شکل میں ” غنیٌّ حمید “ اور ” صمد “ ھے ۔ لیکن ھر ذات (Personality) اپنی نمود کے لئے ، خود اپنے اُوپر کچھ قیود (Self-imposed limitations) عائد کر لیتی ھے ۔ خدا نے بھی اپنے اُوپر کچھ

”قیود“ عائد کر رکھی ہیں۔ مثلاً قرآن میں ہے کَتَبَ عَلٰی نَفْسِہِ الرَّحْمَۃَ (٦/١٢) ”اللہ نے اپنے اوپر اشیائے کائنات کی رُبوبیّت و حفاظت فرض کر رکھی ہے“۔ یہ ”کَتَبَ عَلٰی نَفْسِہٖ“ (اپنے اوپر فرض کر لینا) وہی خود عائد کردہ پابندی کی مثال ہے۔ ان قیود سے مقصد یہ ہے کہ کائنات کی نشو و نما کے لئے جس قسم کا تقاضا ہو خدا کی طرف سے، اسی قسم کی صفت کا ظہور ہو جاتا ہے۔ اس مشکل مقام کو سمجھنے کے لیے تم یہ کہہ لو کہ خاص حالات میں خدا کی طرف سے خاص ردِّ عمل (Reaction) ہوتا ہے۔ اسے قانون خداوندی کہا جاتا ہے۔ یعنی جیسے حالات، اسی کے مطابق صفت خداوندی کا ظہور۔ اور چونکہ صفات خداوندی غیر متبدل ہیں اس لئے قانونِ خداوندی بھی غیر متبدّل، اٹل اور عالمگیر ہوتا ہے۔ لَا تَبْدِیْلَ لِکَلِمَاتِ اللّٰہِ (قانونِ خداوندی میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی)۔ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّۃِ اللّٰہِ تَبْدِیْلاً وَ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّۃِ اللّٰہِ تَحْوِیْلاً (قانون خداوندی میں تبدّل و تحوّل ہرگز نہ دیکھو گے)۔ خارجی کائنات میں خدا کا یہ قانون ہر شے میں از خود جاری و ساری ہے۔ ان اشیاء کو اس میں کسی قسم کا دخل و اختیار نہیں۔ کُلٌّ لَہٗ قَانِتُوْنَ (سب اس کے سامنے جھکی ہوئی ہیں)۔ لیکن انسان کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو قانون خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرے اور چاہے تو اس سے انکار کر دے۔ فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَ مَنْ شَآءَ فَلْیَکْفُرْ۔ یعنی انسان کو اس پر اختیار ہے کہ جس قسم کا جی چاہے عمل کرے۔ لیکن اسے اس پر اختیار نہیں کہ عمل ایک قسم کا کرے اور نتیجہ دوسری قسم کا پیدا ہو۔ جیسا عمل اُسی کے مطابق نتیجہ۔ اس لئے کہ جس قسم کا عمل انسان کی طرف سے ہوتا ہے اسی قسم

کی صفت خداوندی کا ظہور بطور ردِّ عمل ہو جاتا ہے، اسے قانونِ مکافاتِ عمل کہتے ہیں۔ قرآن میں دیکھو، ہر مقام پر تمہیں دکھائی دے گا کہ "اگر یوں کرو گے تو خدا یوں کرے گا"۔ یعنی اگر یہ کرو گے تو خدا کا قانون یہ نتیجہ پیدا کر دے گا۔ اگر وہ کرو گے تو وہ نتیجہ مرتب ہو گا۔ تمہارے ہر عمل کے مطابق خدا کی ایک خاص صفت کا ظہور ہوگا۔ مثلاً خدا کی صفت، ھادی، راھنمائی کرنے والا ہے۔ اس کے متعلق فرمایا کہ وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا (۲۹/۶۹) جو لوگ ہماری راہ کی تلاش میں جد و جہد کریں گے ہم انہیں اپنی راہوں کی طرف راھنمائی کر دیں گے۔ یعنی اگر کسی انسان کی طرف سے راستہ کی تلاش کی جد و جہد ہوگی تو آدھر سے خدا کی صفت ھدایت کا ظہور ہوگا۔ یا مثلاً وَلَوْ اَنَّ اَھْلَ الْقُرٰٓی اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَیْھِمْ بَرَکٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ (۷/۹۶)۔ "اگر بستیوں کے رہنے والے ایمان لے آتے اور قانون خداوندی کی نگہداشت کرتے، تو ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکات کے دروازے کھول دیتے"۔ یعنی اگر اُن کی طرف سے ایسا ہوتا تو خدا کی صفت رزاقیت موجیں مارتی ہوئی جلوہ بار ہو جاتی۔ وَلٰکِنْ کَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰھُمْ بِمَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ (۷/۹۶)۔ "لیکن اُنہوں نے اس قانون کی تکذیب کی تو ہم نے اُنہیں اُن کے اعمال کی سزا میں پکڑ لیا"۔ "اُنہوں نے یہ کیا تو ہم نے یہ کیا"۔ یہ ہے قانونِ خداوندی جسے قرآن کی اصطلاح میں "مشیّت" کہا جاتا ہے۔ قرآن نے تفصیلاً بتا دیا ہے اور بار بار دھرا کر بتا دیا ہے کہ اگر چاہتے ہو کہ خدا کی فلاں صفت کا ظہور ہو تو اس کے لئے یہ کرو۔

تم دیکھ چکے ہو سلیم! کہ جس خدا کا تصوّر مذہب پیش کرتا ہے (یعنی ذہنِ انسانی کا تراشیدہ خدا)، اس میں خدا ہر فرد کی آرزوؤں کے مطابق ڈھلتا ہے۔ اس لئے اس "خدا" کو ہر فرد اپنی طرف جھکانا چاہتا ہے، عمر بخش اپنی طرف، خدا داد اپنی طرف۔ ہر مقدمے میں، مدعی اپنی طرف، مدعا علیہ اپنی طرف۔ مستغیث اپنی طرف، ملزم اپنی طرف۔ تم نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ اس کھینچا تانی میں "خدا کا" کیا نقشہ بنتا ہے۔ لیکن دین میں خدا کا تصوّر ایک عالمگیر، اٹل اور غیر متبدل قانون کا تصوّر ہے، جو اپنی جگہ پر قائم ہے اور کسی کی طرف نہیں جھکتا۔ ہر عمل اسی قانون کے مطابق نتیجہ خیز ہوتا ہے اور نتیجہ ٹھیک ٹھیک عمل کے مطابق مرتّب ہوتا ہے، نہ کم نہ زیادہ۔ ثُمَّ تُوَفّٰی کُلُّ نَفْسٍ مَّا کَسَبَتْ وَھُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ (۳/۱۶۱)۔ جو انسان جس قسم کا نتیجہ چاہتا ہے وہ خود اس کے مطابق بن جائے، نتیجہ مرتّب ہو جائے گا ؎

رمز باریکے بحرفے مضمر است   تو اگر دیگر شوی او دیگر است

جو کسان چاہتا ہے کہ اس کا کھیت سیراب ہو اسے اپنا کھیت پانی کے نشیب کی طرف بنانا ہوگا۔ اس لئے کہ پانی کا عام قانون، نشیب کی طرف بہنا ہے۔ جس نے اپنے کھیت کو پانی کے عالمگیر قانون سے ہم آہنگ کر لیا اس کے سامنے جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ کا منظر آ جائے گا۔ جس نے اسے فراز کی طرف رکھا۔ (یعنی قانونِ خداوندی سے انکار کیا اور سرکشی برتی (اسے کفر و عصیاں کہتے ہیں)۔ وہ سیرابیوں اور شادابیوں سے محروم رہ گیا۔ اس میں نہ کسی کشمکش کی گنجائش ہے، نہ کھینچا تانی کا امکان۔ نہ کسی کی سفارش کا کوئی سوال ہے نہ خوشامد کا۔ قانونِ خداوندی

کے یہ طے شدہ فیصلے ہیں، جسے قضا کہتے ہیں اور یہ تم جانتے ہی ہو سلیم! کہ قضا بدلا نہیں کرتی۔

یہاں تک سلیم! خدا کے قانون کی محکمیت (غیر متبدل ہونے) کے متعلق گفتگو تھی۔ اب اس کی عالمگیریت پر غور کرو۔ جس طرح عالم آفاق می خدا کا قانون ہر جگہ یکساں طور پر جاری و ساری ہے، اسی طر عالمِ انسانی میں بھی اس کا قانون ہر مقام پر یکساں نتائج پیدا کرتا ہے آگ، قطب شمالی کے اسکیمو کے لئے بھی اسی طرح وجۂ تپش ہے جس طر افریقہ کے حبشی کے لئے۔ ہوا ملکۂ برطانیہ کی ناک میں بھی اسی طرح جات ہے جس طرح تبّت کے چرواہے کی ناک میں۔ اس میں نہ جغرافیائ حدود و قیود کی کوئی تخصیص ہے، نہ رنگ اور خون کی کوئی تمیز نہ دولت و ثروت کا کوئی لحاظ ہے نہ منصب و جاہ کی کوئی رعایت۔ یہ قوانی نہ قبائلی ہیں نہ قومی۔ نہ وطنی ہیں نہ نسلی۔ جو کیفیت ان طبعی قوانی کی ہے وہی حالت اس قانون کی ہے جو عالمِ انسانیت کے متعلق ہے۔ یہ قانو بھی تمام نوعِ انسانی کے لیے یکساں ہے۔ یعنی وہ خدا جس کا تصوّر اوپر دی گیا ہے، ربُ العالمین ہے۔ رب الناس ہے، ملک الناس ہے، الٰہ النّاس ہے۔ دنیا کے کسی خطّے میں، کسی قوم، کسی نسل، کسی رنگ کا انسان ہو، جو بھی اس خدا کو اپنا (Pattern) بنا لے گا، جو بھی اس کے قانون سے ہم آہنگی اختیار کر لے گا، وہ ربّانی بن جائے گا۔ یہ ہے ربّانیوں کی وہ جماعت، جو قومیت، وطنیت، خون، رنگ، نسل کے اضافی رشتوں سے بالا ہوکر، فی الحقیقت ایک ملّتِ واحدہ بنتی ہے۔ اسی لئے قرآن اس جماعت کو فقط ”مؤمنین“ کہہ کر پکارتا ہے کیونکہ ان سب میں وجۂ جامعیت او سببِ اشتراک، اس قانون پر ایمان ہے۔ یہی ایمان ان کی وحدت کی بنیاد ہے۔

یعنی ساری دنیا میں ایک (Pattern) کے مطابق زندگی بسر کرنے والے، ایک رنگ میں رنگے ہوئے، ایک قانون کو تسلیم کرنے والے انسانوں کی جماعت۔ یہ ہیں اس خدا کو ماننے والے افراد جس کا تصوّر، دین (قرآن) نے عطا کیا ہے۔ وہ خدا ہر فرد سے یکساں فاصلے پر ہے، جس طرح دائرے کا مرکزی نقطہ، محیط کے ہر نقطے سے یکساں فاصلے پر ہوتا ہے۔ جو انسان اسے اپنا (Pattern) بنا لے وہ اسے اپنے نزدیک پائے گا۔ اِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ (۲/۱۸۶)۔ ”میرے بندے جب میرے متعلق سوال کریں تو کہہ دے کہ میں ان سے قریب ہوں“۔ ان کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب۔ (نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ)۔ جو شخص اس کے قانون کو اپنی زندگی میں اپنا راہ نما بنائے گا، وہ قانون ہر وقت اس کا ساتھ دے گا۔ وہ جس وقت اس قانون کو پکارے گا وہ قانون اس کی پکار کا جواب دے گا۔ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ (۲/۱۸۶) ”میں ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں“۔ عالمگیر قانون کا یہی خاصہ ہونا چاہئے۔ عالمگیر ہونے کے علاوہ وہ قانون جزرس ایسا ہے کہ دل میں گزرنے والے خیالات اور نگاہوں میں پھر جانے والے تصوّرات تک بھی اس کی گرفت سے باہر نہیں۔ اس کی نتیجہ خیزی کا یہ عالم ہے کہ قلب و جوارح کی کوئی خفیف سی حرکت بھی ایسی نہیں جس کا اثر مرتب ہونے سے رہ جائے۔ مَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْرًا یَّرَهٗ وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا یَّرَهٗ۔ غور کرو سلیم! ایسے خدا پر ایمان (یعنی ایسے قانون کی محکمیت پر یقین) انسان کے دل میں کتنی بڑی خود اعتمادی پیدا کر دیتا ہے۔ اگر وہ اس قانون کے مطابق کام کر رہا ہے تو دنیا کی کوئی طاقت اس کے دل میں وسوسہ انداز نہیں ہو سکتی کہ

اس کی محنت رائیگاں جائے گی یا اس سے وہ نتیجہ مُرتّب نہیں ھوگا جو اس کے پیشِ نظر ھے۔ دنیا بھر کی مخالفتیں اس کے دل میں یہ خدشہ نہیں پیدا کر سکینگی کہ وہ ناکام رہ جائے گا۔ اس لئے خوف اس کے پاس نہیں پھٹکے گا، حزن اس کے قریب نہیں آئے گا۔ وہ ان حالات میں بھی جہاں عام سطح پر انسانوں کو اُمید کی کوئی کرن نظر نہ آتی ھو، دل کے پورے اطمینان کے ساتھ، تبسّم فشانیوں کے جلو میں کہہ دے گا کہ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللہَ مَعَنَا (۹/۴۰)۔ "مت گھبراؤ ھمیں ناکامی کیسے ھو سکتی ھے، جبکہ ھم قانونِ خداوندی کے مطابق چل رھے ھیں"۔ ایسے انسان کو اگر سفرِ زندگی میں کہیں ناکامی ھوتی ھے تو وہ گھبرا کر خودکشی نہیں کر لیتا، بلکہ وھیں رک جاتا ھے اور سوچتا ھے کہ اس کا قدم کس مقام سے قانونِ خداوندی کی راہ سے ہٹ گیا ھے۔ چونکہ قانونِ خداوندی نہایت واضح صورت میں اس کے سامنے ھوتا ھے اس لئے اس امر کے تعین میں بھی کچھ مشکل نہیں ھوتی کہ اس کا قدم کہاں سے غلط سمت کی طرف اٹھ گیا تھا۔ وہ اس غلطی کو متعین کر کے لوٹتا ھے اور پھر اُس دوراہے پر آ جاتا ھے جہاں سے اس نے صحیح راہ چھوڑی تھی (اسے توبہ کہتے ھیں) اور اس کے بعد پھر قانونِ خداوندی کے صراطِ مستقیم پر چل نکلتا ھے۔

کہو سلیم! اس خدا پر ایمان، انسان کے دل میں خدا کی صحیح قدر و قیمت پیدا کرتا ھے یا اُس خدا پر ایمان، جسے انسان نے اپنے ذہن سے تراشا تھا اور جس کے حضور منّتیں مان مان کر عمر بخش اور خدا داد، دونوں اپنے اپنے حق میں مقدّمہ کا فیصلہ چاھتے تھے۔ وہ "خدا" جب انسان کی مدد نہیں کرتا تو انسان اس کے ماننے سے انکار کر دیتا ھے (اور انکار کرنا بھی چاھئے) لیکن یہ خدا (یعنی دین کا خدائے حقیقی جس کا ھمہ گیر قانون

اس محکمیت کے ساتھ کارفرما ھے) اگر کسی کی ”مدد نہیں کرتا“ تو اس کا ماننے والا اپنے یقین کو اور پختہ کر لیتا اور سمجھ لیتا ھے کہ ناکامی اس لئے ھوئی ھے کہ اس کے ھاتھوں سے خدا (کے قانون) کا دامن چھوٹ گیا ھے۔ یعنی اس کی کامیابی اور ناکامی دونوں خدا (کے قانون) پر ایمان میں پختگی پیدا کرنے کا موجب بنتی ھیں۔

یہیں سے یہ بات سمجھ میں آسکتی ھے سلیم! کہ اس خدا (کے قانون) پر ایمان سے وہ باھمی کشمکش بھی ختم ھو جاتی ھے جو ذھن انسانی کے تراشیدہ، انفرادی خدا کے ماننے والوں میں پیدا ھوتی ھے۔ انفرادی خدا کی صورت میں، عمر بخش اور خدا داد، دونوں اپنی اپنی جگہ خدا کو اپنی طرف کھینچتے ھیں۔ لیکن خدا کے قانون پر ایمان رکھنے کی صورت میں خدا کی مدد اس کے ساتھ ھو سکتی ھے جو خدا کے قانون سے ھم آھنگ ھو۔ اگر عمر بخش اور خدا داد میں باھمی تنازعہ یا مناقشہ ھے تو اس کا مطلب یہ ھے کہ یا تو وہ دونوں خدا کے قانون سے الگ ھیں یا ان میں سے (کم از کم) ایک ضرور اس قانون سے مختلف راہ پر گامزن ھے۔ جو شخص خدا کے قانون سے ھم آھنگ نہیں اسے اس قانون سے مدد مانگنے کا حق نہیں۔ اور اگر وہ زبان سے اس کی مدد مانگتا بھی ھے تو بھی اسے اس کی مدد نہیں مل سکتی۔ اس قانون کی تائید و نصرت اسی صورت میں حاصل ھو سکتی ھے کہ وہ بھی اس قانون سے ھم آھنگ ھو جائے۔ اگر وہ بھی اس قانون سے ھم آھنگ ھو گیا تو دونوں ایک دوسرے سے ھم آھنگ ھو گئے۔ اس لیے ان کا تنازعہ خود بخود رفع ھوگیا۔ (تم نے سلیم! اسکول میں جیومیٹری کا یہ قاعدہ تو پڑھا ھی ھوگا کہ جو چیزیں کسی ایک چیز کے برابر ھوں وہ آپس میں بھی برابر ھوتی ھیں)۔ عمر بخش قانون خداوندی سے ھم آھنگ تھا لیکن خداداد نہیں تھا اس

لئے اُن دونوں میں اختلاف و تنازعہ کی صورت تھی ۔ جب خدا داد بھی اس سے ہم آہنگ ہو گیا تو اُن میں کوئی اختلاف یا تنازعہ باقی نہ رہا ۔ معاملہ صاف ہو گیا ۔

اب تمہارے دل میں یہ سوال پیدا ہوگا کہ خارجی کائنات میں خدا کا یہ قانون نہایت واضح ، بیّن ، محکم اور مشہود انداز میں جاری و ساری ہے ۔ لیکن انسانوں کی دنیا میں اس قانون کی کارفرمائی کہیں نظر نہیں آتی ، بلکہ معاملہ اس کے بالکل برعکس نظر آتا ہے ۔ مثلاً خدا کا قانون یہ ہے کہ اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ (٦/١٣٦) ۔ جو قوم حقوق انسانیت میں کمی کرے اس کی کھیتی پروان نہیں چڑھ سکتی ۔ لیکن ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ظالمین پھولتے پھلتے چلے جاتے ہیں اور حقوق کی رعایت رکھنے والے (دیانت دار اور عدل پسند) لوگ ہر جگہ مات کھاتے ہیں ۔ آج دنیا کا یہی چلن ہے ۔ یہ سوال بڑا اہم ہے سلیم ! اور بڑی توجہ سے سمجھنے کے لائق ۔ اس مقام پر ٹھوکر کھا جانے سے بڑے بڑے ارباب عقل و فکر کے پاؤں میں لغزش آ جاتی ہے ۔ تمہیں سمجھانے کے لئے ایک دقّت یہ بھی ہوتی ہے کہ تم سے فلسفیانہ اصطلاحات میں گفتگو نہیں کی جا سکتی ۔ تمہیں میں نے ہزار بار کہا کہ زیادہ نہیں تو فلسفہ کی مبادیات سے واقفیت حاصل کر لو ، لیکن تم نے ایک نہیں سنی ۔ لیکن تم سنو بھی کیوں ؟ تمہیں کوئی دقّت ہو تو سنو بھی ۔ مصیبت تو میرے لئے ہوتی ہے کہ گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل ۔ اس لئے جو بات میں چار لفظوں میں بیان کر سکتا ہوں ، تمہارے لئے چار صفحے لکھنے پڑتے ہیں ۔ بہر حال سنو ، اور سمجھنے کی کوشش کرو ۔

قانون کائنات کی بعض موٹی موٹی باتیں ایسی ہیں ؛ جنہیں ہم ہر وقت کارفرما دیکھتے ہیں ۔ پانی نشیب کی طرف بہتا ہے ۔ آگ حرارت پہنچاتی ہے ۔

زمین کی کشش ثقل سے چیزیں نیچے کی طرف گرتی ھیں۔ ھوا سے ھلکی چیز اوپر کی طرف جاتی ھے، وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اس قانون کا وہ حصہ جو ان بدیہیات سے کہیں اہم، نازک اور دقیق ھے ایسا ھے کہ اس کے نتائج یوں ھی دیکھتے دیکھتے سامنے نہیں آ جاتے۔ نظریۂ ارتقاء (Evolution) کے ماھرین سے پوچھئے وہ بتائیں گے کہ کسی ایک نوع میں ذرا سی تبدیلی پیدا کرنے کے لئے قدرت کو کس طرح ھزار ھا سال تک کروٹیں بدلنی پڑتی ھیں۔ ارتقائی مراحل اس قدر سست رفتاری سے طے ھوتے ھیں کہ گھڑی کی گھنٹوں والی سوئی کی طرح ان کی رفتار محسوس ھی نہیں ھو سکتی۔ یہ رفتار وہ ھے جس کے پیمانوں کے متعلق قرآن میں ھے کہ خدا کا ایک ایک یوم تمہارے حساب و شمار کی رو سے ھزار ھزار اور پچاس پچاس ھزار سال کے برابر ھوتا ھے۔ اس لئے ارتقائی تبدیلیوں کو نہ کوئی آنکھ دیکھ سکتی ھے نہ کسی ایک فرد کا دماغ محسوس کر سکتا ھے۔ ایک فرد کیا، دس دس، بیس بیس نسلوں (Generations) تک بھی یہ تبدیلیاں محسوس شکل میں سامنے نہیں آتیں۔ تبدّل و تحوّل کے اس قانون کو تدریج و امہال کا قانون کہا جاتا ھے۔ یعنی کسی تبدیلی کی پہلی حالت سے آخری حالت تک کا درمیانی وقفہ۔ تبدیلی تو در حقیقت نقطۂ اوّلیں سے شروع ھو جاتی ھے لیکن ھم اسے اس وقت محسوس کرتے ھیں جب وہ مکمل ھو کر مشہود و مرئی شکل میں ھمارے سامنے آتی ھے۔ تمہیں یاد ھے، گزشتہ سردیوں میں جب تم نے پانی چولھے پر رکھا تھا اور میں نے پانچ منٹ کے بعد پوچھا تھا کہ کیا پانی گرم ھو گیا، تو تم نے کہا تھا کہ ابھی کہاں؟ اس پر میں نے کہا تھا کہ سلیم! بات سوچ کر کرو۔ اس پانچ منٹ میں پانی یقیناً گرم ھو گیا ھے، لیکن تم اس کی گرمی کو محسوس نہیں کر رھے۔ تھرمامیٹر رکھ کر دیکھو، اس کی گرمی محسوس ھو جائے گی۔ اسی کا نام قانون تدریج

و امہال ہے۔ یعنی تبدیلی کا بتدریج واقعہ ہونا، عمل اور نتیجہ کے درمیان مہلت کا وقفہ ہونا۔ اسی کو تاجیل بھی کہا جاتا ہے۔ یعنی تبدیلی کے ظہور کی مدّتِ معیّنہ۔ وہ میعاد جس میں قطرہ گہر بن جائے۔

جس طرح عالم آفاق (Physical Universe) میں یہ قانون جاری و ساری ہے، اسی طرح عالم انسانی (یا عالم معنویات) میں بھی یہی قانون کارفرما ہے۔ عمل اور اس کے نتیجے کے درمیان انتظار کا وقفہ لازمی ہے۔ قُلْ فَانْتَظِرُوْا اِنِّیْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِیْنَ)۔ اور جس طرح مادی دنیا میں انتظار کے اس وقفے کے پیمانے بہت وسیع ہیں، اسی طرح نتائج اعمال کے یہ وقفے بھی بہت طول طویل ہوتے ہیں۔ قرآن میں ہے کہ وَ یَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر قانون خداوندی کے خلاف چلنے سے تباہی و بربادی آتی ہے، تو کہاں ہے وہ تباہی و بربادی؟ ان سے کہو کہ لَنْ یُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ۔ ذرا انتظار کرو اللہ کا قانون اٹل ہے۔ اس کے ترتیب نتائج میں کبھی کوتاہی نہیں ہو سکتی۔ لیکن اس کے لئے اس کے پیمانے مختلف ہیں۔ وَ اِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (۲۲/۴۷)۔ قانون خداوندی کے حساب و شمار میں ایک دن، تمہارے ہاں کے ہزار برس کے برابر ہوتا ہے۔ اسی میعاد کو قرآن اجلِ مسمّٰی اور اجلٍ معدودہ کی اصطلاحات سے تعبیر کرتا ہے۔

لیکن اس کے ساتھ ایک اور حقیقت بھی ہے۔ عالم آفاق میں ہر شے قانون کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے اس لئے وہ اس اجل مسمّٰی (مدّتِ معیّنہ) کو گھٹا بڑھا نہیں سکتی۔ یا یوں کہئے کہ وہ قانون کی نتیجہ خیزی کی رفتار میں کمی بیشی نہیں کر سکتی۔ لیکن انسانوں کی دنیا میں اس کا بھی امکان ہے۔

ہم نے دیکھا ہے کہ قانون نام ہے، کسی خاص واقعہ پر، خدا کی ایک خاص صفت کا مشہود ہونے کا۔ ہم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ خود انسانوں کے اندر بھی (اپنے پیمانے پر) یہی صفات موجود ہیں۔ اور اگر ان کی تربیت و پرورش ہو جائے تو یہ بھی صفات خداوندی کی طرح مشہود ہوتی اور وہی نتائج پیدا کرتی ہیں۔

اگر انسانوں کا ایسا معاشرہ قائم ہو جائے جس میں افراد معاشرہ کی یہ صفات تربیت پا کر، صفات خداوندی کی طرح، خاص موقعہ پر مشہود ہوتی رہیں تو قانون خداوندی کی اثر انگیزی اور نتیجہ خیزی کی رفتار کئی گنا زیادہ ہو جائے گی۔ یعنی جب انسانوں کی صحیح قوّتیں، قانونِ خداوندی سے ہم آہنگ ہو جائیں، تو یہ قانون اپنی نتیجہ خیزی میں بہت تیز رفتار (سَرِیْعُ الْحِسَاب) ہو جاتا ہے۔ یہی مفہوم ہے سلیم! قرآن کی اس آیت کا کہ وَ اِنْ تَنْصُرُ وا اللّٰہَ یَنْصُرْکُمْ ”اگر تم قانون خداوندی کی مدد کرو گے تو وہ قانون تمہاری مدد کرے گا“۔ یہی وہ مقام تھا جس کی طرف (جنگ بدر میں) ان الفاظ میں اشارہ کیا گیا کہ ”تم تیر نہیں چلا رہے تھے، ہم خود چلا رہے تھے“۔ قرآنی معاشرے کے افراد اور قانون خداوندی کی اس رفاقت کو قرآن نے ”نزولِ ملائکہ“ سے تعبیر کیا ہے۔ جنگ بدر میں ان ہی ملائکہ کے نزول کا ذکر ہے۔ اور اسی طرح عام حالات میں بھی جہاں فرمایا کہ اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْہِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ (۴۱) ۳۰۔ ”جو لوگ ایک دفعہ کہہ دیتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ ہے اور پھر اس دعوے پر جم کر کھڑے ہو جاتے ہیں، تو ان پر ملائکہ کا نزول ہوتا ہے“۔ ملائکہ وہ قوّتیں ہیں جو قانونِ خداوندی کے

مطابق ، اعمال کو نتیجہ خیز بناتی ہیں ۔ قرآنی معاشرے میں ، افرادِ معاشرہ کی تربیت یافتہ صفات (روحِ خداوندی) اور ان (ملکوتی) قوتوں میں باہمی توافق ہو جاتا ہے اور اس طرح اس قانون کی نتیجہ خیزی کی رفتار تیز سے تیز تر ہو جاتی ہے اور نتائج بہت جلد سامنے آ جاتے ہیں ۔ اتنے جلد کہ یہ جماعت ، اپنے فریق مقابل سے ، پوری خود اعتمادی سے کہہ سکتی ہے کہ یٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ ۔ اے میری مخالف قوم ! تم جو کچھ کر رہے ہو اپنی جگہ کئے جاؤ میں اپنی جگہ کام میں لگا ہوا ہوں فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ بہت جلد نتیجہ سامنے آ جائے گا اور معلوم ہو جائے گا کہ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ۔ آخرالأمر کامیابی کا مقام کس کے لئے ہے ۔ اس وقت تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے کہ خدا کا یہ قانون کس قدر سچا ہے کہ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ (٦/١٣٦) ۔ ” ظلم کرنے والوں کی کھیتی کبھی پروان نہیں چڑھ سکتی “ ۔

یہ ہے طریقہ سلیم ! قانون خداوندی کے نتائج کو اپنے سامنے مرئی و مشہود دیکھ لینے کا ۔ اسے اور واضح الفاظ میں سمجھنا ہو تو دو مثالوں کو سامنے لاؤ ۔ کائنات میں خدا کی صفت خالقیت کا ظہور ہرآن ہوتا رہتا ہے ۔ لیکن تم نظریۂ ارتقاء کے ضمن میں دیکھ چکے ہو کہ ان تخلیقی منازل کی رفتار کس قدر سست ہے ۔ لیکن جب ادھر سے انسانوں کی صفت خالقیت مشہود ہو کر باہر آتی ہے تو وہی تخلیقی عمل نہ صرف یہ کہ بے حد تیزگام ہو جاتا ہے بلکہ اس میں ندرت و تنّوع بھی پیدا ہو جاتا ہے ۔ دھوپ میں رکھی ہوئی روئی صرف گرم ہوتی ہے ، اس میں شعلہ پیدا نہیں

ھوتا۔ لیکن جب وھی دھوپ (انسان کے ساختہ) ”آتشیں شیشہ“ میں سے گزار دی جاتی ھے تو ایک ثانیہ میں شعلہ بھڑک اٹھتا ھے۔ ”پیام مشرق“ میں تم نے خدا اور انسان کا مکالمہ پڑھا ھوگا۔ اس میں انسان اپنی انھی شوخ و شنگ ندرت کاریوں کا ذکر کرتا ھے جب کہتا ھے کہ ؎

تو شب آفریدی چراغ آفریدم سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم من آنم کہ از زھر نوشینہ سازم

اب اس کے بعد صفتِ ربُوبیّت کو لو۔ ربُوبیّت (تربیت) کے معنی تم کئی مرتبہ سن چکے ھو۔ کسی شے کا نقطۂ اوّلیں سے آخری منزل تک بتدریج اوجِ کمال تک پہنچنا، جس طرح (شاعری کی تشبیہ کے اعتبار سے) بطنِ صَدف میں قطرۂ نیساں آھستہ آھستہ بتدریج، تربیّت (پرورش) پاکر گہر بن جاتا ھے۔ لیکن یہ عمل بالکل غیر محسوس اور طول طویل ھوتا ھے۔ اسی لئے تو غالب دل گرفتہ ھو کر کہتا ھے کہ ع

دیکھیں کیا گزرے ھے قطرے پہ گہر ھونے تک

اس لئے کہ خدا کے قانون کے مطابق ع

آہ کو چاھئے اک عمر اثر ھونے تک

لیکن اگر انسان اپنی معاشرتی زندگی میں نظامِ ربُوبیّت قائم کر لیں اور ھر فرد دوسرے فرد کا مربی (ربُوبیّت دینے والا، ربّانی) بن جائے تو پھر، پوچھو سر زمینِ حجاز کے انجم آرا ذرّات سے، کہ انسانی جوھروں کی تکمیل کس طرح بَرق رفتاری سے ھوتی چلی جاتی ھے اور ”زمین سے آسمان“ تک کا یہ سفر

'' معراج '' کس طرح بُراق کے کندھوں پر طے ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ اس شکل میں خدا کے آفاق پروگرام کے ساتھ ان تربیّت یافتہ انسانوں کا ارضی پروگرام بھی رفیق کار بن جاتا ہے اور یوں یہ تمام مراحل کلمح البصر طے ہو جاتے ہیں۔ یعنی اس نظامِ ربُوبیّت کے اندر ایسی فضا پیدا ہو جاتی ہے جس میں ہر فرد کی محنت اپنا پورا پورا نتیجہ مرتب کرتی چلی جاتی ہے اور اس میں کسی قسم کی کمی واقع نہیں ہونے پاتی۔ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (۳ / ۱۶۱)۔

: o :

اب ذرا تم سلیم! توحید کے اس پہلو کو انسانی معاشرے کے سامنے لا کر دیکھو کہ اس میں انسانی خوشگواریوں اور ارتقائی ندرت کاریوں کی کتنی جنّتیں پوشیدہ ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ انسان امن کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے۔ ہر فرد، ہر گروہ، ہر جماعت، ہر قوم، تلاش امن میں ماری ماری پھر رہی ہے۔ جس سے پوچھو وہ یہی کہے گا کہ امن نصیب نہیں۔ انسان اپنے ہزارہا سال کے تاریخی تجارب کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ حقیقی امن صرف اس معاشرے میں مل سکتا ہے جس میں زندگی آئین و قوانین کے مطابق بسر ہوتی ہو۔ جس سر زمین میں بے آئینی کا دور دورہ ہو، وہاں شہنشاہ سے لے کر ایک ادنیٰ مزدور تک، کسی کی زندگی امن سے نہیں گزر سکتی۔

پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ جس قدر فضا پُر امن ہو گی اس میں اسی قدر انسانی صلاحیتوں کے اُبھرنے اور نشو و نما پانے کے مواقع زیادہ ہوں گے۔ چنانچہ دنیا کی مختلف قوموں پر غور کرو۔ جس ملک میں زندگی آئین کے مطابق

بسر هوتی هے وهاں کی قومیں ، دماغی صلاحیتوں میں دوسری قوموں سے آگے هوتی هیں ۔ آئین کے معنی یه هیں که هر شخص کو معلوم هو که فلاں کام کا نتیجه یه هوگا ۔ اگر یه کیا جائے گا تو اس کا مواخذه یوں هوگا ۔ اگر ان چیزوں کی پابندی کی جائے گی تو اس پر کسی قسم کی کوئی گرفت ، کوئی سختی ، کوئی زیادتی نہیں هو گی ۔ اس کی جان ، مال ، آبرو ، سب کچھ محفوظ رهے گا ۔ اس کا احساس ، ان تمام زنجیروں کو کاٹ کر الگ پھینک دیتا هے جن میں انسان کے اعصاب جکڑے رهتے هیں ۔ جس قدر زندگی آئین و قوانین کے مطابق بسر هو گی اسی قدر انسان کو آزادی میسر هو گی ۔ یه حالت اس دنیاوی آئین و قوانین کے تحت زندگی بسر کرنے کی هے جو محکم و استوار یا غیر متبدل نہیں هوتا ۔ اس کے برعکس اس قانون کو دیکھو جو توحید کی رو سے مرتب هوتا هے ۔ اس قانون سے مفهوم یه هے که :

۱۔ تمام کائنات میں ایک هی قانون رائج هے جو انسان اور انسان میں کوئی فرق نہیں کرتا ۔

۲۔ یه قانون ، دوسرے قوانین پر غالب رهتا هے ۔ دنیا کا کوئی قانون بھی اسے شکست نہیں دے سکتا ۔

۳۔ یه قانون اس قدر محکم ، اٹل ، غیر متبدل اور یقینی طور پر نتیجه خیز هے که اس میں کسی قسم کی غلطی ، سهو یا لغزش کا امکان هی نہیں ۔ قانون کی محکمیت کا یه عالم هے که انسانوں کو تو اجازت هے که وه جس قسم کی روش چاهیں اختیار کر لیں ۔ لیکن قانون کو یه اجازت نہیں که وه جس قسم کا چاهے نتیجه پیدا کر دے ۔ جس قسم کی روش انسان اختیار کریں گے قانون مجبور هے که اس کے

مطابق نتیجہ برآمد کرے۔

۴۔ اس میں ان انسانوں کو بھی کسی ردّ و بدل کر لینے کی اجازت نہیں جن کے ہاتھوں سے یہ قانون نفاذ پذیر ہوتا ہے۔ نہ اس میں کسی کی سفارش چلتی ہے نہ کسی کی رُو رعایت ہوتی ہے۔ نہ کسی پر زیادتی ہے۔ نہ کوئی بے گناہ پکڑا جاتا ہے۔

اب سوچو سلیم! کہ جس معاشرے میں اس قسم کا قانون نافذ ہوگا اس میں امن و سکون کا کیا عالم ہوگا؟ اس معاشرے میں خوف و حزن کا دخل تک نہیں ہو سکتا۔ ہر شخص جو قانون کی پابندی کرے گا، ہر قسم کے خوف سے آزاد ہوگا۔ یہ ہے وہ معاشرہ جس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ مَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ جس نے قانون خداوندی کی پابندی کر لی وہ خوف و حزن سے مامون ہو گیا۔ اللہ اکبر! کتنی بڑی ہے یہ ضمانت (Security)۔ جس معاشرے میں انسانوں کو اس قسم کا امن نصیب ہو جائے اس میں ان کی خوابیدہ قوّتیں کس قدر بیدار اور مضمر صلاحیتیں کتنی جلدی مشہود ہو جائیں گی۔ انسانی اعصاب سے بے آئینی کے خوف کا بوجھ اتار دیجئے۔ اس کی صلاحیتیں خود بخود ابھرنی شروع ہو جاتی ہیں۔ یہ تھا حقیقی سبب، سلیم! اس کا کہ نبی اکرمؐ نے اتنی مختصر سی مدّت میں، نہ صرف تمدن کی دنیا میں، بلکہ خود انسانی قلوب کی بستیوں میں اس قدر محیرالعقول انقلاب پیدا کر دیا۔ آپ نے اس باب میں کیا کیا تھا؟ انسانوں تک خدا کا قانون پہنچا دیا اور اس قانون کو اس معاشرے میں نافذ کر دیا۔ انسانوں میں سب سے بڑی شخصیت خود رسول اللہؐ کی ہو سکتی تھی۔ انہوں نے سب سے پہلے اعلان کر دیا کہ میری حیثیت حاکم کی نہیں بلکہ قانون

کے متبع کی ہے أَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ ۔ میں خود سب سے پہلے اس قانون کی اطاعت کرتا ہوں ۔ تم ہمیشہ اس حقیقت کو اپنے سامنے رکھو کہ (لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه) قانون صرف ایک خدا کا ہے ۔ کسی اور کا نہیں (مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰه) ۔ اور تو اور ، انسانوں میں سب سے زیادہ ممتاز ہستی (محمدؐ) کی پوزیشن بھی اتنی ہی ہے کہ وہ اس قانون کا انسانوں تک پہنچانے والا ہے ۔ اسے بھی کوئی حق نہیں کہ کسی پر اپنا حکم چلائے ۔ خدا اپنے قانون میں کسی کو شریک نہیں کرتا ۔ لَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖ اَحَدًا ۔ جب لوگوں کو اس امر کا یقین ہو گیا کہ یہاں فی الواقعہ اطاعت قانون کی ہے اور قانون بھی ایسا جس میں کوئی انسان کسی قسم کا رد و بدل نہیں کر سکتا ، تو اُن کے دل و دماغ سے وہ تمام بوجھ اُتر گئے جن کے نیچے وہ دب رہے تھے ۔ وَ يَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ (۷/۱۵۷) ۔ جب اس طرح بوجھ اُتر گئے تو لوگوں کو صحیح معنوں میں آزادی مل گئی ۔ ان کی قوتوں نے پھولنا پھلنا اور نشو و نما پانا شروع کر دیا اور چند دنوں میں وہی اونٹ چرانے والے ، بہترین انسانی صلاحیتوں کے مالک بن گئے ۔ مغرب کے مؤرخین عمر بھر تحقیق کرتے رہتے ہیں اور پھر بھی سمجھ نہیں پاتے کہ نبی اکرمؐ نے ایسا محیر العقول انقلاب پیدا کس طرح کر دیا ؟ بات صرف اتنی تھی کہ اس معاشرے میں آئینی زندگی کا امن پیدا ہو گیا تھا اور اس امن کا لازمی نتیجہ انسانی صلاحیتوں کی نشو و نما تھا ۔ انسان کے اندر بے پناہ قوتیں موجود ہیں ۔ جب وہ قوتیں اس طرح یک لخت اُبھر کر بروئے کار آ جائیں تو اُن کی رُو سے پیدا شدہ انقلاب کا کیا ٹھکانہ ہے ۔ جن انسانوں کی صلاحیتیں یوں نمودار ہو جائیں وہ (عام الفاظ میں) انسان نہیں رہتے ، کچھ اور ہو جاتے ہیں ۔

ان انسانوں کا مقابلہ وہ لوگ کبھی نہیں کر سکتے جن کی صلاحیتیں دبی ہوئی ہوں ۔ ہم—غلام ابن غلام ابن غلام—اس کا کیا اندازہ لگا سکتے ہیں سلیم ! کہ نشو و نما یافتہ صلاحیتیں انسان کو کیا سے کیا بنا دیتی ہیں ؟ ہمارے نصیب میں ، ساری زندگی میں ، ایک سانس بھی ایسا نہیں ہو سکتا جس میں ہم کہہ سکیں کہ ہم پر قانون خداوندی کے علاوہ اور کسی کی حکومت نہیں ۔ یہ اتنی بڑی سعادت تھی کہ جب وادئ ضجنان میں حضرت عمرؓ کا گزر ہوا تو وہ سواری سے اُتر کر سجدہ ریز ہو گئے ۔ ساتھیوں نے پوچھا کہ یہ کونسا مقام سجدہ تھا ؟ فرمایا کہ عمرؓ اس میدان میں اُونٹ چرایا کرتا تھا ۔ باپ ایسا سخت گیر تھا کہ مار مار کر کھال اُدھیڑ دیا کرتا تھا ۔ ایک وہ دن تھا اور ایک آج کا دن ہے کہ :

> عمرؓ اور اُس کے خدا کے درمیان کوئی طاقت حائل نہیں ۔

سلیم ! آج تمام روئے زمین پر کوئی فرد بھی ایسا ہے جو چھاتی پر ہاتھ رکھ کر عمرؓ کی ہمنوائی میں کہہ سکے کہ :

> میرے اور میرے خدا کے درمیان کوئی قوت حائل نہیں ۔

یہ تھی وہ حقیقی حریت اور آزادی جو آئین کی سچی پابندی نے ان لوگوں کو عطا کر دی تھی ، اور اسی آزادی کا نتیجہ تھا کہ اُونٹ چرانے والا عمرؓ دنیا کی ممتاز ترین شخصیت قرار پا گیا ۔ اور ، ایک حضرت عمرؓ ہی پر کیا موقوف ، وہ معاشرہ پورے کا پورا اُمت وسطیٰ (بین الاقوامی قوم) کی حیثیت اختیار کر گیا ۔ اس حریت بخشی میں خود تربیت نبویؐ کا کتنا بڑا حصہ تھا ، اس کی تفصیلات تم ”معراج انسانیت“ میں پڑھ چکے ہو ۔ اس لئے اس خط میں ان کے دہرانے کی ضرورت نہیں ۔ دو لفظوں میں یوں سمجھ لو کہ حضورؐ نے

ساری عمر میں، قوانین خداوندی کے نفاذ سے الگ کوئی چھوٹی سے چھوٹی بات بھی اپنی طرف سے نہیں منوائی۔ یہی وجہ تھی کہ جب حضورؐ کسی سے کچھ فرماتے تو (دنیاوی نقطۂ نگاہ سے) ادنٰی سے ادنٰی آدمی بھی آزادی سے یہ پوچھ لیتا کہ یہ خدا کا حکم ہے یا آپؐ کی اپنی رائے ہے۔ اور اگر آپؐ فرماتے کہ نہیں یہ میری اپنی رائے ہے تو وہ نہایت اطمینان سے کہہ دیتا کہ میں اپنے معاملہ کو بہتر سمجھتا ہوں، اس لئے آپ کی رائے کو نہیں مان سکتا۔ ایسا کہنے پر نہ تو کہنے والے کے دل میں کبھی گمان تک بھی گزرتا کہ اس ”عدول حکمی“ کا نتیجہ کیا ہوگا اور نہ رائے دینے والے کے دل میں اس کا خیال تک بھی آتا کہ اس نے میری بات نہیں مانی۔

یہ ہے قرآنی معاشرے میں توحید کے آئینی پہلو کا عملی اثر!

یہ ہے سلیم! وہ خدا جس پر ایمان لانے کا مطالبہ قرآن کی طرف سے کیا جاتا ہے۔ مختصر الفاظ میں اس حقیقت کو پھر دہرا لو کہ یہ خدا کسی انسان کے ذہن کی تخلیق نہیں، بلکہ ایک موجود فی‌الخارج (Objective) ذات ہے جسے حقیقت مطلق (Absolute Reality) کہا جاتا ہے۔ اس خدا کا تعارف ان صفات کی رو سے ہوتا ہے جو اس نے خود وحی کے ذریعے بیان کر دی ہیں۔ اور یہ وحی آج اس آسمان کے نیچے صرف قرآن کے اندر ہے۔ اس خدا کی صفات ایک طرف انسان کے لئے زندگی کا نمونہ (Pattern) بنتی ہیں اور دوسری طرف ان کا ظہور اس عالمگیر قانون کی صورت میں ہوتا ہے جو رگِ کائنات میں خون زندگی کی طرح جاری و ساری ہے۔ یہی وہ خدا ہے جس پر ایمان کا مطالبہ تمام نوع انسانی سے کیا جاتا ہے، بلا لحاظ اس کے کہ وہ خدا کے ماننے کے مدعی

ہیں یا نہیں ۔ نزول قرآن کے وقت ، عرب میں اہل کتاب بھی موجود تھے جو خدا کو ماننے کے مدعی تھے ، اور ان کے علاوہ ایسے لوگ بھی تھے جو بلا مذہبی گروہ بندیوں کے لیبل کے خدا پر ایمان رکھتے تھے ۔ (عربوں کی تاریخ میں اُنہیں حنفاء کے نام سے پکارا جاتا ہے*) ۔ قرآن کہتا ہے کہ یہود و نصارٰی ہوں ، جو مذہبی گروہ بندیوں میں جکڑے ہوئے خدا پر ایمان کے مدعی ہیں ۔ یا بلا گروہ بندی کی تخصیص کے خدا کو ماننے والے ۔ ان کا خدا پر ایمان ، اُس خدا پر ایمان نہیں جسے وحی نے پیش کیا ہے اور جو قرآن کے اندر ہے ۔ لہٰذا ان لوگوں کے لئے بھی اسی طرح ” قرآنی خدا “ پر ازسر نو ایمان لانا ضروری ہے جس طرح ان لوگوں کے لئے ضروری ہے جو خدا کے منکر ہیں ۔ اس لئے کہ جہاں تک ” قرآنی خدا “ کا تعلق ہے ان ماننے والوں کا ایمان اور نہ ماننے والوں کا انکار یکساں ہے ۔ جب تک یہ سب قرآن کے بتائے ہوئے خدا پر ایمان نہیں لائیں گے ، جوہرِ انسانیت کو تباہ کر دینے والی قوّتوں کے خطرات سے محفوظ نہیں ہو سکیں گے ۔ دیکھو سلیم ! قرآن نے اس حقیقت کو کس قدر واضح الفاظ میں بیان کیا ہے ۔ جب فرمایا کہ

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ، وَالَّذِیْنَ هَادُوْا ، وَالصَّابِؤُنَ
وَالنَّصَارٰی ، مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ

---

*اس قسم کے لوگ آج بھی موجود ہیں ۔ یورپ کے اکثر مفکرین اپنے آپ کو کسی مذہب کا پیرو نہیں بتاتے (نہ ہی وہ کسی مذہب کے پیرو ہیں) لیکن خدا کو (اپنے اپنے انداز کے مطابق) مانتے ہیں ۔ یعنی یہ نہ یہودی ہیں نہ نصرانی ۔ لیکن (اپنے خیال کے مطابق) خدا پر ایمان رکھتے ہیں ۔

> صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ (۵/۶۹) -
>
> جو لوگ (بلا مذہبی گروہ بندی کے لیبل کے) خدا کو ماننے کے مدعی ہیں۔ یا جو لوگ یہودی بن چکے ہیں یا صابی یا نصاریٰ (اور اپنے اپنے اندازوں کے مطابق خدا کو مانتے ہیں۔ ان کا یہ ایمان حقیقی خدا پر ایمان نہیں) ان میں سے جو بھی اس خدا پر ایمان لائے گا جسے قرآن نے پیش کیا ہے اور قانون مکافات عمل کے مطابق مستقبل کی زندگی پر، اور اس کے بعد (قرآنی پروگرام کے مطابق) انسانی صلاحیتوں کو ابھارنے والے کام کرے گا۔ تو یہ وہ لوگ ہیں جو خوف و حزن سے محفوظ و مصئون رہیں گے۔

اسی حقیقت کو دوسری جگہ ان الفاظ میں دھرا دیا کہ وَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا - اگر یہ لوگ بھی اسی طرح ایمان لائیں جس طرح تم ایمان لائے ہو، پھر ایسا ہوگا کہ ان پر آگے بڑھنے کی راہیں کھل جائیں گی۔ جس نے اس خدا کو زندگی کا نصب العین بنانے اور اس کے قانون کو ایک عالمگیر قانون تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ یا خدا کے اس تصوّر کے ساتھ اپنے تصوّرات بھی ملا دئیے اور اس کے قانون کے علاوہ کسی اور قانون کو بھی کارفرما سمجھ لیا، اس پر زندگی کی برومندی کی راہیں نہیں کھل سکتیں۔ یہ ہے سلیم! خدا پر ایمان اور اس سے کفر اور شرک کا مفہوم!

———— : o : ————

خط بہت لمبا ہو گیا ہے اس لئے تمہارا یہ مطالبہ کہ خدا کی صفات

(اسماء الحسنیٰ) کا کچھ اجمالی تعارف کرا دیا جائے اور یہ بھی بتا دیا جائے کہ جو معاشرہ ان افراد پر مشتمل ہوگا جن میں ان صفات کی نمود ہوگی، اس میں انسانیت کا انداز کیا ہوگا، کسی دوسرے وقت سہی* ؎

مے باقی و ماهتاب باقیست مارا بتو صد حساب باقیست

والسلام
جولائی ۱۹۵۲ء

---

* ”خدا کے تصوّر“ کا موضوع بڑا اہم اور وضاحت طلب ہے۔ اسے ایک مستقل تصنیف میں شرح و بسط سے بیان کیا گیا ہے جس کا نام ہے ”من و یزداں“۔ صاحبِ ذوق حضرات کے لئے اس کا مطالعہ بڑا فائدہ رساں ہوگا۔

آنیسواں خط

(مقام محمدی ص)

آج سلیم ! تم نے ایک ایسی بات پوچھی ہے جس کے متعلق کچھ لکھنے کے لئے قلم اٹھاتے وقت ہاتھ کانپ آٹھتا ہے ، اس لئے کہ یہ مقام وہ ہے جس کے متعلق کہنے والے نے صحیح کہا ہے کہ ؎

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر
نفس گُم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

تمہیں معلوم ہے عزیزم ! کہ میری زندگی کا مشن ، پیام خداوندی کو عام کرنا ہے ۔ لیکن پیام خداوندی سمجھ میں نہیں آ سکتا تا وقتیکہ مقام محمدی ص نگاہوں کے سامنے نہ ہو ۔ مقام محمدی ص (کہ جسے دوسرے لفظوں میں مقام نبوّت کہا جائے گا) ماورائے سرحد ادراک ہے ۔ یعنی وحی کا سرچشمہ وہ مقام ہے جو انسانی عقل سے آگے ہے ۔ اس لئے نہ تو مقام محمدی ص کا تعین عقل کی رو سے کیا جا سکتا ہے ۔ اور نہ ہی عقل کی رو سے اس کی کُنہ و حقیقت اور کیفیت و ماہیت تک پہنچا جا سکتا ہے ۔ یعنی یہ چیز عقل کے بس کی بات نہیں کہ یہ سمجھ سکے کہ وحی کی ماہیت کیا ہوتی ہے اور وہ نبی کو کس طرح ملتی ہے ۔

اس لئے اس کے متعلق جو کچھ سمجھا جا سکتا ہے اسے خدا ہی سمجھا سکتا ہے جو وحی کا سر چشمہ ہے ۔ اس مقام کے متعلق یوں تو قرآن کے مختلف گوشوں میں منتشر طور پر بہت کچھ کہا گیا ہے ، لیکن سورۂ والنجم کی ابتدائی آیات میں اسے اس حسن ایجاز و ارتکاز سے بیان کیا گیا ہے کہ جوں جوں نگۂ بصیرت اس پر غور کرتی ہے ، ان چھوٹے چھوٹے موتیوں میں بڑے بڑے اہم حقائق اس طرح سموئے ہوئے دکھائی دیتے ہیں جیسے آنکھ کے تل میں آسمان ۔ ان آیات کے متعلق مجمل طور پر میں نے تم سے زبانی ذکر کیا تھا ۔ اب اس اجمال کی تفصیل لکھتا ہوں ۔ ذرا غور سے سننا ۔

ان آیات تک پہنچنے سے پہلے ، تمہیداً کچھ سمجھ لینا ضروری ہے ۔ یہ نوع انسانی کی بد قسمتی تھی کہ ہمارے دور میں جس قوم (اہل مغرب) نے سائنس کی دنیا (کائناتی علوم) میں اس قدر تحقیق و تفتیش کی ، اس کے سامنے مذہب (عیسائیت) وہ تھا جو علم کا دشمن اور عقل کا حریف تھا ، اور جن ” حقائق کائنات “ کو وہ مذہب ، وحی کی بنا پر پیش کرتا تھا ، وہ علمی تحقیقات کی روشنی میں ایک ثانیہ کے لئے بھی ٹھہر نہیں سکتے تھے ۔ اس لئے کہ جو وحی حضرت عیسیٰؑ کی طرف نازل ہوئی تھی، وہ اپنی اصلی شکل میں موجود نہ تھی اور جس تعلیم کو وحی (انجیل) کہا جاتا تھا وہ در حقیقت انسانوں کی خود ساختہ تعلیم تھی ۔ نتیجہ اس کا یہ کہ یورپ کے یہ محققین نفس وحی سے بد گمان ہو گئے ۔ چنانچہ وہاں ایک فکری تحریک رونما ہوئی جس کی رو سے کہا رہ گیا کہ اس کائنات کے پیچھے تو یقیناً ایک عظیم قوت ہے جو اسے اس حسن و خوبی سے چلا رہی ہے ۔ لیکن جہاں تک انسانی معاملات کا تعلق ہے ، خدا اور اس کی راہ نمائی کا ان سے کوئی واسطہ نہیں ۔ انسان کو اپنے معاملات عقل کی رو سے طے کرنے چاہئیں ۔ انسانی راہ نمائی کے لئے عقل سے بلند کوئی

سر چشمہ نہیں ۔ یہ تحریک (Humanism) کے نام سے متعارف ہے ۔ اس تحریک کے علمبردار اسے محض فکری تحریک تک محدود نہیں رکھنا چاہتے تھے ۔ ایک مذہب کی حیثیت سے اختیار اور رائج کرنا چاہتے تھے ۔ چنانچہ اس تحریک کے ایک مشہور مفکر (Julian Huxley) نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے (Religion Without Revelation) ۔ یعنی وہ مذہب جس کی بنیاد وحی پر نہیں ۔ اس وقت اس کی فرصت نہیں (اور یوں بھی اس سے میں اپنے موضوع سے دور ہٹ جاؤں گا) ، ورنہ میں بتاتا کہ ھکسلے جس قسم کے مذہب کی تلاش میں ہے وہ کس طرح قرآن کی وحی میں پہلے ھی سے موجود ہے ۔ نہ صرف اتنا جتنے کی اسے تلاش ہے ، بلکہ اس سے کہیں زیادہ ۔ اگر مغرب کے ان مفکرین کے سامنے قرآن ہوتا تو ان پر یہ حقیقت منکشف ہو جاتی کہ خدا کی وحی جو اپنی اصلی شکل میں ہو ، وہ نہ علم کی دشمن ہوتی ہے ، نہ عقل کی حریف ۔ علم و عقل کی حریف ہونا تو در کنار ، جوں جوں علمی تحقیقات آگے بڑھتی ہیں اس وحی کے دعاوی حقیقت ثانیہ بنتے چلے جاتے ہیں ۔ بہر حال ان مفکرین کا مسلک یہ ہے کہ اس خدا کو تو مان لیا جائے جس کے قوانین خارجی کائنات میں کارفرما ہیں ، لیکن اس خدا سے انکار کیا جائے جس کے قوانین انسانی دنیا میں راہ نمائی کا کام دیتے ہیں ۔ اگر بہ نظر تعمق دیکھا جائے تو ان کی یہ روش ایک قسم کا نفسیاتی تضاد (Psychological Contradiction) ہے جس کی رو سے وہ ایک طرف اس تسکین کو حاصل کرنا چاہتے ہیں جو خدا پر ایمان سے نصیب ہوتی ہے اور دوسری طرف ان پابندیوں سے آزادی چاہتے ہیں جو خدا پر ایمان کا لازمی نتیجہ ہوتی ہیں ۔ تم یہ سن کر حیران ہو گے کہ قرآن نے ان (Humanists) کو المکر کر پکارا ہے اور واضح الفاظ میں کہا ہے کہ اس خود فریبی سے حاصل کیا ہے ؟ محض کائناتی خدا کو

ماننا اور انسانی دنیا سے اس کا کوئی واسطہ نہ سمجھنا، خدا پر ایمان نہیں، اس سے انکار ہے۔ لہٰذا اگر تم نے اسے ماننا ہے تو پورے طور پر مانو۔ اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّةً (۲/۲۰۸)۔ اور اگر انکار کرنا ہے تو کھلے بندوں انکار کرو۔ یہ کیا کہ

منکر مے بودن و ہمرنگ مستان زیستن

تم شاید سلیم! یہ کہو کہ نزول قرآن کے زمانے میں (Humanists) کہاں تھے جو اس نے انہیں للکار کر ان کی اس غلط روش پر متنبہ کیا۔ یہ تو ہمارے زمانے میں پیدا ہوئے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ اُس زمانے میں (Humanists) نام رکھنے والا گروہ موجود نہیں تھا۔ لیکن قرآن کا تو اعجاز ہی یہ ہے کہ وہ انسانی فکر کی ہر لغزش کو نمایاں (Point Out) کرتا اور اس کی ہر خامی کو واضح کرکے، مثبت دلائل سے، اس کی تردید کرتا ہے۔ تم دیکھو نہ اس نے (Humanists) کی غلط نگہی کو کس انداز سے پیش کیا ہے اور کس طریق سے اس کی تردید کی ہے۔ سورۂ المومنون میں ہے قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِیْهَا اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۲۳/۸۴)۔ ان سے پوچھو کہ زمین اور جو کچھ اس کے اندر ہے وہ سب کس کے پروگرام کی تکمیل کے لئے ہے اور اس کا مالک و آقا کون ہے؟ اس کے ساتھ ہی ان سے یہ بھی کہو کہ اس کا جواب تعصب اور جہالت سے نہ دیں، علم و بصیرت کی رو سے دیں۔ اس کے بعد قرآن کہتا ہے کہ اس کے جواب میں یہ یقیناً یہی کہیں گے کہ یہ سب خدا کے پروگرام کی تکمیل کے لئے ہے۔ اور وہی اس کا مالک اور آقا ہے۔ (سَیَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ)۔ اس لئے کہ علم کی بارگہ سے اس کے سوا کچھ اور جواب مل ہی نہیں سکتا۔ اس پر قرآن کہتا ہے کہ جب تمہاری عقل و دانش اور

علم و بصیرت تمہیں اسی نتیجہ تک پہنچاتی ہے ، تو پھر تم اصل حقیقت کو کیوں اپنے سامنے نہیں لاتے ؟ قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ (۲۳/۸۴ - ۸۵) - پھر وہ کہتا ہے کہ ان سے پوچھو کہ اس فضائے آسمانی میں تیرنے والے مختلف کروں میں جو کچھ ہے ان کی زندگی اور نشو و نما کس قانون کے مطابق ہو رہی ہے ؟ نہیں ! اتنا ہی نہیں ، بلکہ یہ پوچھو کہ اس تمام کائنات کی نشو و نما (Development) کا مرکزی کنٹرول کس کے ہاتھ میں ہے ؟ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ (۲۳/۸۶) - اس کے جواب میں بھی وہ یہی کہیں گے کہ یہ سارا کنٹرول خدا ہی کے لئے ہے (سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ) اس کے بعد قرآن کہتا ہے کہ ان سے کہو کہ جب حقیقت یہ ہے تو پھر تم اس کی نگہداشت کیوں نہیں کرتے ؟ (قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ) - پھر قرآن یہ کہتا ہے کہ ان سے پوچھو کہ کائنات کی ہر شے پر اقتدار کس کا ہے ؟ کس کا قانون ہے جس کے تابع یہ تمام اشیاء اس طرح مصروف سعی و عمل ہیں - وہ کون ہے جس کی طرف ہر شے اپنی حفاظت کے لئے پناہ ڈھونڈھتی ہے اور جو اس کے قانون کی خلاف ورزی کرے اسے کہیں پناہ نہیں مل سکتی - بتاؤ کہ تمہارا علم و فکر تمہیں کیا جواب دیتا ہے - قُلْ مَنْۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۲۳/۸۸) - وہ کہتا ہے کہ اس کے جواب میں بھی یہ یہی کہیں گے کہ یہ سب کچھ خدا ہی کے قانون کے مطابق ہو رہا ہے - (سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ) -

خارجی کائنات میں قوانین خداوندی کی ان کار فرمائیوں کا اقرار لینے کے بعد ، قرآن یہ پوچھتا ہے کہ تم بتاؤ کہ جب تمہارا علم و بصیرت تمہیں خود

اس نتیجہ پر پہنچا رہا ہے کہ :

۱۔ خارجی کائنات کی تمام اشیاء ایک غیر متبدل ، مستقل ، محکم قانون کے مطابق چل رہی ہیں ۔ اور

۲۔ یہ قوانین ان کے اپنے بنائے ہوئے نہیں ، بلکہ خدائے کائنات کے متعین کردہ ہیں ۔

تو کیا اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ انسان کے لئے بھی غیر متبدّل قوانین حیات اور مستقل اقدار (Permanent Values) کی ضرورت ہے ۔ اور یہ مستقل اقدار اس کی اپنی عقل و خرد کی وضع کردہ نہیں ہو سکتیں ۔ وہ کون سی بات ہے جس سے تمہیں اس کا دھوکا لگتا ہے کہ انسان ، کائنات کے اس قاعدہ کلیہ سے مستثنیٰ ہے ۔ فَاَنّٰی تُسْحَرُوْنَ (۲۳/۸۹) ۔ کیا انسان بھی اسی کائنات کا جزو نہیں ؟ انسان کو اگر باقی اشیائے کائنات سے امتیاز حاصل ہے تو تو صرف اس بات میں کہ یہ ان قوانین کی اطاعت بطیب خاطر (اپنی مرضی سے) کرتا ہے اور دیگر اشیائے کائنات ان کے مطابق چلنے کے لئے مجبور پیدا کی گئی ہیں ۔ انسان کے معاملہ میں یہ صورت نہیں کہ اسے مستقل قوانین کی ضرورت ہی نہیں ، یا یہ ان قوانین کو خود وضع کر سکتا ہے ۔ یہ قوانین خدا ہی کی طرف سے مل سکتے ہیں ۔ بَلْ اَتَیْنٰھُمْ بِالْحَقِّ ۔ ہم ہی اُنہیں اٹل اور غیر متبدل قوانین دے سکتے ہیں ۔ اگر یہ ان قوانین سے انکار کرتے ہیں اور خارجی دنیا میں خدا کی کبریائی پر ایمان لاتے ہیں تو یہ اپنے دعوائے ایمان میں جھوٹے ہیں ۔ وَاِنَّھُمْ لَکٰذِبُوْنَ (۲۳/۹۰) ۔

تم نے غور کیا کہ قرآن کس طرح (Humanists) کے اس مسلک کی

تردید کرتا ہے کہ خارجی کائنات میں خدا کی خدائی کو تسلیم کر لیا جائے ممکن انسانی دنیا میں اس کی طرف سے راہ نمائی کی ضرورت نہ سمجھی جائے۔ وہ ایسے خدا پر ایمان ہی تسلیم نہیں کرتا۔ خدا پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ انسانی دنیا میں بھی خدا کی طرف سے عطا کردہ قوانین کی ضرورت سمجھی جائے اور اس کی راہ نمائی کے مطابق زندگی بسر کی جائے۔

قرآن نے یہ کچھ چودہ سو سال پہلے کہا تھا۔ لیکن اب مغرب کے مفکرین، (Humanism) کے مسلک کی بنیادی غلطی کو محسوس کرکے خود اس نتیجہ پر پہنچ رہے ہیں کہ خدا کو ماننے کے معنی ہی یہ ہیں کہ اس کی راہ نمائی پر ایمان لایا جائے۔ چنانچہ ہمارے دور کا ایک عظیم طبیعیاتی (Physicist) ایڈنگٹن اپنی کتاب (Science And The Unseen World) میں لکھتا ہے کہ:

> اصل سوال خدا کی ہستی کا نہیں بلکہ اس امر کا یقین ہے کہ خدا بذریعہ وحی انسانوں کی راہ نمائی کرتا ہے*۔

اوسپنسکی (Ouspensky) اس حقیقت کو اور بھی واضح الفاظ میں بیان کرتا ہے جب وہ کہتا ہے کہ:

> اگر وحی کا تصوّر نہ ہو تو مذہب ہی باقی نہیں رہتا۔ اور مذہب میں کوئی عنصر تو ایسا ہوتا ہے جو فکر انسانی کے احاطے سے باہر ہو۔ اس لئے اگر یہ کوشش کی جائے کہ جن باتوں کو انسانی عقل اچھا سمجھتی ہے انہیں ایک جگہ

---

*یہ الگ سوال ہے کہ ایڈنگٹن کے ذہن میں وحی کا تصوّر کس قسم کا ہے۔

> اکٹھا کر کے اس کا نام مذہب رکھ لیا جائے تو اس سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ ایسی کوششوں کا نتیجہ مذہب نہیں بلکہ ایک زبوں حال فلسفہ ہوگا۔
>
> (New Model Of The Universe)

تم نے غور کیا سلیم! کہ خود مغرب کے مفکّرین کس طرح، خدا کے ساتھ وحی کی ضرورت کو لاینفک قرار دے رہے ہیں۔ یعنی ان کے نزدیک مقامِ نبوّت کے بغیر مذہب کا تصوّر ہی ممکن نہیں۔

اب یہ دیکھو کہ قرآن نے مقامِ نبوّت کو کن الفاظ میں سمجھایا ہے۔ لیکن یہاں پھر چند الفاظ تمہیداً ضروری ہیں۔ اسی ہکسلے نے، اگست ۱۹۵۶ء میں نیویارک میں ایک تقریر کے دوران میں کہا تھا کہ وہ جس مذہب کی تلاش کر رہا ہے اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ اسے پیش ایسے انداز میں کیا جائے:

> جو ایک طرف ایسا سلیس اور سادہ ہو کہ عام سطح کے انسان بھی اس سے نہ اندوز ہو سکیں۔ اور دوسری طرف اس قدر عمیق اور پُرمعنی کہ بلند پایہ مفکر بھی اس سے مطمئن ہو جائے۔
>
> (نیویارک ٹائمز ۲۲ ۸ ۵۲)۔

تم دیکھو کہ قرآن کریم اس معیار پر بھی کس طرح پورا اُترتا ہے۔ اس نے بات یہ سمجھائی ہے کہ جس طرح خارجی کائنات میں ہر شے ایک غیر متبدّل قانون کے تابع سرگرم عمل ہے اور وہ قانون اس کا اپنا وضع کردہ نہیں، اسی طرح انسان کے لئے بھی اسی قسم کے غیر متبدّل قوانین کی ضرورت ہے جو اسے

وحی کی رو سے ملیں۔ قرآن نے یہ بات سمجھائی تھی اور (سب سے پہلے) سمجھائی تھی اُس قوم کو جو نہ کارگۂ کائنات کے نظم و نسق سے واقف تھی، نہ سائنٹیفک تحقیقات سے آشنا۔ اُس قوم کی علمی سطح کیا تھی اس کا اندازہ اس سے لگاؤ کہ وہ قوم آج سے چودہ سو سال پہلے کے زمانے میں تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جسے اس زمانے کے لوگ تاریک زمانہ (Dark Ages) کہتے ہیں۔ یعنی خود زمانے کے اعتبار سے وہ دور تاریکی کا دور تھا۔ پھر اس تاریکی کے دور میں عرب کا ملک، اپنے ہم عصر ممالک میں، تہذیب و تمدن تو ایک طرف، علم و بصیرت میں بھی سب سے پیچھے تھا۔ حتٰی کہ اس خطہ میں ایسے لوگ بھی کچھ زیادہ نہ تھے جو معمولی نوشت و خواند سے واقف تھے۔ یہ لوگ اونٹوں کے دودھ اور کھجوروں کی گٹھلیوں پر گزارہ کرتے تھے۔ یہ تھے اولیں مخاطب جنہیں یہ سمجھانا تھا کہ تمہیں زندگی میں مستقل قوانین کی ضرورت ہے اور یہ قوانین وہاں سے ملیں گے جہاں سے خارجی کائنات کو اٹل قوانین فطرت ملے ہیں۔ دیکھو کہ قرآن ان لوگوں کو اس قسم کی بلند اور دقیق حقیقت کن الفاظ میں سمجھاتا ہے، اور پھر یہ بھی دیکھو کہ اس حقیقت کو جن الفاظ میں اس جاھل اور ناخواندہ قوم کو از منۂ مظلمہ میں سمجھایا گیا تھا وھی الفاظ آج اس دورِ علم و تمدن میں بلند ترین مفکروں کے سامنے کس طرح انکشاف حقیقت کرتے ہیں؟

وہ بادیہ نشین قوم تھی۔ اُن کی زندگی کا معمول یہ تھا کہ۔۔ ہر صبح سفر، ہر شام سفر، بلکہ صبح تو گاہے ماہے۔ سفر اکثر و بیشتر شام ھی کو ھوتا۔ اس لئے کہ دن کے وقت ریگستان میں سخت گرمی ھوتی اور ان کے کاروان اکثر راتوں کو سفر کرتے۔ لیکن ان کا یہ سفر گرانڈ ٹرنک روڈ پر نہیں ھوتا تھا کہ پشاور سے چلے اور آنکھیں بند کئے سیدھے کلکتہ پہنچ گئے۔ ان کا سفر

صحراؤں میں ہوتا جن میں نہ کہیں سڑکیں تھیں نہ نشانات راہ۔ اگر کبھی کسی نے کوئی نشانات متعین بھی کر لئے۔ (مثلاً یہ کہ یہاں کوئی ٹیلہ ہے اور وہاں کچھ جھاڑیاں) تو صحرا میں چلنے والی ہوائیں اور اُن سے اُڑنے والی ریت، دوسری شام تک اُن نشانات کو بدل کر رکھ دیتی۔ جہاں کل ٹیلہ تھا وہاں آج گڑھا ہے۔ جہاں گڑھا تھا، وہاں ریت کا ڈھیر ہے۔ پھر، وہاں بستیاں اور آبادیاں بھی قریب قریب نہ تھیں کہ مقامی لوگوں سے راستہ پوچھ لیا جائے۔ یہ تھے وہ حالات جن میں وہ سفر کرتے تھے۔ اور وہ بھی تاریک راتوں میں۔

اُن سے کہا گیا کہ تم جو ان صحراؤں میں، اندھیری راتوں میں سفر کرتے ہو اور کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ تم راستے کی تلاش میں مارے مارے پھرو یا راستہ پا لینے کے بعد پھر بھٹک جاؤ۔ تو ایسا کس طرح سے ہوتا ہے؟ وہ کون سے مستقل نشانات ہیں جن سے تم راہ نمائی حاصل کرتے ہو؟ اُن کا جواب صاف اور سیدھا تھا کہ ہم تاریک راتوں میں ستاروں سے راہ نمائی حاصل کرتے ہیں۔ یہ ایسے سچے راہبر ہیں کہ راستہ دکھانے میں نہ کبھی غلطی کرتے ہیں نہ دھوکا دیتے ہیں۔ قرنہا قرن سے یہ ہمارا تجربہ ہے اور نسلاً بعد نسلٍ اس کی شہادت ملتی چلی آ رہی ہے۔ ان کی راہ نمائی پر نہ زمانے کا اختلاف اثر انداز ہوتا ہے، نہ ملکوں کا بُعد اور تفاوت۔ یہ ہر زمانے اور ہر قوم کو یکساں راہ نمائی دیتے ہیں۔ ان کا شروع سے یہی انداز چلا آ رہا ہے۔ اور آج بھی ان کی یہی روش ہے۔

اس پر اُن سے کہا گیا کہ ذرا سوچو کہ جس خدا کی طرف سے ستاروں کو یہ صلاحیت حاصل ہوئی ہے کہ وہ اپنی راہ نمائی میں نہ غلطی کرتے اور نہ دھوکہ دیتے ہیں۔ اگر اُسی خدا کی طرف سے تمہیں بھی راہ نمائی ملے تو کیا

وہ راہ نمائی بھی ستاروں کی راہ نمائی کی طرح مستقل ، غیر متبدّل ، قابل اعتماد ، سہو و خطا سے مبرّا اور فریب دہی کے امکان سے بلند و بالا ہوگی یا نہیں ؟ یہ ہے وہ مقام جہاں سے سورۂ والنجم کی ابتداء ہوتی ہے ۔ یعنی وَالنَّجْمِ إِذَا هَوٰى (۵۳/۱) ۔ طلوع ہونے والا ستارہ ۔ جب وہ اپنا راستہ طے کرنے کے بعد غروب ہوتا ہے ۔ اس حقیقت کبریٰ پر شاہد ہے کہ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى (۵۳/۲) ۔ تمہارا یہ رفیق سفر جو تمہیں زندگی کے صحیح راستے کی طرف لے جانا چاہتا ہے ، نہ تو راستے کی تلاش میں مارا مارا پھرتا ہے اور نہ ہی راستہ پا جانے کے بعد بھٹک گیا ہے اس لئے کہ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى (۵۳/۳) ۔ یہ جو کچھ کہتا ہے اپنی طرف سے نہیں کہتا ۔ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحٰى (۵۳/۴) ۔ یہ صرف اس وحی کو بیان کرتا ہے جو خدا کی طرف سے اس کو دی جاتی ہے ۔ انسانی خیالات کی تو یہ کیفیت ہوتی ہے کہ وہ ہر آن بدلتے رہتے ہیں ۔

زماں زماں شکند آں چہ می تراشد عقل

جو باتیں ہم بچپن میں کرتے ہیں ، ذرا آگے بڑھ کر دیکھئے تو ان پر خود ہی بے اختیار ہنسی آ جاتی ہے ۔ جوانی کے جن فیصلوں کو ہم عقل و تدبیر اور دانش و بینش کا کمال سمجھتے ہیں ، پانچ سات برس کے بعد ، وہ چند نادانیوں سے زیادہ کچھ دکھائی نہیں دیتے ۔ اس کے بعد علم و تجربہ میں کچھ پختگی آنے لگتی ہے تو بڑھاپا آ جاتا ہے ، جس میں (قرآن کے الفاظ میں) عقل اوندھی ہو جاتی ہے ۔ یہ کیفیت تو عمر کی مختلف منزلوں میں ہوتی ہے ۔ ایک ہی منزل میں حالت یہ ہوتی ہے کہ صحت کے عالم میں خیالات اور قسم کے ہوتے ہیں ، بیماری کے زمانے میں اور قسم کے ۔ حالات مساعد ہوں تو

زاویۂ نگاہ اور قسم کا ہوتا ہے اور جب پریشانیاں گھیر لیں تو تمام نظریات و تصوّرات بدل جاتے ہیں۔ غصے کے عالم میں ہمارے خیالات اور قسم کے ہوتے ہیں اور سکون کی حالت میں اور قسم کے۔ یہ حالت تو افراد کی ہے۔ اگر قوموں کی زندگی پر نگاہ ڈالی جائے تو وہاں بھی یہی کیفیت دکھائی دیتی ہے۔ جن باتوں کو کوئی قوم سو سال پہلے علم و دانش کی معراج سمجھتی تھی آج وہ خود ان پر ہنستی ہے۔ لہٰذا جو شخص اپنے خیالات سے کوئی بات کہے گا وہ اس کی طبیعی کیفیات اور ذہنی اور قلبی میلانات سے متاثر اور اُس کے زمانے کے احوال و ظروف سے متّسم ہوگی۔ اس لئے وہ کبھی مستقل اقدار (نہ بدلنے والے قوانین) کا تعیّن نہیں کر سکے گا۔ یہ چیز صرف اُس سر چشمہ سے مل سکے گی جو زمان و مکان کے ہر قسم کے اثرات سے مبرّیٰ ہو، اور قلبی و ذہنی عواطف و میلانات کی رنگینی سے معرّا۔ اسے وحی کہتے ہیں۔

انہی حقائق کو قرآن نے دوسرے مقامات پر بھی بیان کیا ہے۔ ستاروں کی راہ نمائی کے متعلق سورۂ انعام میں ہے۔ وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوْمَ لِتَهْتَدُوْا بِهَا فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ (٦/٩٨)۔ اللہ وہ ہے جس نے تمہارے فائدے کے لئے ستاروں کو اس انداز سے بنایا کہ تم اُن سے زمین اور آسمان کے سفر کی تاریکیوں میں راہ نمائی حاصل کر سکو۔ سورۂ واقعہ میں کہا کہ فَلَاۤ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ۔ (٥٦/٧٥)۔ نہیں! بات یوں نہیں جس طرح تم اپنے ذہن میں خیال کئے ہو، بات کچھ اور ہے۔ اس کے لئے میں ستاروں کی گزر گاہوں (ان کے طلوع و غروب کے مواقع) کو شہادت میں پیش کرتا ہوں۔ وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ (٥٦/٧٦)۔ اور اگر تم

علم و بصیرت کی بارگاہ سے پوچھو تو وہ تمہیں بتائے گی کہ یہ شہادت کس قدر عظیم ہے۔ یہ شہادت کس امر کی ہے؟ اس امر کی کہ اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ کَرِیْمٌ ($\frac{56}{76}$)۔ یہ حقیقت ہر قسم کے شک و شبہ سے بالا ہے کہ یہ قرآن نوعِ انسانی کے لئے بڑا ہی نفع رساں اور عزّت بخش ہے۔ فِیْ کِتٰبٍ مَّکْنُوْنٍ ($\frac{56}{77}$)۔ اس کے حقائق غیر متبدّل ہیں۔ اور وہ خود بھی ایک محفوظ کتاب کے اندر ہے۔ اس لئے اس کے حروف و الفاظ میں بھی کوئی تغیّر و تبدّل نہیں ہو سکتا۔ حقائق کو دوسروں تک پہنچانے کا ذریعہ الفاظ ہی ہوتے ہیں۔ اگر الفاظ میں تبدیلی ہو جائے تو حقائق میں بھی تبدیلی ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ایک اور شرط بھی ہے اور وہ یہ کہ الفاظ کا صحیح مفہوم بھی اسی صورت میں سمجھ میں آسکتا ہے جب ان الفاظ کو خالی الذہن ہو کر سمجھا جائے۔ اگر انسان پہلے سے اپنے ذہن میں کوئی خاص خیالات اور تصوّرات لے کر قرآن کی طرف آئے تو قرآنی حقائق اپنی اصلی اور لا آمیزش شکل میں سامنے نہیں آسکیں گے۔ اس کے لئے تطہیرِ فکر و نظر نہایت ضروری ہے۔ لَا یَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ($\frac{56}{79}$)۔ اس کے حقائق کو صرف وہی پا سکتے ہیں جن کا قلب و دماغ غیر قرآنی تصوّرات سے پاک ہو۔ جن کا ادراک بے رنگ ہو۔

پھر، جس طرح ستاروں کی راہ نمائی تمام اقوامِ عالم اور جملہ ممالکِ دنیا کے لئے یکساں ہے اسی طرح، قرآن کی راہ نمائی بھی زمان و مکان کی حدود سے بے نیاز اور تمام نوعِ انسانی کے لئے یکساں ہے۔ اس لئے کہ یہ اس خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے جو پورے عالمِ انسانیت کا نشو و نما دینے والا ہے۔

تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ (٥٦/٨٠)۔ اس کے بعد قرآن کہتا ہے کہ أَفَبِهٰذَا الْحَدِيْثِ أَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ (٥٦/٨١)۔ ذرا سوچو کہ تم اس قسم کے محکم، غیر متبدل، یقینی۔ ستاروں کی طرح واضح اور روشن ضابطۂ حیات کو جھٹلاتے ہو؟ اس سے ادھر آدھر پھسلنا چاہتے ہو۔ اس میں کمی بیشی کرکے مداہنت اور مفاہمت (Compromise) کی راہیں تراشنے کی کوشش کرتے ہو؟ تم چاہتے ہو کہ اس میں تمہاری مرضی کے مطابق تھوڑا سا رد و بدل کر دیا جائے! بتاؤ کہ اگر ستارے، لوگوں کی خواہش کے مطابق اپنے راستے بدلنے لگ جائیں تو راستہ چلنے والوں کا کیا حشر ہو؟

اور ایسی روش تم اختیار کیوں کرتے ہو؟ محض اس لئے کہ تم نے مذہبی پیشوائیت کو اپنے لئے ذریعۂ معاش (روٹی کا آسرا) بنا رکھا ہے اور قرآنی مسلک اختیار کرنے سے وہ چیز چھن جاتی ہے؟ وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ أَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ (٥٦/٨٢)۔ ذرا سوچو کہ کس قدر پست مقصد کی خاطر تم اتنی بلند حقیقت کو جھٹلاتے اور اس مداہنت کو اختیار کرتے ہو؟

اسی طرح، سورۂ تکویر میں ہے فَلَآ أُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ۔ میں یہ باتیں یونہی نہیں بیان کر رہا۔ اس حقیقت پر سارا نظامِ کائنات شاہد ہے۔ اس پر شاہد ہیں وہ ستارے، جو دبے پاؤں آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتے رہتے ہیں۔ الْجَوَارِ الْكُنَّسِ۔ اور وہ تیز خرام ستارے جو اپنی اپنی منزل طے کرکے چھپ جاتے ہیں۔ وَالَّيْلِ إِذَا عَسْعَسَ۔ اور رات جو خاموشی سے آتی ہے اور خاموشی سے چلی جاتی ہے۔ وَالصُّبْحِ إِذَا تَنَفَّسَ (٨١/١٨—١٥)۔ اور صبح، جب وہ حیاتِ نو کا پیغام لے کر نمودار ہوتی ہے۔ یہ سب مظاہر

کائنات اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِیْمٍ - جو ہماری وحی کی بات تم سے کہہ رہا ہے وہ ہمارا بھیجا ہوا پیغام بر ہے اور نہایت معزز پیغام بر - ذِیْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ مَكِیْنٍ (۸۱ ۱۹-۲۰) - اسے اس خدا کی طرف سے بڑی قوّتیں عطا ہوئی ہیں جو کائنات کے مرکزی کنٹرول کا مالک ہے -

بہر حال ، یہ ہے وہ انداز جس سے قرآن نے اس صحرا نشین قوم کو اتنی بلند اور ایسی لطیف حقیقت سے آگاہ کیا - اگر تم نے دیکھنا ہو کہ ستاروں کی انہی گزرگاہوں سے دورِ حاضر کے بلند پایہ سائنسدان کس طرح ان حقائق تک پہنچتے ہیں تو (کم از کم) سر جیمز جینس کی مشہور کتاب (The Mysterious Universe) یا (The Starry Way of Heavens) کو دیکھو اور غور کرو کہ عصرِ حاضر کا یہ سب سے بڑا ماہر فلکیات ، اس محیر العقول کا رگۂ سماوی کے مطالعہ اور مشاہدہ کے بعد ، خدا کے بلند و بالا قانون کی عظمت و جلال کے سامنے کس طرح سجدہ ریز ہوتا ہے - وہ ان اجرام فلکی کی نقل و حرکت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر علیٰ وجہِ الْبصیرت پکار اٹھتا ہے کہ قانونِ خداوندی کے محکم اور غیر متبدّل ہونے پر ستاروں کی شہادت فی الْواقعہ ایک عظیم شہادت ہے - وَاِنَّهٗ لَوْ تَعْلَمُوْنَ لَقَسَمٌ عَظِیْمٌ -

اب سلیم ! آگے بڑھو - ہمارے ہاں معاشرے کی جو حالت ہو رہی ہے وہ سب پر عیاں ہے - لوگوں کے دلوں میں قانون کا احترام بہت کم رہ گیا ہے - قانون کی کتابوں کو دیکھو تو وہ اعلیٰ درجہ کے قوانین سے بھری پڑی ہیں لیکن افراد معاشرے کو دیکھو تو قانون پر عمل بہت کم ہو رہا ہے - چوری

نہ کرو ، جھوٹ نہ بولو ، کسی کو فریب نہ دو ، کسی سے ”چار سو بیس“ نہ کرو ، بلیک مارکٹ سے مجتنب رہو ، وغیرہ وغیرہ ، تمام قوانین اور ہدایات موجود ہیں لیکن ان پر عمل کوئی نہیں کرتا ۔ یہی نہیں کہ ان پر عمل نہیں ہوتا ۔ حالت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ جو شخص دیانتدار اور صداقت پسند رہنا چاہے اسے قدم قدم پر مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے ۔ تم اس صورت حالات کا تذکرہ کسی ذمہ دار اہل حل و عقد سے کرو وہ فوراً کہہ دے گا کہ کیا کیا جائے ؟ قانون تو موجود ہے ، لیکن اس کے نافذ کرنے کی مشینری بہت کمزور اور ناقص ہو چکی ہے ۔ اس لئے معاشرے میں ہر طرف فساد ہی فساد برپا ہے ۔

اس سے ظاہر ہے کہ صرف اچھے قانون کا ہونا کافی نہیں ۔ اس قانون کے پیچھے قوّتِ نافذہ کا ہونا بھی از بس ناگزیر ہے ۔ اگر قوّتِ نافذہ کمزور ہو تو قانون کوئی نتیجہ پیدا نہیں کرتا ۔

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد

اپنے معاشرے کے برعکس ، خارجی کائنات پر غور کرو اور دیکھو کہ وہاں فطری قوانین کس حسن و خوبی سے کارفرما ہیں ۔ فلک کی پہنائیوں میں تیرنے والے ان عظیم کُرّوں کو دیکھو ۔ ہر ایک اپنے اپنے دائرے میں کس نظم و ضبط کے ساتھ مصروف سعی و عمل ہے ۔ ماہرینِ افلاک کا کہنا ہے کہ کہکشاں ، جو ہمیں محض گردِ سرمریں یا جوئے شیر نظر آتی ہے ، سیاروں اور ستاروں (ثوابت و سیار) کی ایک عظیم کائنات ہے جس میں ایک کُرّہ ، نہ صرف سورج بلکہ پورے نظامِ شمسی سے بھی اس قدر بڑا ہے جیسے تِل کے سامنے پہاڑ ۔ یہ تمام محیر العقول کارگہ اور اس کی یہ ہوش ربا مشینری ، روزِ اوّل سے آج تک

غیر مرئی اور نا محسوس باہمی کشش کے ذریعے ، اس حدود نا آشنا فضا میں لاکھوں میل فی سیکنڈ کی رفتار سے ، مصروفِ حرکت ہے لیکن کیا مجال جو اس میں کبھی ذرا سا بھی ٹکراؤ پیدا ہو جائے ! اس ''کارگۂ شیشہ گراں'' کی حالت یہ ہے کہ اگر ان کروڑھا کروڑ اجرام فلکی میں سے کسی ایک میں ، ایک ذرّے کے برابر بھی کشش میں کمی ، یا اس کی رفتار میں تیزی یا سستی واقع ہو جائے تو یہ سارے کا سارا نظام ایک لمحہ میں ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے۔

آسمانوں سے نیچے اُتر کر اپنی زمین کی طرف آؤ تو قانونِ خداوندی کی کارفرمائی اور نتیجہ خیزی نگۂ بصیرت کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتی ہے ۔ ایک ہی قطعۂ زمین میں برابر برابر ببول اور آم کے بیج ڈال دو ۔ وہی مٹی ہے وہی پانی ، وہی ہوا ہے وہی روشنی ، وہی برودت ہے وہی حرارت ۔ لیکن آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ببول کے تخم سے آم کا پیڑ اُگ آیا ہو اور آم کے درخت میں ببول کے کانٹے لگ گئے ہوں ۔ تم غور کرو سلیم ! کہ جس ہستی نے کائنات کے لئے ایسے غیر متبدّل قوانین متعیّن کئے ہیں وہ کس قدر صاحبِ اقتدار و جبروت ہے کہ ہر قانون اپنا ٹھیک ٹھیک نتیجہ مرتّب کئے جا رہا ہے ۔ اب تم سوچو کہ جب اُسی خدا کے قوانین (جو وحی کی رُو سے ملیں) انسانی دنیا میں بھی کارفرما ہو جائیں تو وہ بھی کس طرح اپنے صحیح صحیح نتائج بحسن و خوبی پیدا کرتے چلے جائیں گے ؟ اس حقیقت کے اظہار کے لئے سورۂ والنّجم میں وحی کے بیان کے بعد کہا کہ عَلَّمَہٗ شَدِیْدُ الْقُوٰی (۵۳/۵) ۔ نبی کو اس وحی کا علم اس ہستی نے دیا ہے جو بڑی زبردست قوّتوں کی مالک ہے ۔ وہ ذُو الْقُوَّۃِ الْمَتِیْنِ (۵۱/۵۸) ہے ۔ لٰہذا ہو نہیں سکتا کہ جو معاشرہ اس کے قوانین کے مطابق چلے اسے ان قوانین کے

نتائج وثمرات نصیب نہ ہوں۔ وہ ان نتائج سے ضرور بہرہ یاب ہوگا۔ لَا یُخْلِفُ اللّٰہُ الْمِیْعَادَ (۳۹/۲۰)۔ اللہ کے وعدے ضرور پورے ہو کر رہا کرتے ہیں۔

—————:o:—————

اب اور آگے چلو۔

کائنات کی مشینری کا ہر پُرزہ اس لئے مصروفِ سرگردانی ہے کہ ہر شے کی مضمر صلاحیتوں (Potentialities) کی پوری پوری نشو و نما (Development) ہو سکے۔ ابرو باد و مہ و خورشید، سب اس لئے مصروف کار ہیں کہ رائی کا ایک ننّھا سا دانہ پودا بن کر سات سات سو دانے پیدا کرے۔ یہ اس دانے کی تقدیر یا (Destiny) ہے۔ یہ اس کی زندگی کی آخری منزل ہے۔ یہ اس کی مضمر صلاحیتوں کی تکمیل کا آخری نقطہ ہے۔ لہٰذا خدا کا کائناتی قانون اس حسن و خوبی سے اس لئے سرگرم عمل ہے کہ ہر شے کی ربُوبیّت (پرورش، نشو و نما) ہوتی چلی جائے۔ وہ اپنے نقطۂ آخریں تک جا پہنچے۔ اس کی صلاحیتوں کی تکمیل ہو جائے۔

لیکن اشیائے کائنات کی نشو و نما، قانون ارتقاء (Evolution) کے ماتحت ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شے، ہر آن، سلسلۂ ارتقاء کی ایک نئی منزل (Stage) میں داخل ہوتی ہے جہاں اس کی نشو و نما کے تقاضے، اس کی سابقہ منزل سے مختلف ہوتے ہیں۔ لہٰذا خدا کا قانونِ ربوبیّت ایسا ہے کہ کوئی شے جس حالت میں ہو، وہ اس کے مطابق سامان نشو و نما بہم پہنچاتا ہے۔ یَسْئَلُہٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے، اپنی نشو و ء کے لئے سب خدا (کی ربوبیّت)

کا محتاج ہے۔ اور ان میں سے ہر چیز کی حالت یہ ہے کہ کُلَّ یَوۡمٍ هُوَ فِیۡ شَاۡنٍ (۵۵) ۲۹۔ وہ ہر آن ، ایک نیا انداز لئے ہوتی ہے جس میں اس کی پرورش کے تقاضے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ اور یہ اس کے قانون ربوبیّت کا کمال ہے کہ جو شے جس حالت میں ہو وہ اسی کے مطابق اس کی نشو و نما کا سامان عطا کر دیتا ہے۔ بچّے کی پیدائش کے ساتھ ہی ماں کی چھاتوں سے دودھ کے چشمے رواں ہو جاتے ہیں۔ یہ دودھ شروع میں بہت پتلا ہوتا ہے۔ جوں جوں بچّے کو زیادہ غذا (Nourishment) کی ضرورت ہوتی ہے ، دودھ میں غذا کے اجزا زیادہ ہو جاتے ہیں اور پانی کی مقدار کم۔ اس کے ساتھ ہی بچّے کے معدے میں ہضم کی قوّت بھی بڑھتی جاتی ہے تاکہ وہ ثقیل دودھ کو جزو بدن بنا سکے۔ پھر ، جب وہ خارجی غذا ہضم کرنے کے قابل ہو جاتا ہے تو اسے دانت دئے جاتے ہیں اور دودھ کی نہریں خشک ہو جاتی ہیں۔ وقس علیٰ ذٰلک۔ ہر شے کو اس کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق سامان نشو و نما ملتا چلا جاتا ہے۔

جس طرح طبیعی دنیا میں نشو و نما کے تقاضے بدلتے رہتے ہیں اسی طرح انسانیت کی دنیا میں بھی نشو و ارتقاء کے تقاضوں میں تغیّر و تبدّل ہوتا رہتا ہے۔ اگر آج افریقہ کے حبشی اپنے جوہر انسانیت کی نشو و نما کے لئے نظامِ خداوندی کو اختیار کریں تو ان کی نشو و نما کے تقاضے اور ہوں گے۔ اور اگر یورپ کی متمدن اقوام بھی کچھ چاہیں تو اُن کے تقاضے اُن سے مختلف ہوں گے۔ للہذا ، انسانوں کی دنیا میں خدا کا قانون بھی ایسا ہونا چاہئے جو انسانی ذات کے مختلف جوہروں کی پرورش اور بالیدگی زمانے کے بدلے ہوئے تقاضوں کے مطابق کرتا چلا جائے۔ اس کے لئے فرمایا کہ وحی کا قانون جو اپنی نتیجہ خیزی میں حتمی اور یقینی واقع ہوا ہے ، اُس خدا کا قانون ہے جو

ذُوْ مِرَّۃٍ (۵۳/۶) ہے۔ یعنی زندگی کی تمام گزر گاہوں کا مالک۔ زمان اور مکان ، دونوں اعتبار سے انسانی زندگی کے تمام بدلتے ہوئے تقاضوں سے باخبر اور ان کی نشو و نما کا پورا پورا انتظام کرنے والا۔ رب العالمین۔

—— : o : ——

یہاں تک سلیم ! گفتگو وحی یا اس خدا کے متعلق ہو رہی تھی جو وحی کو عطا کرتا ہے۔ اب اس گراں مایہ ہستی کا تذکرہ جلیلہ آتا ہے جس کا منوّر و مقدّس سینہ وحی کا مہبط بنتا ہے۔ یعنی خود نبیؐ کا تذکرہ۔ لہٰذا یہاں سے مقامِ نبوّت یا مقامِ محمدیؐ کا آغاز ہوتا ہے۔ اسے سمجھنے کے لئے عزیزم ! پہلے سے بھی زیادہ ذوق و انہماک کی ضرورت ہے۔

آج کل ہم (مسلمانوں) میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ نبی کا کام صرف اس قدر ہے کہ وہ خدا کی طرف سے حاصل کردہ وحی کو دوسروں تک پہنچا دے۔ اور بس۔ یعنی جب وہ پیغامِ خداوندی کو دوسروں تک پہنچا دیتا ہے تو اس کے بعد اس کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی۔ اُن کے خیال کے مطابق یوں سمجھئے کہ نبی کی حیثیت (معاذ اللہ) ایک ریڈیو سیٹ کی سی ہوتی ہے۔ جو کچھ براڈ کاسٹنگ ہاؤس سے براڈ کاسٹ (نشر) ہوتا ہے یہ سیٹ اسے اخذ کر لیتا ہے اور بعینہٖ اسی طرح دوسروں تک پہنچا دیتا ہے۔ جب براڈ کاسٹنگ ہاؤس سے کچھ نشر نہیں ہوتا تو ریڈیو محض ایک لکڑی کا ڈبہ رہ جاتا ہے۔

اس کے علاوہ ، بعض لوگوں کو ایک اور غلطی بھی لگتی ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ وحی چونکہ اکتسابی چیز نہیں بلکہ وہبی ہے۔ یعنی وحی میں نبی کے اپنے کسب و ہنر کا کوئی دخل نہیں ہوتا بلکہ یہ علم اسے خدا

کی طرف سے ملتا ہے ۔ اس لئے نبی میں کسی ذاتی صلاحیت اور قابلیت کی ضرورت نہیں ہوتی ۔ خدا نے اپنی وحی کسی نہ کسی کے ذریعے انسانوں تک پہنچانی ہوتی ہے اس لئے اس مقصد کے لئے جو انسان بھی اس کے سامنے آ جائے وہ اس کے ذریعے وحی کو انسانوں تک پہنچا دیتا ہے ۔ یہ ہے وہ خیال جس کا مظہر وہ شعر ہے جو ہمارے ہاں بڑا مقبول ہے اور جسے تم نے بھی کئی بار گنگنایا ہوگا ۔ یعنی ؎

خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھئے احوال
کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے

یعنی اللہ تعالیٰ کے پروگرام کے مطابق وہ وقت آ چکا تھا کہ خدا کی وحی بنی اسرائیل تک پہنچا دی جاتی ۔ اُس وقت ”اتفاق سے“ حضرت موسیٰؑ آگ کی تلاش میں اُدھر آ نکلے تو اللہ میاں نے تاجِ نبوّت ان کے سر پر رکھ دیا ۔ اگر اُس وقت اُن کی جگہ کوئی اور وہاں جا پہنچتا تو یہی پیمبری اُسے مل جاتی !

یہ خیال بھی بنیادی طور پر غلط ہے اور مقامِ نبوّت سے یکسر بے خبری کا نتیجہ ۔ اس کی وضاحت کے لئے خود حضرت موسیٰؑ کی مثال سامنے لاؤ ۔ (جن کے متعلق نہایت بے تکلفی سے کہہ دیا جاتا ہے کہ آگ لینے کو گئے اور پیمبری مل گئی !) سنو کہ اللہ تعالیٰ ان کے منصب نبوّت پر سرفراز ہونے کے سلسلہ میں کیا کہتے ہیں ۔ جب حضرت موسیٰؑ کو وحی سے نوازا گیا (اور اُن سے فرعون کے خلاف جس مہم پر جانے کے لئے کہا گیا تھا ۔ اس کے لئے اُن کی طرف سے پیش کردہ متعدد درخواستیں منظور کر لی گئیں) تو حضرت موسیٰؑ کی پیشانی (فطری طور پر) احساس سپاس گزاری سے بدرگاہ رب الْعزّت جھک گئی ۔ اُس وقت آپ سے کہا گیا کہ ”اے موسیٰ ! تم نے

اسی کو ہمارا احسان سمجھا اور اس کے لئے جذباتِ تشکّر تمہارے آبگینۂ قلب سے اُبھر آئے۔ تمہیں معلوم نہیں کہ یہ سلسلۂ احسانات کب سے شروع ہے؟ اس کے لئے تمہیں بہت پیچھے جانا ہوگا۔ یہ سلسلہ تو اسی دن سے شروع ہو گیا تھا جب تم پیدا ہوئے تھے۔ وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً أُخْرَىٰ (۲۰/۳۷)۔ جب ہم نے تمہاری ماں کی طرف حکم بھیجا تھا کہ تمہیں ایک صندوق میں لٹا کر دریا میں بہا دے۔ اس نے اس حکم کی تعمیل کی اور تمہارا صندوق فرعون کے محلات میں جا پہنچا۔ اس طرح ہم نے اس کا انتظام کر دیا کہ تمہاری پرورش فرعون کے محلات میں ہو۔ تم نے بڑے ہو کر (نبی بن کر) فرعون سے ٹکر لینی تھی۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ تم رموزِ سلطنت اور اسرارِ حکومت سے واقف ہوتے۔ لیکن تم ایک محکوم قوم (بنی اسرائیل) کے فرد تھے۔ اس لئے تمہارے لئے ان اسرار و رموز تک بار پانا ناممکن تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ہم نے یہ تدبیر کی کہ تمہاری پرورش و تربیت خود محلاتِ شاہی میں ہو۔ لیکن تم نے ساری عمر شہزادگی یا شہنشاہی کی زندگی بسر نہیں کرنی تھی۔ تمہاری پیدائش سے مقصود کچھ اور تھا۔ تم نے ایک دن بنی اسرائیل کو لے کر وادیِ سینا کے جنگلوں اور بیابانوں میں بھی جانا تھا اور وہاں اُن کی تربیت کرنی تھی۔ اس لئے یہ بھی ضروری تھا کہ تم صحرائی اور بیابانی زندگی سے بھی واقف ہو جاؤ۔ اس مقصد کے لئے ایسی تدبیر کی گئی کہ تم شاہی محلات کو چھوڑ کر مدین کی طرف بھاگ نکلو۔ فَلَبِثْتَ سِنِينَ فِي أَهْلِ مَدْيَنَ (۲۰/۴۰)۔ سو تم کئی برس اہلِ مدین میں رہے۔

اس طرح جب تم ان تمام مختلف مراحل سے گزرے تو ثُمَّ جِئْتَ عَلَىٰ

قَدَرٍ یّٰمُوْسٰی (۲۰/۴۰)۔ تب کہیں جا کر تم ہمارے پیمانے پر پورے اترے۔ وَاصْطَنَعْتُکَ لِنَفْسِیْ (۲۰/۴۱)۔ اس طرح ہم نے تمہیں اپنے ایک مقصد کے لئے بہ کمالِ حسن و خوبی تیار کیا اور جب تم اس طرح اس مقصدِ بلند کے قابل ہو گئے تو تمہیں وحی عطا ہوئی۔ یہ نہیں کہ تم یوں ہی آگ لینے کو اُدھر آ نکلے اور ہم نے نبوّت کا تاج تمہارے سر پر رکھ دیا۔

اس سے ظاہر ہے کہ ایک ہونے والے نبی کو پہلے ہی دن سے منصبِ نبوّت کے لئے تیار کیا جاتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اسے خود اس کا علم نہیں ہوتا۔ وَمَا کُنْتَ تَدْرِیْ مَا الْکِتَابُ وَلَا الْاِیْمَانُ (۴۲/۵۲)۔ اس لئے کہ نبی کے اپنے کسب و ہنر کو اس میں کچھ دخل نہیں ہوتا۔ لیکن نبی کے سینے کو ایسی گراں بہا متاع کا امین بننے کے لئے خاص طور پر تیار کیا جاتا ہے۔ اس مقصدِ عظیم کے لئے نبی اکرمؐ کی ذاتِ اقداس میں کیا کیا خصوصیتیں پیدا ہوئی تھیں، سورۂ والنّجم کی اگلی آیات میں ان کا ذکر ہے۔ اس کے لئے قرآن نے سب سے پہلے ایک لفظ استعمال کیا ہے۔ فَاسْتَوٰی (۵۳/۶)۔ دیکھنے کو تو یہ ایک چھوٹا سا لفظ ہے لیکن معنویت کے اعتبار سے اس قدر جامع ہے کہ انسانی ذات کے معراجِ کبریٰ کی ساری تابانیاں اس کے اندر مرتکز ہوگئی ہیں۔ اس کے مفہوم کے لئے یوں سمجھو جیسے دورِ حاضر کی اصطلاح میں کہتے ہیں (Balanced Personality)۔ وہ ذات جس میں انسانیت کی مضمر صلاحیتیں مکمل طور پر نشو و نما پا کر، پورے پورے اعتدال اور حسنِ توازن و تناسب کے ساتھ جمع ہوں۔ جس میں انسانی قوتیں اور جوہر انتہائی اعتدال کے ساتھ جلوہ فرما ہوں۔ سلیم! تم سوچو کہ ارتقائے شرفِ انسانیت میں اس سے بڑا مقام اور کونسا ہو سکتا ہے۔ یہ ہے وہ پہلی خصوصیتِ کبریٰ

جس سے مقام محمدی‌ص کی ابتداء ہوتی ہے۔ یعنی حسنِ سیرت کی کمالِ زیبائی و رعنائی۔ مختلف صفات انسانیہ کا پورا پورا اعتدال۔ خدا نے خود اپنے متعلق ”اسماء الحسنیٰ“ کہا ہے تو اس کا بھی یہی مطلب ہے۔ یعنی وہ ذات جس میں تمام صفات (اسماء) اپنی مکمل صورت میں بایں انداز جمع ہوں کہ ان میں پورا پورا تناسب پایا جائے۔ تناسب (Proportion) کا اعتدال ہی درحقیقت حسن ہے۔ حسنِ عمل بھی وہی ہے جس میں صحیح صحیح تناسب و اعتدال ہو۔ صحیح اعمال وہ ہیں جن میں صفاتِ خداوندی کی جھلک ہو۔ لیکن ان میں اعتدال کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ اسی لئے قرآن میں ہے۔ وَلِلّٰهِ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا۔ تمام صفات، کامل اعتدال کے ساتھ، حسن کارانہ انداز سے خدا کی ذات میں جمع ہیں۔ آسے انہی صفات کے ساتھ پکارو۔ یعنی اپنی ذات میں انہی صفات کو آجاگر کرو۔ لیکن پورے اعتدال و تناسب کے ساتھ وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْ أَسْمَائِهٖ (۷/۱۸۰)۔ اور جو لوگ اس کی صفات میں (افراط و تفریط سے) کسی ایک طرف نکل جاتے ہیں۔ ان سے کوئی واسطہ نہ رکھو۔ تم نے دیکھا کہ یہاں اعتدال پر کس قدر زور دیا گیا ہے۔ یعنی جو کسی ایک صفت خداوندی میں اعتدال کا دامن چھوڑ کر افراط اختیار کر لیتے ہیں، وہ صحیح راستے پر نہیں۔ یہاں ”الحاد فی الاسما“ کہا ہے۔ سورۂ حم سجدہ میں الحاد فِی الآیات۔ یعنی آیاتِ خداوندی میں کسی ایک طرف نکل جانے کو باطل کی راہ کہا ہے (۴۱/۴۱)۔ مومن وہ ہیں جو صراطِ مستقیم پر چلتے ہیں۔ یعنی توازن بدوش راہ پر جس میں افراط ہو نہ تفریط۔ یہی لوگ منعم علیہ ہیں۔ یعنی جنہیں زندگی کی تمام خوشگواریاں نصیب ہیں۔ اسی درخشندہ فہرست کا سرعنوان، مقامِ محمدی‌ص ہے جسے قرآن نے قاستوی سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی صفاتِ خداوندی کو (علی

حد بشریت) پورے پورے اعتدال کے ساتھ لئے ہوئے۔

یہ ہوا سیرت کا کمال۔ اب آگے بڑھو۔ ارشاد ہے، وَهُوَ بِالْأُفُقِ الْأَعْلٰى (۵۳/۷)۔ اُفق کے معنی (Horizon) یا زمین کے آخری کنارے کے ہیں۔ اس میں وسعت کی انتہا آ جاتی ہے، اور جب اس کے ساتھ "اعلیٰ" کا لفظ آ جائے تو اس میں وسعتیں اور بلندیاں دونوں شامل ہو جاتی ہیں۔ تم سطحِ زمین پر کھڑے ہو تو تمہاری اُفق (وسعت نگاہ) بہت قریب ہوگی۔ کسی اونچی عمارت پر کھڑے ہو کر دیکھو تو تمہاری اُفق کا دائرہ وسیع ہو جائے گا۔ اور جب تم کسی بلند ترین (اعلیٰ) مقام پر کھڑے ہو تو وسعت اپنی انتہا تک پہنچ جائے گی۔ لہٰذا بِالْأُفُقِ الْأَعْلٰى سے مراد یہ ہے کہ نبی کا علم اپنی وسعتوں اور بلندیوں میں انتہا تک پہنچا ہوا ہوتا ہے۔

ہمارے ہاں عام طور پر نبی کے معنی "پیش گوئیاں کرنے والا یا خبریں دینے والا کئے جاتے ہیں (یعنی اسے نباء سے مشتق مانا جاتا ہے)۔ نبوّت کا یہ تصوّر درحقیقت یہودیوں کے ہاں سے آیا ہے۔ اُن کے ہاں ہیکل (معبد) میں ایک بلند منصب کا حامل نبی کہلاتا تھا جس کا کام لوگوں کو آنے والے واقعات کے متعلق خبریں دینا (یا اُن کی قسمت اور تقدیر بتانا) تھا۔ چنانچہ یہودی لٹریچر میں جن نبیوں کے قصّے درج ہیں، وہ بالعموم ہیکل کے انہی منصب داروں سے متعلق ہیں۔ انگریزی میں اس لفظ (نبی) کا ترجمہ (Prophet) ہوا۔ یعنی (Prophecies) پیش گوئیاں کرنے والا۔ قرآن کی رُو سے نبی کے معنی اس سے مختلف ہیں۔ یہ لفظ نبوۃ سے مشتق ہے جس کے معنی بلندی کے ہیں۔ لہٰذا نبی کے معنی ہیں جو بلند مقام پر کھڑا ہو۔ هُوَ بِالْأُفُقِ الْأَعْلٰى یا اُفُقِ الْمُبِينِ (۸۱/۲۳)۔ ان معانی کی وضاحت خود نبی اکرمؐ نے کر کے دکھا دی۔ جب آپؐ کو حکم ملا کہ خدا کا پیغام اپنے لوگوں

تک پہنچائیں تو آپص مکّہ کے باہر ایک چھوٹی سی پہاڑی پر چڑھ گئے اور لوگوں کو (بالخصوص اپنے اہلِ خاندان کو) بلایا ۔ جب وہ جمع ہو گئے تو آپ نے ان سے کہا کہ اگر میں یہ کہوں کہ اس پہاڑی کی دوسری طرف ایک لشکر جرار ہے جو تم پر چڑھائی کرنے کے لئے بڑھے چلا آ رہا ہے تو تم میری بات کو سچ مانوگے یا نہیں ۔ انہوں نے کہا کہ ہم اسے ضرور سچ مانیں گے ۔ آپ نے پوچھا کہ تم اسے سچ کیوں مانو گے ؟ انہوں نے کہا کہ ایک تو اس لئے کہ آپ نے کبھی جھوٹ نہیں بولا ۔ اور ....

آگے بڑھنے سے پیشتر سلیم ! ذرا اس ٹکڑے پر پھر غور کرو کہ انہوں نے کہا کہ آپ نے کبھی جھوٹ نہیں بولا ۔ تم نے دیکھا کہ ایک بننے والے نبی کی زندگی ، نبوّت سے پہلے بھی کس قسم کی ہوتی ہے ؟ اس قسم کی کہ وہ اپنی قوم میں صادق اور امین مشہور ہوتا ہے ۔ اس کی زندگی ایک پاکباز اور دیانتدار انسان کی زندگی ہوتی ہے ۔ ایسی پاکباز اور دیانتدارانہ زندگی کہ وہ اسے اپنے دعوے کی صداقت کے لئے بطور شہادت پیش کرتا ہے ۔ چنانچہ جب نبی اکرمص نے نبوّت کا دعویٰ کیا تو آپ کی قوم نے کہا کہ آپ کوئی معجزہ دکھائیے تاکہ ہم یقین کر لیں کہ آپ واقعی خدا کے رسول ہیں ۔ آپ نے فرمایا کہ فَقَدْ لَبِثْتُ فِیْکُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۝ (۱۰/۱٦) ۔ میں تم میں کوئی اجنبی نہیں ہوں ۔ میں کہیں باہر سے نہیں آیا کہ تم مجھے جانتے نہ ہو ۔ میں نے اس دعوے سے قبل ساری عمر تم میں بسر کی ہے ۔ کیا تم اس سے اندازہ نہیں لگا سکتے کہ میں سچا ہوں یا جھوٹا ؟ اگر تم ذرا بھی عقل و فکر سے کام لو تو یہ حقیقت تم پر واضح ہو جائے کہ جس شخص نے اپنی ساری عمر صداقت اور دیانت سے گزاری ہو ، کس طرح

ممکن ھے کہ وہ ایک ھی رات میں یوں بدل جائے کہ وہ اتنے بڑے جھوٹ اور فریب پر اُتر آئے ؟ لہٰذا میری گزشتہ زندگی میرے دعویٰ کی صداقت پر دلیل ھے ۔ آفتاب آمد دلیلِ آفتاب ۔

ھاں ! تو ان لوگوں نے کہا کہ ھم آپ کی بات کا اس لئے یقین کر لیں گے کہ آپ نے کبھی جھوٹ نہیں بولا اور دوسرے اس لئے کہ آپ اُس مقام پر کھڑے ھیں جہاں سے آپ پہاڑی کے اُس طرف بھی دیکھ سکتے ھیں اور اس طرف بھی ۔ ھم اُس جگہ ھیں جہاں سے ھم اُس طرف دیکھ سکنے کے قابل نہیں ۔

آپ نے فرمایا کہ میں یہی بات تم سے کہنا چاھتا تھا ۔ مجھے خدا نے علم کی اُس بلندی پر فائز کیا ھے جہاں سے میں اُس دنیا کو بھی دیکھ سکتا ھوں جہاں سے حقائق کائنات اُبھرتے ھیں ۔ اور اس دنیا کو بھی جہاں یہ منطبق (Apply) ھوتے ھیں ۔ اسے مقام نبوت یا وحی خداوندی کہتے ھیں ۔

یہی ھے سلیم ! وہ اُفُقِ الْاَعْلٰی جس پر نبی فائز ھوتا ھے ۔ جہاں سے وہ اُس دنیا کو بھی دیکھتا ھے جو دوسرے انسانوں کی نگاھوں ، بلکہ قیاس و خیال و گمان و وھم تک سے اوجھل ھے ۔ اور اس دنیا کو بھی جہاں انسان بستے ھیں ۔ وہ علم کی ان بلندیوں پر ھوتا ھے ۔

——: o :——

اب اگلی آیت کی طرف آؤ ۔ تم دنیا کے بڑے بڑے فلاسفرز (مفکّرین) کی زندگی کو دیکھو ۔ بالعموم یہ نظر آئے گا کہ اُن کے افکار (Thoughts) بہت بلند ھوں گے ۔ وہ کائنات کے عظیم حقائق سے بحث کریں گے ۔ لیکن ان حقائق کی جھلک اُن کی اپنی سیرت و کردار میں بہت کم دکھائی دے گی ۔ یعنی اُن کی فکر ، اُن کی عقل (Intellect) کی بلندی ، اور اُن

کی عملی زندگی میں بہت بُعد ہوگا۔ لیکن نبی کی یہ کیفیت نہیں ہوتی۔ وہ علم کے آفق اعلیٰ پر فائز ہونے کے ساتھ عملاً بھی حقائقِ کائنات سے بہت قریب ہوتا ہے۔ ثُمَّ دَنَا (٥٣/٨)۔ ان حقائق میں اور اس کی اپنی زندگی میں قطعاً بُعد نہیں ہوتا۔

زندگی کو ان حقائق سے ہم آہنگ کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ان حقائق کا صرف فکری اور نظری طور پر ہی ادراک نہیں کرتا، بلکہ وہ ان کی گہرائیوں میں ڈوب جاتا ہے۔ فَتَدَلّٰى (٥٣/٨)۔ وہ ضمیرِ کائنات کے عمق (Depths) تک جا پہنچتا ہے۔

جوڈ (Joad) نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اگر کسی انسان میں علم کی وسعت ہو تو وہ مفکر (یعنی فلاسفر) ہوتا ہے اور اگر اس میں جذبات کی گہرائی ہو تو وہ تخلیقی نابغہ (Creative Genius) ہوتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ نبی کی ذات میں علم کی بلندیاں، حقائق کی وسعتیں اور تخلیقی جذبات کی گہرائیاں اپنے انتہائی اعتدال کے ساتھ یک جا جمع ہوتی ہیں۔ ان خصوصیات کے بعد وہ سینہ وحی کے علم کا مہبط بنتا ہے*۔

یہ ہے سلیم! علم و جذبات و کردار کے اعتبار سے مقامِ محمدیؐ کی ایک جھلک، جو قرآن کے ان درخشندہ موتیوں میں اس طرح جھلمل جھلمل کرتی دکھائی دیتی ہے۔

---

* وحی کے اتباع سے ایک مرد مومن میں بھی علم و حقائق کی وسعتیں اور گہرائیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ لیکن اس سے وہ وحی کا حامل نہیں بن سکتا۔ وحی میں نبی کے علاوہ اور کوئی شریک نہیں ہوتا۔

اب یہ دیکھو کہ اس قدر عظیم علم (وحی) پانے کے بعد نبی کا فریضہ کیا قرار پاتا ھے ؟ اس کا منصب کیا ھوتا ھے ؟ یہیں سے یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ نبی محض (معاذ اللہ) ایک آلۂ ابلاغ (پیغام پہنچانے والا ریڈیو سیٹ) نہیں ھوتا ۔ اس کا مشن اس سے آگے کچھ اور بھی ھوتا ھے ۔

تم ، علامہ اقبال(رح) کے مجموعۂ خطبات (Lectures) سے واقف ھو ۔ اُنہوں نے اپنے پانچویں لیکچر کا افتتاح اس طرح کیا ھے ۔

> محمد عربی فلک الافلاک کی بلندیوں پر پہنچ کر
> واپس تشریف لے آئے ۔ خدا شاھد ھے کہ اگر میں
> اس مقام پر پہنچ جاتا تو کبھی واپس نہ آتا ۔

یہ الفاظ ایک بہت بڑے صوفی بزرگ (عبدالقدوس گنگوھی رح) کے ھیں ۔ تصوّف کے تمام لٹریچر میں ان جیسے اور الفاظ کا ملنا غالباً مشکل ھے جو ایک فقرے کے اندر شعورِ نبوّت اور تصوّف کے اس قدر لطیف نفسیاتی فرق کو اس طرح واضح کردیں ۔ ایک صوفی اپنے انفرادی تجربہ کی تجردگاہ سے واپس آنا نہیں چاھتا ۔ اور جب واپس آتا بھی ھے (اس لئے کہ اسے واپس آنا پڑتا ھے) تو اس کی یہ مراجعت نوع انسانی کے لئے کچھ معنی نہیں رکھتی ۔ اس کے برعکس، ایک نبی کی مراجعت تخلیقی مقصد کے لئے ھوتی ھے ۔ وہ آتا ھے کہ زمانے کے طوفان پر تسلّط پا کر تاریخ کی قوّتوں کو اپنے قابو میں لے آئے ۔ اور اس طرح مقاصد کی ایک نئی دنیا تعمیر کر دے ۔ ایک صوفی کے لیے اس کے انفرادی تجربہ کی تجردگاہ آخری مقام ھوتی ھے ۔ لیکن ایک رسول کے دل میں اس سے زلزلہ انگیز نفسی قوّتیں بیدار ھو جاتی ھیں جن کا مقصد یہ ھوتا ھے

> کہ وہ تمام دنیائے انسانیت میں ایک انقلاب پیدا کر دیں ۔ یہ آرزو کہ جو کچھ اس نے دیکھا ہے وہ ایک جیتی جاگتی دنیا کے پیکر میں متشکل ہو جائے ، نبی کے دل میں پیش پیش ہوتی ہے ۔ اسی لئے ایک صاحبِ وحی کے تجربہ کی قدر و قیمت جانچنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ دیکھا جائے کہ اس نے انسانیت کو جس قالب میں ڈھالا ہے وہ کیسا ہے اور اس کے پیغام کی روح سے جس قسم کی دنیائے ثقافت اُبھر کر سامنے آ گئی ہے ، وہ کس انداز کی ہے ۔
>
> (خطبات اقبال)

میں اس وقت ، ان تفاصیل میں نہیں جانا چاہتا کہ تصوّف کی حقیقت کیا ہے اور جس چیز کو کشف و الہام کہا جاتا ہے اس کی ماہیت کیا ہے ؟ ان امور کے متعلق کسی دوسرے وقت لکھوں گا ۔ اس وقت صرف اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ مقامِ نبوّت (فلک الا فلاک کی بلندیوں) تک پہنچنا تو ایک طرف ، صوفی کا گزر اُن دوائر میں بھی نہیں ہو سکتا جِن سے وحی کا نزول ہوتا ہے ۔ صوفی کے تمام کمالات اس کے اپنے کسب و ہنر کا نتیجہ ہوتے ہیں ۔ اس کے برعکس نبوّت ایک یکسر وہبی عطیہ ہے جس میں نبی کے اپنے کسب و ہُنر کو (تو ایک طرف اختیار و ارادہ کو) بھی دخل نہیں ہوتا ۔ جس چیز کو تصوّف کی دنیا میں روحانی ترقی سمجھا جاتا ہے وہ دراصل انسان کی بعض نفسیاتی قوّتوں کی بیداری اور نشو و نما ہوتا ہے ۔ یہ اس کی اپنی داخلی قوّتیں ہوتی ہیں ۔ اس کے برعکس ، وحی ، خارج سے انکشافِ حقیقت کا نام ہے جسے ”نزول“ کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے ۔ وحی کی بنیادی خصوصیت اسَ کی (Objectivity) ہے ۔ لٰہذا یہ سوال ھی پیدا نہیں ہوتا کہ صوفی اس مقام تک پہنچ کر جہاں سے نبی کو وحی ملتی ہے واپس آ سکتا ہے یا نہیں ۔ جو وہاں

پہنچ ہی نہیں سکتا ، اس کی واپسی کا کیا ذکر؟ جس مقصد کے لئے میں نے اس اقتباس کو لکھا ہے وہ یہ ہے کہ جب نبی پر انکشافِ حقیقت ہوتا ہے (یعنی اسے وحی ملتی ہے) تو اس سے مقصد یہ نہیں ہوتا کہ وہ ان حقائقِ مستور کے پُرکیف مناظر سے اپنے طور پر ہی لذّت اندوز ہوتا رہے اور ان کی حیرت انگیز کیفیات میں اس قدر مستغرق ہو جائے کہ صوفیوں کی طرح اس کی بھی (معاذ اللّٰہ) یہ حالت ہو جائے کہ

کاں را کہ خبر شد خبرش باز نہ آید

نبی کو وحی اس لئے نہیں ملتی ۔ اُسے وحی اس لئے ملتی ہے کہ وہ اسے لے کر انسانوں کی طرف آئے اور ظلم و استبداد کی ان تمام طاغوتی قوّتوں کو جو عالمِ انسانیت میں فساد برپا کر رہی ہوں ، راستہ سے ہٹا کر انسانی معاشرے کو قوانینِ خداوندی کے خطوط پر متشکل کر دے ۔ بالفاظ دیگر، وہ عالمِ انسانیت میں خدا کے پروگرام کی تکمیل کا ذریعہ بنے ۔ یہی وَہ حقیقت ہے جس کی طرف (داستانِ حضرت موسٰیؑ میں) یہ کہہ کر اشارہ کیا گیا ہے کہ وَاصْطَنَعْتُکَ لِنَفْسِیْ (۲۰/۴۱) ۔ ہم نے تجھے (اے موسٰی ! اس طرح) اپنی ذات کے لئے تیار کیا ۔ اس میں لِنَفْسِیْ کا ٹکڑہ قابلِ غور ہے ۔ گویا خدا کا ایک پروگرام تھا جس کی تکمیل کے لئے اس نے صاحب ضرب کلیم کو اس طرح (درجہ بدرجہ — منزل بہ منزل) تیار کیا ۔ وہ پروگرام کیا تھا ۔ اِذْھَبَا اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّہٗ طَغٰی (۲۰/۴۳) ۔ تم دونوں ، (حضرت موسٰیؑ اور حضرت ہارونؑ) فرعون کی طرف جاؤ ۔ اس لئے کہ وہ بڑا سرکش ہو گیا ہے ۔ وہ حد سے نکل گیا ہے ۔ یعنی ایک نبی کو وحی اس لئے دی جاتی ہے کہ وہ مظلوم انسانیت کو مستبد اور سرکش قوّتوں کے پنجۂ آہنی سے چھڑا کر خدا کے قوانین کے تابع لے آئے ۔

یہ نقطہ، عزیزم! مزید وضاحت کا متقاضی ہے۔ تم نظامِ کائنات پر غور کرو۔ وہاں ہر شے خود بخود قوانینِ خداوندی کے مطابق مصروف کار ہے۔ جس کے سپرد جو کام کیا گیا ہے وہ اس کی تکمیل کے لئے ہر وقت رقصاں و جنباں ہے۔ لیکن انسان کو چونکہ صاحبِ ارادہ پیدا کیا گیا ہے اس لئے اسے اختیار حاصل ہے کہ یہ چاہے تو قانونِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرے اور چاہے تو اس سے سرکشی اختیار کرکے دوسری روش پر چل نکلے۔ جب مستبد قوّتیں قانونِ خداوندی کے راستے کو چھوڑ کر، اپنے خود ساختہ قوانین کے مطابق نظام قائم کر لیتی ہیں، تو زیردست انسان اُن کے پاؤں تلے بُری طرح روندے جاتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ خدا کا قانون مکافات، ان سرکش قوّتوں کے اعمال کے نتائج مرتّب کر رہا ہوتا ہے۔ اور ان نتائج کو ایک دن اُن کے سامنے بھی آنا ہوتا ہے۔ لیکن یہ کچھ خدا کے کائناتی قانون کے حساب و شمار کے مطابق ہوتا ہے جس میں (قرآن کے الفاظ میں) ایک ایک دن ہزار ہزار سال (۳۲/۵) اور پچاس پچاس ہزار سال (۷۰/۴) کا ہوتا ہے۔ لیکن اگر خدا کے اس قانون مکافات کے ساتھ انسان کا ہاتھ بھی لگ جائے تو یہی نتائج انسانوں کے ماہ و سال کے حساب سے مرتّب ہوکر سامنے آ جاتے ہیں۔ اور جن سرکش قوموں نے صدیوں کے بعد جا کر تباہ ہونا تھا وہ دنوں میں سرنگوں ہو کر وجۂ نجاتِ انسانیت بن جاتی ہیں۔ بالفاظ دیگر، یوں سمجھو کہ جب انسان خدا کا رَفیق بن جائے تو پھر خدا کے پروگرام (مشیت) کی تکمیل انسانی حساب و شمار کے مطابق ہو جاتی ہے۔ اسی حقیقت کو قرآن میں بانداز دگر بیان کیا گیا ہے۔ سورۂ سجدہ میں ہے، یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ۔ قانونِ خداوندی کے مطابق تدبیرِ امور کی صورت یہ ہے کہ وہ اپنی ہر اسکیم کو اس کے پست ترین نقطہ سے شروع کرتا ہے۔ اور اسے اس کے

نقطۂ آخریں تک پہنچنا ہوتا ہے۔ وہ اسکیم اپنے نقطۂ آغاز سے بلند ہونا شروع ہوتی ہے۔ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِیْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (۳۲/۵)۔ اور اس طرح اوپر اٹھتی جاتی ہے (خدا کی طرف بلند ہوتی جاتی ہے) ایک ایک ارتقائی مرحلہ میں جس کی مقدار تمہارے حساب و شمار سے ہزار ہزار سال کی ہوتی ہے۔ اسی کو سورۂ فاطر میں یوں کہا گیا ہے کہ اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ۔ خوشگوار نظریۂ حیات اُس کی طرف بلند ہوتا ہے۔ اس کا یہ بلند ہونا خدا کے کائناتی قانون کے حساب و شمار کے مطابق ہوتا ہے (جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے)۔ اس کے آگے ہے۔ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ (۳۵/۱۰)۔ اور عمل صالح اسے رفعت عطا کر دیتا ہے۔ یعنی ویسے تو وہ خدا کے کائناتی قانون کے مطابق بلند ہوتا ہی ہے، لیکن اگر اس کے ساتھ انسان کے اعمال صالح بھی شامل ہو جائیں تو یہ اس کی رفتار یا ترقی (Speed or Progress) کو تیز تر (Accelerate) کر دیتے ہیں۔ انسان کی رفاقت کے بغیر وہ صرف اپنے زورِ دروں سے اوپر چڑھتا تھا۔ اس کی رفاقت اسے خارجی قوّت کا سہارا دے کر، جلد تر بلندیوں تک پہنچا دیتی ہے۔ خدا اور انسان کا یہ حسین تعلق (یعنی رشتۂ رفاقت) وہ عظیم حقیقت ہے جس کی طرف نبی اکرمؐ نے اپنی زندگی کے آخری سانس میں ان الفاظ سے اشارہ فرمایا کہ بَلِ الرَّفِيْقُ الْاَعْلٰى۔ خدا رفیقِ اعلیٰ ہے۔ یعنی اس پروگرام کی تکمیل میں انسان رفیقِ ادنیٰ ہوتا ہے۔ اور خدا رفیقِ اعلیٰ۔ لیکن تعلق ان کا رفاقت ہی کا ہوتا ہے۔ یعنی انسان کا قانون خداوندی سے ہم آہنگ ہونا۔

اس پس منظر کی روشنی میں آگے بڑھو۔ عربوں میں قاعدہ تھا کہ جب دو دوست آپس میں گہری رفاقت کا معاہدہ کرتے تو دونوں اپنی اپنی

کمانیں ملاتے اس طرح کہ دونوں کا چلّہ ایک ہو جاتا ، یعنی وہ کمانیں تو دو ہوتیں لیکن اُن کا چلّہ ایک ہوتا ۔ اس چلّہ میں ایک تیر رکھتے ۔ ان میں سے ایک دوست کمان کو پکڑتا اور دوسرا چلّہ کو کھینچتا اور اس طرح دونوں مل کر تیر چلاتے ۔ اس محکم معاہدۂ رفاقت کو وہ قاب قوسین (دو کمانوں کے ایک چلّہ) سے تعبیر کرتے ۔

قرآن نے کہا ہے کہ جب نبی اکرمؐ کی ذات اقدس میں شرفِ انسانیت کے مختلف عناصر یک جا جمع ہوکر اعتدال تک پہنچ گئے اور علم و حقائق کی دنیا میں آپ کو انتہائی بلندیاں ، وسعتیں اور گہرائیاں حاصل ہو گئیں تو اس کے بعد فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى ($\frac{۵۳}{۹}$) ۔ آپؐ کا خدا کے قوانین کے ساتھ انتہائی رفاقت کا تعلق قائم ہو گیا ۔ یوں سمجھو کہ رسول اللہؐ نے خدائی پروگرام کو تکمیل تک پہنچانے کا پختہ عہد دے دیا ۔ اس عہد و پیمان کے بعد وہ انسانوں کی دنیا کی طرف تشریف لائے ۔ حالی کے سادہ اور حسین الفاظ میں ، یہ داعیِ انقلاب ، تاجِ نبوّت سے سرفرازی کے بعد ؎

اُتر کر حرا* سے سوئے قوم آیا   اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

اس نقطۂ نگہ سے دیکھو تو نبوّت اس منصب کو کہیں گے جس کی رُو سے نبی کو وحی ملتی ہے اور رسالت وہ منصب ہے جس کی رو سے وہ وحی کی روشنی میں انسانی معاشرے میں آسمانی انقلاب پیدا کرتا اور اس طرح عملاً وحی کو دوسروں تک پہنچاتا ہے ۔ اس میں وہ قطعاً بخل نہیں برتتا ۔ وَمَا هُوَ

---

* غار حرا اور پہلی وحی کے متعلق جو کچھ ہمارے ہاں مشہور ہے اس کا قرآن میں کوئی ذکر نہیں ۔ یہاں حرا سے ہمارا مقصود نبوّت کا ملنا ہے ۔

عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ (۸۱/۲۴) ۔ اس اعتبار سے نبوّت اور رسالت ایک ہی حقیقت کے دو گوشے اور ایک ہی سکّے کے دو رُخ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ایک ہی شخصیت کو کہیں نبی کہہ کر پکارا ہے اور کہیں رسول کہہ کر۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ نبی اُسے کہتے ہیں جو صاحبِ کتاب نہ ہو اور رسول اسے جسے کتاب ملی ہو، قرآن سے یکسر لاعلمی کی دلیل ہے۔ قرآن کی رو سے ہر نبی، یعنی ہر رسول کو کتاب ملتی تھی (دیکھئے ۲/۲۱۳ ، ۵۷/۲۵) ۔

ہاں! تو میں کہہ یہ رہا تھا کہ ایک نبی، وحی کی جگمگاتی قندیل کو ہاتھ میں لئے، دنیائے انسانیت کی طرف آتا ہے تاکہ انسانی معاشرے کو کائناتی قوانین سے ہم آہنگ کرکے، خدا کے پروگرام کی تکمیل کرے۔ اور جس طرح اس کی بادشاہت آسمانوں (خارجی کائنات) میں ہے اسی طرح زمین پر بھی اس کی حکومت قائم ہو جائے۔ اس طرح رسول اور اس کے ساتھی خدا کے انصار اور رفیق بن جاتے ہیں۔ اب جو کام ان کے ہاتھوں سے سرزد ہوتے ہیں، انہیں خدا خود اپنی طرف منسوب کرتا ہے (مثلاً) جنگِ بدر میں جو تلواریں محمد رسول اللہؐ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ کے مقدّس ہاتھوں سے اُٹھیں اور جو تیر اُن کی کمانوں سے نکلے ان کے متعلق خدا نے کہا ہے کہ وہ کچھ ہمیں نے کیا تھا۔ فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ۔ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى (۸/۱۷) ۔ تم نے اُنہیں قتل نہیں کیا اللہ نے قتل کیا ہے۔ تم نے اُن پر تیر اندازی نہیں کی، خود اللہ نے کی ہے۔ غور کرو سلیم! کہ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى کی کیسی دل نشین پیرایہ میں تشریح کی گئی ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے غالب نے اپنے مخصوص انداز میں یوں بیان

کیا ھے کہ ؎

تیرِ قضا ھر آئینہ از ترکشِ حق است
لیکن کشودِ آں ز کمانِ محمد است

مقام رسالت کی اس سے بہتر انداز میں تصویر کشی شاید ھی کہیں اور مل سکے ۔

علم و عمل کے ان تمام بلند ترین گوشوں کو سامنے لانے کے بعد ، قرآن نے کہا ھے کہ فَاَوْحیٰ اِلٰی عَبْدِہٖ مَا اَوْحیٰ (۵۳/۱۰) ۔ جب یہ ”عبد“ (نبی اکرمؐ) اس مقام تک پہنچ گیا توؔ پھر خدا نے اسے وحی کی خلعت سے سرفراز کیا ! یہ مرتبۂ بلند ھر کسی کو نہیں مل جایا کرتا ۔ اتنی عظیم خصوصیات کا حامل ھوتا ھے وہ سینہ جسے وحی کا مہبط بننا ھوتا ھے ۔ تم نے غور کیا سلیم ! کہ قرآن نے حضور کے لئے عبدہٗ کا لفظ کس مقام پر جا کر استعمال کیا ھے ؟ اس سے تم نے اندازہ لگا لیا ھوگا کہ مقامِ عبدیّت کیا ھے ؟ یہ وہ مقام ھے جس کے تصوّر سے نگاھوں میں چمک ، ذھن میں جلا اور قلب میں نور پیدا ھو جاتا ھے ۔ اللہ اکبر ۔ کتنا بلند ھے مقام عبدیّت ۔ تم دیکھو گے کہ قرآن نے جہاں نزولِ وحی کا ذکر کیا ھے وھاں عام طور پر عبد کا لفظ استعمال کیا ھے ۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِہِ الْکِتٰبَ (۱۸/۱) ۔ تَبَارَکَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِہٖ (۲۵/۱) ۔ ھُوَ الَّذِیْ یُنَزِّلُ عَلٰی عَبْدِہٖ اٰیَاتٍ بَیِّنٰتٍ (۵۷/۹) ۔ اسی لئے قرآن نے ھر رسولؑ کو عبدؑ کہا ھے ۔

* * *

اب ایک قدم اور آگے بڑھو ۔ ایک شخص خواب میں کچھ محیرالعقول باتیں دیکھتا ہے ۔ جب اس کی آنکھ کھلتی ہے تو وہ خواب میں دیکھے ہوئے مناظر پر خود ہی ہنس دیتا ہے ، اس لئے کہ اس کا دل پکار اٹھتا ہے کہ ایسی باتیں کبھی فی الواقعہ صحیح نہیں ہو سکتیں ۔ قرآن کہتا ہے کہ نبی جن حقائق کا مشاہدہ کرتا ہے ، یعنی جو علم اسے وحی کی بناء پر حاصل ہوتا ہے ، وہ خواب کا سا علم نہیں ہوتا کہ آنکھیں دیکھیں اور دل اس کی تردید کرے ۔ اس کا دیکھنا علم و یقین کا دیکھنا ہوتا ہے ۔ جو کچھ وہ دیکھتا ہے اس کا دل اس کی کبھی تکذیب نہیں کرتا ۔ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى (٥٣/١١) ۔ یہ وجہ ہے کہ نبی اپنی وحی پر سب سے پہلے خود ایمان لاتا ہے ۔ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ (٢/٢٨٥) ۔ جو کچھ اس کے رب کی طرف سے اس پر اتارا جاتا ہے رسول (سب سے پہلے) خود اس پر ایمان لاتا ہے ۔ اور (پھر باقی) مومنین ۔ اس لئے رسول کا اعلان یہ ہوتا ہے کہ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ (٦/١٦٣) ۔ میں سب سے پہلے اپنی وحی کے سامنے سرِتسلیم خم کرتا ہوں ۔

قرآن نے اس مقام پر ایمان کے لئے دل کی شہادت کو ضروری قرار دیا ہے ۔ اس حقیقت کو اس نے سورۂ منافقین میں ایک اور انداز سے بیان کیا ہے ۔ سورت کی ابتداء یوں ہوتی ہے کہ اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ (اے رسول) جب منافق تیرے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ تو یقیناً اللہ کا رسول ہے ۔ اس کے بعد ہے ۔ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ۔ اللہ کو اس کا علم ہے کہ یقیناً تو اس کا

رسول ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ منافقین ایسی بات کہتے ہیں جو امر واقعہ ہے اور جس کی شہادت خود اللہ دے رہا ہے۔ اس لئے منافقین کے سچا ہونے میں بظاہر کوئی شبہ نہیں رہ جاتا۔ لیکن اس کے آگے ہے کہ وَاللّٰہُ یَشْھَدُ اِنَّ الْمُنَافِقِیْنَ لَکَاذِبُوْنَ (٦٣/١٠٣)۔ اور اللہ اس کی بھی شہادت دیتا ہے کہ یہ منافقین یقیناً جھوٹے ہیں۔ تم غور کرو کہ قرآن نے یہاں کتنی بڑی حقیقت بیان کی ہے اور کیسے دل نشین پیرایہ میں۔ اس نے کہا یہ ہے کہ منافقین زبان سے جو کچھ کہتے ہیں وہ تو بالکل سچی حقیقت ہے لیکن چونکہ ان کا دل اس کی شہادت نہیں دیتا اس لئے یہ جھوٹے ہیں۔ اس سے قرآن نے کذب کی ایک واضح اور محکم تعریف (Definition) بیان کر دی ہے۔ یعنی جب تک کسی کا قلب اور زبان ہم آہنگ نہ ہو، اسے سچا نہیں کہہ سکتے۔ کذب وہ ہے جس میں قلب اور زبان میں ہم آہنگی نہ ہو۔ ایک شخص زبان سے ایک ایسی بات کہتا ہے جو بالکل سچی ہے۔ لیکن اگر اس کا دل اس کی تصدیق نہیں کرتا تو وہ کاذب ہے۔ صادق نہیں ہے۔ اقبال کے الفاظ میں ؎

تو عرب ہو یا عجم ہو تیرا لا الہ الا
لغت غریب جب تک تیرا دل نہ دے گواہی

ایمان یہ ہے کہ مَا کَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰی (٥٣/١١)۔ جو کچھ آنکھیں دیکھیں دل اس کی تکذیب نہ کرے۔ نبی اپنی وحی پر اسی طرح ایمان لاتا ہے۔ وہ حقائق کا اپنی آنکھون سے مشاہدہ کرتا ہے۔ اور اس کا دل ان کی تصدیق کرتا ہے۔ اس کے بعد قرآن ضمناً ان لوگوں سے مخاطب ہوتا ہے جو نبی کی اس وحی کی مخالفت کرتے ہیں۔ وہ ان سے کہتا ہے کہ تم ہمیشہ کہتے یہ ہو

کہ شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔ لیکن عملاً تمہاری حالت یہ ہے کہ تم رسولؐ سے اس بات پر جھگڑتے ہو جسے وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر بیان کرتا ہے۔ اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰی مَا یَرٰی۔ کتنی بڑی ہے تمہاری بھول اور کس قدر غیر معقول ہے تمہاری یہ مخالفت؟

اس ضمنی گوشے کے بعد قرآن پھر اسی موضوع پر آ جاتا ہے اور اگلی آیت میں ایک اور عظیم حقیقت کو سامنے لاتا ہے۔ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ قرآن نے یہ بتایا ہے کہ وحی، خواب نہیں ہوتا۔ حقیقت کا حتمی مشاہدہ ہوتا ہے۔ اس چیز کو اس نے بانداز دگر بیان کیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ آپ کسی خواب کو انہی تفاصیل، جزئیات، ربط اور تسلسل کے ساتھ کبھی دوبارہ نہیں دیکھ سکتے۔ یہ نفسیاتی ناممکنات میں سے ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ نبیؐ کی آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے اسے خواب مت سمجھو۔ اس لئے کہ وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰی (۵۳/۱۲)۔ اس نے اسے بار دگر بھی دیکھا ہے۔ اور فی الحقیقت (لَقَدْ رَاٰهُ) دیکھا ہے۔ اس لئے اس کا یہ دیکھنا خواب کا دیکھنا نہیں۔ جو لوگ وحی کو خواب پر محمول کرتے ہیں۔ یا خوابوں کو از قبیل وحی تصور کرتے ہیں انہیں سوچنا چاہئے کہ یہ ان کی کتنی بڑی غلطی ہے۔ وحی خواب نہیں ہوتا۔ حقیقت کا یقینی مشاہدہ ہوتا ہے اور بار بار ہوتا ہے۔

اس کے بعد قرآن، وحی کے ایک اور بنیادی گوشے کو سامنے لاتا ہے۔ ایک طرف جذبات پرست ہیں جو خوابوں کو بھی از قبیل وحی قرار دیتے ہیں۔ دوسری طرف عام مفکرین (فلاسفرز) ہیں جن کا خیال ہے کہ وحی، انسانی فکر (Intellect) ہی کی ایک بڑھی ہوئی شکل کا نام ہے۔ برگسان نے وجدان (Intuition) کے متعلق کہا ہے کہ وہ فکر ہی کی بلند سطح (Higher Form Of Intellect)

ہوتی ہے۔ چنانچہ بعض لوگ وجدان کو وحی پر محمول کر لیتے ہیں۔ مغربی مفکرین کا رجحان اسی طرف ہے۔ قرآن نے جہاں اس تصور کی تردید کی ہے کہ خواب بھی وحی ہوتے ہیں وہیں واضح الفاظ میں اس کا بھی اعلان کر دیا کہ وحی فکر انسانی کی بڑھی ہوئی شکل کا نام نہیں۔ وحی کا مقام وہ ہے جہاں عقل انسانی کے لئے حیرت کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰی (۵۳/۱۴)۔ نبی نے ان حقائق کو سِدْرَةُ الْمُنْتَهٰی کے قریب دیکھا۔ عربوں میں السادر اس شخص کو کہتے ہیں جو متحیر ہو جائے۔ سَدِرَ بَصَرُہٗ سَدْرًا کے معنی ہیں گرمی کی شدت کی وجہ سے اس کی نگاہیں حیران و ششدر رہ گئیں* ۔ اس لئے نبی کو جس مقام سے وحی ملتی ہے وہاں عقل انسانی کے لئے سوائے تحیر کی فراوانیوں کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ انسانی عقل وہاں ششدر و حیران رہ جاتی ہے۔ یہ اس کے بس کی بات ہی نہیں کہ وہ اس مقام اور اس کی کیفیت کا مشاہدہ یا اندازہ کر سکے۔

لیکن اگر عقل انسانی مقام وحی کی کنہ و حقیقت کو نہیں سمجھ سکتی تو اس کے یہ معنی نہیں کہ عقل، وحی کے حقائق سے مستفید بھی نہیں ہو سکتی۔ وحی کی تعلیم انسان کی سمجھ میں آ سکتی ہے۔ اسی لئے قرآن نے بار بار فکر و تدبّر اور عقل و شعور سے کام لینے کی تاکید کی ہے۔ اس تعلیم کا سمجھنا اس لئے ضروری ہے کہ اس پر عمل کیا جائے اور اس پر عمل کرنا اس لئے

---

*السَّدِیْرُ پانی کے منبع اور سر چشمہ کو بھی کہتے ہیں۔ اس اعتبار سے سِدْرَةُ الْمُنْتَهٰی کے معنی علم الٰہی کے ہوں گے جو تمام حقائق کا سر چشمہ ہے۔

ضروری ہے کہ اس دنیا میں بھی جنّتی معاشرہ قائم ہو سکے اور اس کے بعد کی زندگی بھی جنّت کی ہو۔ لہٰذا وھی عقل جو مقام نبوت کی کنہ و حقیقت کے سمجھنے سے یکسر قاصر ہے وہ اگر وحی کے پیغام کی اتباع کرے تو جنت کی خوشگواریاں اس کے حصہ میں آ سکتی ھیں۔ اس لئے کہ مقام وحی اگر عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ہے تو عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى ($\frac{۵۳}{۱۵}$)۔ جنت بھی اُسی کے پاس ھی ہے*۔ جو شخص عقل کی رو سے مقام نبوت کو اپنے حیطۂ ادراک میں لانے کی سعی لا حاصل کرتا ہے اس کے حصہ میں حیرت کی فراوانیوں کے سوا کچھ نہیں آتا۔ لیکن جو شخص عقل و بصیرت کی رو سے وحی کے پیغامات کو عملی نظام میں متشکل کرتا ہے وہ اپنے آپ اور اپنے ساتھ باقی انسانیت کو جنت کے آغوش میں لے آتا ہے، جہاں وہ اضطراب باقی نہیں رھتا جو عقل کی نارسائی کی وجہ سے قدم قدم پر اس کے لئے وجۂ خلش بنتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اھل جنت کے متعلق کہا ہے کہ وہ فِیْ سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍ ($\frac{۵۶}{۲۸}$)۔ ھوں گے۔ یعنی ان "بیریوں" کے نیچے جن کا سایہ آرام دہ اور پھل خوشگوار ھوں گے۔ لیکن جن میں کانٹے نہیں ھوں گے۔ ایسی حیرت جس میں شکوک کی خلش نہ ھو۔ بہر حال، وحی کا مقام وہ ہے جہاں عقل انسانی بار ھی نہیں پا سکتی۔ جہاں عالم انسان کی آنکھ کے لئے تحیر ھی تحیر ہوتا ہے وھاں نبی کی یہ کیفیت ھوتی ہے کہ جب ان تحیر کی وادیوں پر ہر طرف سے علم الٰہی چھایا ھوا ھوتا ہے اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا

اگر سدرۃ المنتھی کے معنی علم الٰہی کے لئے جائیں تو عندھا جنت الماوی سے مراد یہ ھوگی کہ جن لوگوں کی کشت امل وحی الٰہی کے پانی سے سیراب ھو، وہ جنت کے مالک ھوں گے۔

يَغْشٰى (۵۳/۱۶) ۔ تو اس کی آنکھ اس مقام پر بھی ذرا ادھر اُدھر نہیں ہوتی ۔ مَا زَاغَ الْبَصَرُ (۵۳/۱۷) ۔ وہ ذرا نہیں بھٹکتی ۔ غور کرو کہ عقل انسان اور نگۂ نبوی میں کتنا عظیم فرق ہوتا ہے ۔ یہ فرق درجہ (Degree) یا کمیت کا (Quantitative) نہیں ہوتا ۔ یعنی یہ نہیں کہ ایک ذرا نیچے ہے اور دوسی ذرا اُوپر ۔ یہ فرق اصل و بنیاد کا فرق ہوتا ہے ۔ کمیت کی بجائے کیفیت کا (Qualitative) ہوتا ہے ۔ عقل انسانی کسب و ہنر سے اُس مقام تک پہنچ ہی نہیں سکتی ۔ لیکن اس مقام سے ملے ہوئے پیغامات سے نفع یاب ہو سکتی ہے ۔ یہ تو ہے نگۂ نبوّت کا تقابل عقل انسانی سے ۔ یعنی عقل انسانی کے مقابلہ میں نگۂ نبوّت حدود فراموش ہوتی ہے ۔ لیکن جب اس کا مقابلہ علمِ خداوندی سے کیا جائے تو علم نبوی لا محدود اور لا منتہا نہیں ہوتا ۔ نبوّت کی آنکھ اُس حد سے آگے نہیں بڑھ سکتی جو اس کے لئے علمِ خداوندی نے مقرر کر رکھی ہو ۔ اس لئے مَا زَاغَ الْبَصَرُ کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ وَمَا طَغٰى (۵۳/۱۷) ۔ وہ نگاہ ، جہاں تحیّر کی فراوانیوں کے باوجود ذرا اپنے مقام سے ادھر اُدھر نہیں ہوتی ، وہاں وہ اُس حد سے بھی تجاوز نہیں کر سکتی جو اُس کے لئے متعین ہوتی ہے ۔ اس لئے کہ نبی کا علم (وحی) کتنا ہی بلند اور وسیع کیوں نہ ہو وہ بہر حال ، خدا کا عطا کردہ اور علم خداوندی کے مقابلہ میں محدود ہوتا ہے ۔ انسانوں کے مقابلہ میں وحی کا مقام وہ ہے جہاں انسانی علم و عقل کی حدیں ختم ہو جاتی ہیں ۔ لیکن علم خداوندی کے مقابلہ میں یہ لا انتہا نہیں ۔

——— : o : ———

مقام نبوت کے متعلق ان تصریحات کے بعد ، قرآن چند لفظوں میں بتا تا ہے کہ نبی اس بلند مقام پر پہنچ کر دیکھتا کیا ہے ؟ اس مقام پر قرآن ۔ وحی

کی تفصیل کو چند الفاظ میں سمیٹ کر رکھ دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّهِ الْکُبْرٰی (۵۳/۱۸)۔ اس نے اس مقام پر اپنے نشو و نما دینے والے کی آیاتِ کبریٰ (عظیم نشانیوں) کو دیکھا۔ ان آیاتِ کبریٰ سے مراد کیا ہے؟ اس کے لئے پھر داستان حضرت موسیٰؑ کی طرف آؤ۔ جب حضرت موسیٰؑ کو طور کی چوٹیوں پر وحی سے نوازا گیا تو ان سے کہا گیا کہ یہ سب کچھ اس لئے کیا گیا ہے لِنُرِیَکَ مِنْ اٰیٰتِنَا الْکُبْرٰی (۲۰/۲۳)۔ تا کہ ہم تجھے اپنی آیات الکبریٰ دکھائیں۔ اس کے بعد ہے اِذْهَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰی (۲۰/۲۴)۔ فرعون کی طرف جا کیوں کہ وہ بڑا ہی سرکش ہو گیا ہے۔ وہ حد سے تجاوز کر گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ وحی پانے کے بعد، نبی کے سامنے پروگرام یہ ہوتا ہے کہ وہ سرکش قوتوں کو ان کے ظلم و استبداد سے روکے اور مظلوم انسانیت کو ان کے دندان حرص و آز سے چھڑائے۔ وہ اس مقصد عظیم کو لے کر آتا ہے اور طاغوتی قوتوں کو قیامت خیز تصادمات کے بعد شکست دے کر قوانین خداوندی کے مطابق معاشرہ کی تشکیل جدید کرتا ہے۔ ان سرکش اور مستبد قوتوں کی اس طرح سے شکست اور ان کے غاصب و ظالم نظام کی جگہ، خدا کے نظام ربوبیت عالمینی کا قیام، وہ آیات کبریٰ ہیں جن کا مشاہدہ نبی کو کرایا جاتا ہے۔

یہ ہے عزیزم! قرآن کی روشنی میں نبی کا مقام اور یہ ہے وہ فریضۂ عظیم جس کی ادائیگی کے لئے اسے اس منصب جلیلہ پر فائز کیا جاتا ہے۔ اس سے تم نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ نبی کا کام خدا سے وحی پا کر اسے انسانوں تک پہنچا دینا ہی نہیں ہوتا بلکہ وحی کی روشنی میں نظامِ خداوندی کا قیام بھی ہوتا ہے۔ اور یہ مقصد بہت بلند اور یہ فریضہ بڑا

اہم ہوتا ہے ۔

نبوّت ، نبی اکرمؐ کے ساتھ ختم ہو گئی ۔ لہذا حضورؐ کے بعد کوئی شخص خدا کی طرف سے وحی نہیں پا سکتا ۔ لیکن اس وحی کی روشنی میں نظام خداوندی کا قیام اور اس کے بعد اس کا تسلسل و استحکام وہ فرائض ہیں جو حضورؐ کی تشریف براری کے بعد ، اُمت کے سپرد ہوئے ۔ حضورؐ کے بعد اُمت نے کچھ وقت تک اس فریضہ کو سر انجام دیا ۔ لیکن اس کے بعد ، بد قسمتی سے ، یہ گاڑی دوسری پٹڑی پر جا پڑی اور نظام خداوندی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا ۔ اب اُمت کا کام یہ ہے کہ اتباع نبوی میں پھر سے اُسی نظام کو قائم کرے تاکہ خدا کا دین متمکن ہو جائے اور جنت سے نکلا ہوا آدم پھر سے فردوس گم گشتہ کو پا لے ۔

اس حقیقت کو سلیم ! اچھی طرح سن رکھو اور ساری دنیا کو سنا دو کہ انسان جو جی میں آئے کرکے دیکھ لے اس کی نجات و سعادت کی صرف ایک راہ ہے یعنی وہ راہ جو مقام محمدیؐ (وحی) پر ایمان سے متعین ہوتی ہے اور جس کی طرف پیام محمدیؐ (قرآن) راہ نمائی کرتا ہے ۔ ع

اگر باٰیں نہ رسیدی تمام بو لہبی است

———— : o : ————

یہ خط بہت لمبا ہو گیا ۔ لیکن تم نے بات ہی ایسی پوچھی تھی ۔ ویسے بھی

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم ۔

اچھا خدا حافظ ۔

والسلام
پرویز
(نومبر ۱۹۵۶ء)

بیسواں خط

(کائنات کے دو عظیم انقلاب)

تمہارا خط مختلف مقامات کی سیر کرتا مجھے یہاں ریاست سوات میں ملا جہاں میں وسط مئی سے آیا ہوا ہوں۔ اس علاقے کا تفصیلی تعارف تو کسی اور وقت کراؤں گا، اس وقت صرف اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ ان وادیوں میں فطرت نے اپنی حُسن پاشیوں میں کسی قسم کا بخل نہیں برتا۔ لیکن چونکہ انسانی ہاتھ نے ابھی تک اس کی مشاّطگی نہیں کی اس لئے اس حسن میں نکھار نہیں پیدا ہو سکا۔ جس دن انسان نے اس کی تزئین و آرائش کی طرف توجہ کی، نہ معلوم یہ شگفتہ و شاداب خطۂ زمین کیا سے کیا بن جائے گا۔ لیکن میرے لئے یہ حسن معصوم بھی اپنے اندر کم جاذبیتیں نہیں رکھتا۔ اس کی کشادہ وادیاں کَيْفَ سُطِحَتْ۔ اس کی محکم پہاڑیاں کَيْفَ نُصِبَتْ۔ اور اس کی فلک بوس، برف آلودہ چوٹیاں کَيْفَ رُفِعَتْ کی جیتی جاگتی تفسیریں، اور ان سے ترتیب پائے ہوئے رنگین مناظر کَيْفَ خُلِقَتْ کی زندہ تصویریں ہیں۔ میرے کمرے کے دریچے کے سامنے دریائے سوات (جسے یہاں کے رہنے والے سندھ کہتے ہیں) اپنے مسلسل زیر و بم کے ساتھ سلسبیلانہ انداز سے محوِ خرام ہے۔

اس کی لہروں کی رنگینیاں میرے لئے جنّتِ نگاہ اور اس کی آبشاروں کی نغمہ آفرینیاں فردوس گوش ھیں ۔ میں اس کی طرف دیکھتا ھوں اور عجیب و غریب خیالات میں گم ھو جاتا ھوں ۔ میں اکثر سوچتا ھوں کہ جسے ھم دریا کہتے ھیں وہ در اصل ھے کیا ؟ وہ پانی جس سے دریا کا وجود قائم ھے ، پیچھے سے مسلسل آتا اور آگے بڑھے چلا جاتا ھے ۔ تو کیا اس پانی کو جو ابھی یہاں تھا ، اور ابھی کہیں سے کہیں چلا گیا ، دریا کہیں گے ؟ یہ کیسے ھو سکتا ھے ؟ ایک ھر آن تغیر پذیر شے کس طرح ثابت قرار پا سکتی ھے ؟ تو کیا دریا کے بطن (Bed) کو دریا کہا جائے گا ، جو اگرچہ مستقلاً اپنی جگہ پر قائم ھے ، لیکن جو تغیر پذیر پانی کے بغیر دریا کہلا ھی نہیں سکتا ۔ اگر اس میں پانی نہ ھو ، تو اس میں ، اور اس کے اردگرد کی زمینوں میں کیا فرق ھے ! دریا در حقیقت نام ھے اس ثبات (Permanence) اور تغیر (Change) کے مجموعہ کا ، بعینہٖ جس طرح انسان نام ھے نہ بدلنے والی ذات (Personality) اور ھر آن بدلنے والے خیالات کے مجموعہ کا ۔ ایک خیال آتا ھے جس سے ھم خوش ھو جاتے ھیں ۔ وہ نہایت خاموشی سے اس طرح آگے بڑھ جاتا ھے جس طرح سورج کے سامنے سے بادل گذر جاتا ھے ، پھر ایک اور خیال آ جاتا ھے جس سے ھم غمگین ھو جاتے ھیں ۔ وہ بھی اسی طرح آگے بڑھ جاتا ھے ۔ خیالات کی یہ رو آتی رھتی ھے اور جاتی رھتی ھے ۔ لیکن ھماری ذات مستقلاً اپنے مقام پر موجود رھتی ھے ۔ اسی طرح جیسے پانی کی لہریں آتی رھتی ھیں اور جاتی رھتی ھیں ۔ لیکن دریا کا بطن اپنی جگہ پر قائم رھتا ھے ۔ وہ پانی کے مسلسل تغیر سے اثر پذیر نہیں ھوتا ۔ لیکن یہ دریا اس وقت تک دریا ھے جب تک اس کا پانی ساحلوں میں پابند ھے ۔ اگر یہ ان ساحلوں کو توڑ کر حدود فراموش ھو جائے تو اسے دریا نہیں بلکہ سیلاب کہا جائے گا جس کا

نیجه تخریب هی تخریب هوگا۔ انسانی خیالات و جذبات بهی اسی وقت تک نسانی کہلا سکتے هیں جب تک وه قوانین خداوندی کے ساحلوں میں محصور بیں۔ اگر وه ان سے سرکشی اختیار کر جائیں تو وه انسانی نہیں حیوانی ، بلکه یطانی هو جائیں گے جس کا نتیجه نوع انسانی کے لئے تباهی و بربادی کے سوا دچھ نہیں هوگا۔ انسانی ذات کے استحکام کے معنی یه هیں که انسان کے جذبات خیالات قیود ناآشنا نه هو جائیں۔ لیکن اس پابندی کا مطلب یه بهی نہیں که یکسر جامد اور متصلّب هو جائیں۔ اگر دریا کے پانی کی روانی ختم هو جائے و وه دریا نہیں رهتا، جوهڑ بن جاتا هے جس میں کچھ دنوں کے بعد بو پیدا ہو جاتی هے۔ اور وهی پانی جو هر قسم کی کثافت کو صاف کرنے کے کام آتا تها ءود کثیف بن کر ره جاتا هے۔ یه حالت هو جاتی هے اس قوم کی جو تقلید کی نجیروں میں جکڑ کر زندگی کی روانی سے محروم هو جاتی هے۔ اس میں نه ندرت کر رهتی هے نه جدّت کردار۔ وه هر دم تازه رهنے والی جوئے آب کی جگه یک تنگ و تاریک جوهڑ بن جاتی هے جس سے ساری فضا متعفن هو جاتی هے۔ ه زنده قوموں کی صف سے نکل کر جن کی تقدیریں صبح و شام بدلتی رهتی هیں ، رستان میں تبدیل هو جاتی هے ، جس میں موت کا نام سکون ، اور بے حسی اور بے حرکتی کا نام اطمینان رکھ کر اپنے آپ کو فریب دے لیا جاتا هے۔ ان کے سانس لینے کی وجه سے ان لوگوں کو زنده سمجھ لیا جاتا هے ، لیکن رحقیقت وه زنده نہیں ، مرده هوتے هیں وَ تَحْسَبُهُمْ أَيْقَاظًا وَ هُمْ قُوْدٌ (۱۸/۱۸)۔ ان کی حالت یه هوتی هے که ؎

میکدۂ تہی سبو حلقۂ خود فرامشاں
مدرسۂ بلند بانگ بزم فسرده آتشاں
فکر گره کشا غلام ، دیں بروائتے تمام
زانکه درون سینه ها دل هدفے است بے نشاں

دیکھو سلیم ! بیٹھا تھا میں تمہارے خط کا جواب لکھنے لیکن تصوّرات مجھے کہاں سے کہاں لے گئے۔ اچھا لو اب اپنے خط کا جواب سنو ، اگرچہ اس تشبیب میں بھی تمہیں کئی کام کی باتیں مل جائیں گی ۔

اس میں کوئی شبہ نہیں سلیم ! کہ کائنات کی تخلیق ایک ایسا محیرالعقول کارنامہ ہے کہ انسانی عقل جوں جوں اس کی گہرائیوں اور پہنائیوں پر غور کرتی ہے ، قدم قدم پر اس کی عظمت اور اپنے عجز کا اعتراف کرتی چلی جاتی ہے ۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے اس تخلیقی پروگرام میں دو مقام ایسے آئے ہیں جنہیں فی الحقیقت عظیم انقلاب کہا جا سکتا ہے ۔ یعنی اس عظیم پروگرام کے اندر عظیم انقلابی مراحل ۔ افسوس ہے کہ انسان نے ابھی تک ان انقلابی مراحل کی اہمیت کا صحیح صحیح اندازہ نہیں لگایا ، جس کی وجہ سے وہ کائنات میں اپنے صحیح مقام کا اندازہ اور اس تک پہنچنے کے لئے طریق عمل کا صحیح تعین نہیں کر سکا ۔ اور اس سے بھی زیادہ قابل تاسف اس حقیقت کا احساس ہے کہ اس باب میں مسلمان سب سے پیچھے ہے ، حالانکہ یہ ہر وقت اس کتاب عظیم کو اپنے سامنے رکھتا ہے جس نے ان انقلابی مراحل کا خصوصیات سے ذکر کیا ہے اور انہیں اس طرح ابھار اور نکھار کر بیان کیا ہے کہ ان کی عظمت بادنیٰ تعمق سامنے آ جاتی ہے ۔ میں سمجھتا ہوں کہ جب تک مسلمان ان مقامات کی عظمت کا صحیح صحیح اندازہ نہ کر لے ، وہ قرآن کے پیغام اور اقوام عالم میں اپنی پوزیشن کو صحیح طور پر سمجھ نہیں سکتا ۔ میں کوشش کروں گا کہ اس مختصر سے خط میں ان مقامات کا اجمالی تعارف کرا دوں (کیونکہ ان کے تفصیلی تعارف اور تبئین کے لئے بڑی فرصت کی ضرورت ہے) ۔ اسے تم غور سے سمجھنے کی کوشش کرنا کیونکہ بات ذرا مشکل اور گہری ہے ۔

اللہ تعالیٰ نے کائنات کی تخلیق بالمقصد کی ہے۔ اور جب کسی چیز کو کسی خاص مقصد کے لئے پیدا کیا جائے تو سب کچھ ایک پلان (Plan) کے مطابق کیا جاتا ہے۔ للہذا کائنات کی تخلیق ایک پلان کے مطابق ہوئی ہے۔ پلان کا مطلب یہ ہے کہ اس میں ہر پرزہ کے ذمہ ایک خاص فریضہ لگایا گیا ہے، اور مختلف پرزوں کے باہمی تعاون و تناصر کے لئے خاص قاعدے مقرر کئے گئے ہیں۔ بالفاظ دیگر کائنات کی یہ عظیم القدر مشینری ایک خاص نظم و ضبط اور قاعدے اور قانون کے مطابق سرگرم عمل ہے۔ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَیْءٍ قَدْرًا (٦٥/٣)۔ یقیناً اللہ نے ہر شے کے لئے پیمانے بنا دئے ہیں۔ "قدر" پیمانے یا اندازے کو یا دور حاضر کی سائینٹفک اصطلاح میں (Measurement) کو کہتے ہیں۔ "مقدور" کے معنی (Measured) یا (Determined) کے ہوں گے وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرًا (٣٣/٣٨)۔ اور اللہ کا ہر امر اندازے کے مطابق متعین کردہ ہے۔ خارجی کائنات میں خدا کے متعین کردہ انہی اندازوں کو قوانین فطرت یا (Laws of Nature) کہا جاتا ہے۔ سائنس کی ترقی کے معنی یہ ہیں کہ انسان نے ان قوانین کو کس حد تک دریافت کر لیا ہے۔ سائنسدان ان قوانین کو ایجاد نہیں کرتا۔ ان کا صرف انکشاف (Discovery) کرتا ہے۔ ان قوانین کے محکم اور غیر متبدل ہونے کا نتیجہ ہے کہ ایک سائنسداں پورے حتم و یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ اگر فلاں اور فلاں چیز کو یوں ملا دیا جائے تو اس سے یہ کچھ بن جائے گا۔ کائنات کے یہ اجزاء جو اس قدر محکم انداز سے سرگرم عمل ہیں کس قدر باریک، لطیف اور نازک ہیں، اس کا اندازہ اس سے لگاؤ کہ ایک ایٹم (Atom) مرکب ہوتا ہے (Protons) اور (Electrons) سے۔ ایک برقیہ (Electron) کی ضخامت ایک انچ کے کروڑویں حصہ کے برابر ہوتی ہے۔ یہ پروٹون اور الیکٹرون، اپنے

محور کے گرد چودہ سو میل فی سکنڈ کی رفتار سے گھومتے ہیں ۔ ان کی گردش بالکل ویسے ہی ہے جیسے فضائے آسمانی میں نظام شمسی کے مختلف کُرّوں کی گردش ۔ پھر، مختلف اجزائے کائنات کی ساخت میں ان الیکٹرون وغیرہ کے صحیح صحیح تناسب کا اندازہ اس سے لگاؤ کہ اگر کاربن کی ساخت میں ایک الیکٹرون کی کمی رہ جاتی تو اس کرۂ ارض پر زندگی (Life) ناممکن ہو جاتی ۔ یا آکسیجن اور ہائیڈروجن جس محکم طریق سے باہمدگر مل کر پانی بن گئی ہیں، اگر ان کے اختلاط میں ذرا سا بھی ڈھیلا پن رہ جاتا تو یہ دنیا بھک سے اڑ جاتی ۔ علاوہ اس کے، کائنات کے مختلف اجزاء میں باہمی ربط وضبط ایسا محکم ہے کہ علم الحیات (Biology) کے ماہرین کا اعلان ہے کہ یہ تمام کائنات ایک نامی جسم کی طرح (Organic) ہے ۔ کائنات کی اسی وحدت کی بناء پر اسے (Universe) کہتے ہیں ۔

کائنات کی ہر شے کے اندر وہ قانون از خود موجود ہوتا ہے جس کے مطابق اس نے زندگی بسر کرنی ہوتی ہے (یہ ہے سلیم ! وہ نقطہ جس کے لئے میں نے اتنی لمبی چوڑی تمہید باندھی ہے) اس کو اس شے کی فطرت کہتے ہیں ۔ یا یوں سمجھو کہ ہر شے کو اپنے اپنے فرض منصبی کا علم ہوتا ہے اور اس کا بھی پتہ ہوتا ہے کہ اس فریضہ کی سر انجام دہی کے لئے اسے کیا کرنا ہے قرآن کے الفاظ میں، كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهُ وَتَسْبِيحَهُ (۲۴/۴۱) ۔ کائنات کی ہر شے اپنی تسبیح و صلٰوۃ سے واقف ہے (تسبیح و صلٰوۃ کے قرآنی مفہوم کو تم نے سمجھ لیا سلیم !) اسے قرآن نے وحی بھی کہا ہے، وَاَوْحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ (۱۶/۶۸) ۔ ”خدا نے شہد کی مکھی کی طرف وحی کی“ وَاَوْحٰی فِیْ کُلِّ

سَمَآءٍ أَمْرَهَا (٤١/١٢)۔ ہر کُرّۂ سماوی کی طرف اس کے فریضہ کے متعلق وحی کر دی۔ یا سورۂ ”زلزال“ میں زمین کے متعلق ہے کہ، بِأَنَّ رَبَّكَ أَوْحٰى لَهَا (٩٩/٥)۔ ان قوانین کے لئے وحی کا لفظ استعمال کرنے میں سلیم! ایک نکتہ اور بھی ہے۔ وحی کے معنی خفیف اور تیز اشارے کے ہوتے ہیں۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے ان اشیاء سے ”اشاروں“ میں بات کی ہے۔ اس لئے ان اشاروں کی حقیقت اور ان کا صحیح مفہوم معلوم کرنے کے لئے علم اور تجسس درکار ہے۔ اسی کو سائنس کا علم کہتے ہیں جس کے لئے بڑی باریک بینی اور غائر مشاہدہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان اشیاء سے پردہ میں بات کی ہے۔ ان پردوں کو اٹھانا سائنسداں کا کام ہے۔ یعنی حقیقت کو (Discover) کرنا۔ اس قسم کے تدبر و تفکر اور تجارب و مشاہدات کے بعد یہ امر نکھر کر سامنے آجاتا ہے کہ فطرت کے یہ قوانین جو اس قدر خاموش اشاروں میں بیان ہوئے ہیں کس قدر واضح، متعین اور مفصل اور ایک دوسرے کے مطابق و موافق واقع ہوئے ہیں۔ ان میں کہیں اختلاف نہیں، ابہام نہیں، عدم تعین نہیں، سہو نہیں، خطا نہیں۔ مَا تَرٰى فِى خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ (٦٧/٣)۔

بہر حال میں کہہ یہ رہا تھا کہ اشیائے کائنات میں سے ہر ایک کو اس ضابطہ کا علم براہ راست دیا گیا ہے جس کے مطابق اسے زندگی بسر کرنی ہے۔ یہ علم اس کی فطرت میں داخل ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر شے اس قانون کے مطابق زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (٥٧/١)۔ وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى

الْأَرْضِ (۱۶/۴۹) ؛ جو کچھ ان سے کہا گیا ہے وہ اس کے مطابق عمل کئے جا رہے ہیں۔ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ (۱۶/۵۰)۔ وہ اپنے فرائض کی سر انجام دہی کے لئے پوری پوری قوت سے سر گرداں رہتے ہیں اور نہایت سرعت اور تیزی سے دور دور نکل جاتے ہیں۔ نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ (۲/۳۰)۔ تسبیح میں سلیم ! عمل کی (Intensity) پائی جاتی ہے اور تقدیس میں (Extensiveness)۔ یعنی تمام اشیائے فطرت مشیت کے پروگرام کی تکمیل میں پوری قوت اور وسعت سے سرگرم عمل ہیں۔ کسی کو اس سے مجال سرتابی نہیں۔ یا رائے سر کشی نہیں۔ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ (۱۶/۴۹) یعنی ان میں سے کسی کو اس کا اختیار نہیں دیا گیا کہ وہ چاہے تو اس قانون کی اطاعت کرے اور چاہے تو اس سے سر کش ہو جائے۔ اشیائے فطرت میں کسی قسم کا اختیار و ارادہ ہوتا ہی نہیں۔

جو کچھ میں نے اوپر لکھا ہے اس سے یہ حقیقت سامنے آگئی کہ :

۱۔ اشیائے فطرت میں سے ہر ایک کو اللہ کی طرف سے براہ راست اس قانون کا علم دے دیا گیا ہے جس کے مطابق اس نے زندگی بسر کرنی ہے۔

۲۔ یعنی یہ علم ان اشیاء کی فطرت میں داخل ہے۔

۳۔ وہ اس قانون کی خلاف ورزی کرنے پر قادر ہی نہیں۔

اس سے ظاہر ہے کہ جو قانون کسی شے کی فطرت کے اندر داخل ہو وہ شے اس سے سر کشی اختیار ہی نہیں کر سکتی۔ پانی کو اس کا اختیار ہی نہیں کہ

وہ نشیب کی بجائے فراز کی طرف بہنے لگ جائے۔

سلسلۂ کائنات اسی طریق پر چلا آرہا تھا کہ مشیت کے پروگرام کے مطابق ان دو عظیم انقلابات میں سے پہلا انقلاب واقع ہوا۔ جن کی طرف میں نے شروع میں اشارہ کیا ہے۔ یہ انقلاب تھا انسان کی پیدائش اور اس کی وجہ سے وحی کے سابقہ انتظام میں ایک بہت بڑی تبدیلی۔ سابقہ مخلوقات کے علی الرغم، انسان کو صاحب اختیار و اِرادہ پیدا کیا گیا۔ اس کی اس خصوصیت کبریٰ کو اللہ تعالیٰ نے ”الوہیاتی توانائی کا ایک کرشمہ“ (نَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ) (۱۵/۲۹)۔ سے تعبیر کیا ہے۔ یہ میں تمہیں پہلے بتا چکا ہوں کہ اس قسم کی تخلیق کو جو سلسلۂ ارتقاء کی سابقہ کڑیوں سے مختلف ہو، دور حاضر کی اصطلاح میں فجائی ارتقاء یا (Emergent Evolution) کہتے ہیں۔ گویا انسان کی تخلیق اس قسم کے فجائی ارتقاء کے طور پر عمل میں آئی ہے۔ لیکن جس طرح کائنات کی دیگر اشیاء کے لئے وہ قوانین مقرر کئے گئے ہیں، جس کے مطابق زندگی بسر کرکے وہ مشیت کے پروگرام کو پورا کرتی ہیں۔ انسان کے لئے بھی ایسے قوانین متعین کر دئے گئے ہیں جن کے مطابق زندگی بسر کرنے سے وہ اپنی تخلیق کا مقصد پورا کر سکتا ہے۔ اگر ان قوانین کو (دیگر اشیائے کائنات کی طرح) اس کی فطرت کے اندر رکھ دیا جاتا، یعنی ان کا علم براہ راست ہر انسانی بچہ کو پیدائش کے ساتھ ہی دے دیا جاتا، تو انسان بھی دیگر اشیائے کائنات کی طرح ان قوانین پر چلنے کے لئے مجبور ہو جاتا۔ لیکن یہ چیز اس کے اختیار و ارادے کے خلاف جاتی۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے انسان کی طرف اپنی وحی بھیجنے کے طریق میں ایک عظیم تبدیلی کی۔ اسے پھر سن لو سلیم! کہ اشیائے کائنات کی طرف وحی بھیجنے کا طریق یہ ہے کہ ہر شے اور ہر نوع کی طرف خدا کی طرف سے براہ راست

وحی کی جاتی ہے۔ مرغی کا بچہ انڈے سے باہر نکلتے ہی ان قوانین سے واقف ہوتا ہے جس کے مطابق اس نے زندگی بسر کرنی ہوتی ہے۔ وہ خشکی پر رہتا ہے، پانی کے قریب تک نہیں جاتا، آگ سے دور بھاگتا ہے، دانہ دُنکا چگتا ہے۔ بطخ کا بچہ انڈے سے باہر آنے کے ساتھ ہی پانی پر لپکتا ہے۔ یہ کچھ اسے خدا کی طرف سے براہ راست وحی کے ذریعے معلوم ہوتا ہے۔ لیکن انسانی بچہ خیر و شر سے قطعاً نا واقف ہوتا ہے۔ اسے اس کا علم براہ راست خدا کی طرف سے نہیں ملتا۔ نوع انسان کے ہر فرد کی طرف وحی نہیں ہوتی۔ یہ چیز اس کی فطرت میں داخل نہیں ہوتی۔ جیسا کہ میں تمہیں اس سے پہلے ایک خط میں بتا چکا ہوں، انسان کی کوئی فطرت ہی نہیں۔ فطرت جمادات نباتات و حیوانات کی ہوتی ہے جن میں اختیار و ارادہ نہیں ہوتا۔

انسان کے سلسلہ میں خیر و شر کا علم دینے کے لئے اللہ تعالیٰ نے طریق یہ تجویز کیا کہ نوع انسان کے ایک فرد کو اس مقصد کے لئے منتخب کر لیا جاتا۔ اور اسے خیر و شر کا علم بذریعہ وحی دے دیا جاتا۔ پھر اسے کہہ دیا جاتا کہ اس علم کو وہ دیگر افراد انسانیہ تک پہنچا دے۔ اور اسے ان انسانوں پر چھوڑ دے کہ وہ چاہے اس علم کی راہ نمائی میں زندگی بسر کریں اور چاہے اس کے خلاف راستہ اختیار کر لیں۔ اس طرح سلیم! خدا کی وحی بھی انسانوں تک پہنچ گئی۔ اور انسانی اختیار و ارادہ بھی بدستور باقی رہا۔ ان برگزیدہ انسانوں کو جن کے ذریعہ خدا کی وحی باقی افراد انسانیہ تک پہنچائی جاتی تھی، نبی یا رسول کہا جاتا ہے۔ وحی کے اس طریق جدید کے متعلق نوع انسان سے کہا گیا کہ اِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ رُسُلٌ مِّنْکُمْ یَقُصُّوْنَ عَلَیْکُمْ اٰیٰتِیْ فَمَنِ اتَّقٰی

وَاَصْلَحَ فَلَاخَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (۷/۳۵)۔ ”جب ایسا ھوگا کہ تمہارے پاس تم میں سے پیغامبر آئیں گے، جو ہمارے پیغامات تم تک پہنچائیں گے، سو جو لوگ ان قوانین کی نگہداشت کریں گے اور ان کے مطابق صلاحیت بخش کام کریں گے تو انہیں نہ کسی قسم کا خوف ھوگا نہ حزن“۔ جہاں تک انسان کے اختیار و ارادہ کا تعلق تھا اسے کہہ دیا گیا کہ قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (۱۸/۲۹)۔ ان سے کہہ دو کہ تمہارے نشو و نما دینے والے کی طرف سے حق آ چکا ھے۔ اب جس کا جی چاھے اسے اختیار کرے اور جس کا جی چاھے اس سے انکار کر دے۔ یہ کہہ دینا تو محض سمجھانے کی غرض سے ھے ورنہ یہ چیز وحی کے اس طریق کا لازمی نتیجہ ھے جو انسان کی صورت میں اختیار کیا گیا ھے۔ یعنی ان قوانین کے اس کی فطرت کے اندر نہ ھونے کے معنی ھی یہ ھیں کہ اسے اس کی آزادی حاصل ھے کہ وہ ان قوانین کو اختیار کرے یا اس سے انکار کر دے۔ اگر انسان کو اس امر کی آزادی دینا مقصود نہ ھوتا تو دیگر اشیائے کائنات کی طرح وحی کو اس کی فطرت کے اندر رکھ دیا جاتا۔ یہ مطلب ھے سلیم! لَآ اِكْرَاهَ فِی الدِّيْنِ کا۔ یعنی دین کے معاملہ میں کسی قسم کی زبردستی نہیں۔ زبردستی سے لایا ھوا ایمان، ایمان ھی نہیں ھوتا۔ ایمان وھی ایمان ھے جسے انسان خود اپنی مرضی اور ارادہ سے اختیار کرے۔ اپنے اختیار اور ارادے کے معنی یہ ھیں کہ انسان خود سوچ سمجھ کر ایک نتیجہ پر پہنچے۔ یہی وجہ ھے کہ قرآن غور و فکر اور سوچ بچار کی اس قدر تاکید کرتا ھے۔ اس کی دعوت علٰی وجہِ الْبصیرت ھے اور وہ اسے علٰی وجہِ الْبصیرت ھی اختیار کرنے کی تلقین کرتا ھے۔ تم دیکھو گے سلیم! کہ قرآن قدم قدم پر تقلید کی مخالفت کرتا

ہے۔ یہ اس لئے، کہ تقلید میں انسان اپنے غور و فکر سے کام نہیں لیتا بلکہ معاشرے میں جو عقائد و رسوم متوارث چلی آتی ہیں انہیں بلا سوچے سمجھے اختیار کر لیتا ہے۔ یہ در حقیقت معاشرے کو خدا بنا لینا ہے۔ تقلید کے متعلق یوں سمجھو کہ وہ (Society Divinised) ہوتی ہے، جس طرح جس جیز کو ضمیر کہا جاتا ہے وہ (Society Internalised) ہوتی ہے۔ اور تو اور، جو شخص خود قرآن کو بھی اندھا اور بہرہ بن کر قبول کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے مومن قرار نہیں دیتا۔ اس کا ارشاد ہے کہ مومن وہ ہیں اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيَاتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا (۲۵/۷۳)۔ جب اُن کے سامنے اُن کے رب کی آیات بھی پیش کی جاتی ہیں تو وہ ان پر بہرے اور اندھے بن کر نہیں گر پڑتے، غور و فکر کے بعد اُنہیں اختیار کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کفارِ عرب نبی اکرمؐ سے بار بار معجزات طلب کرتے تھے تاکہ وہ اُنہیں دیکھ کر ایمان لائیں، اور قرآن کی طرف سے بار بار اس کا انکار ہوتا تھا اور اُن سے کہا جاتا تھا کہ تم عقل و شعور کو کام میں لاؤ اور سوچ سمجھ کر اس کا فیصلہ کرو کہ جو کچھ تم سے کہا جاتا ہے وہ ٹھیک ہے یا نہیں۔ اگر تمہاری عقل و فکر کو ماؤف کرکے تم سے اطاعت کرانی ہوتی تو تمہیں بھی دیگر اشیائے کائنات کی طرح پیدا کر دیا جاتا۔ یعنی اس قانون کو تمہاری فطرت کے اندر رکھ دیا جاتا اور تم مجبوراً اس کی اطاعت کئے جاتے۔

تم نے غور کیا سلیم! کہ انسان کی تخلیق کس طرح دیگر اشیائے کائنات سے منفرد ہے۔ اور خیر و شر کے علم دینے کا جو طریق اس کے لئے اختیار کیا گیا ہے وہ کس طرح ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن کس قدر مقام تاسّف و حیرت ہے کہ خود ہمارے ہاں بھی یہ عقیدہ موجود ہے کہ خیر و شر

کی تمیز انسان کی فطرت میں رکھ دی گئی ھے ۔ اور انسان کی فطرت خود خدا کی فطرت پر متفرع ھے ۔ اس لئے اسلام دین فطرت ھے ۔ تم نے غور کیا سلیم ! که یه عقیده کس طرح مشیت کے اس سارے پروگرام کی تردید کر دیتا ھے جو اس نے انسانی تخلیق اور وحی بوساطت حضرات انبیائے کرام کی شکل میں اختیار کیا تھا ۔ فطرت انسانی کے متعلق یه عقیده قدیم فلسفه میں موجود تھا جھاں سے اسے مسلمانوں نے مستعار لے لیا اور اسے عین دین بنا دیا (اس کے جواز میں جو قرآنی آیات پیش کی جاتی ھیں ان کا صحیح مفهوم میں تمهیں اس خط میں بتا چکا ھوں جو ” فطرت انسانی “ کے ضمن میں تمهیں لکھا گیا تھا) دور حاضر کے فلسفه میں اسے (Transcendentalism) کهتے ھیں ۔ یعنی یه عقیده که انسان کے دل میں وجدانی طور پر حق و باطل کے امتیاز کا علم موجود ھے جو تجربات و مشاھدات کی رو سے حاصل نهیں کیا جا سکتا ۔ قریب قریب اسی کی دوسری شکل ھے جسے (Ontologism) بھی کها جاتا ھے ۔ یعنی یه عقیده که خدا اور اس کے تصورات کا علم ھر فرد انسانیه کے دل میں براہ راست موجود ھے ۔ یه عقائد در اصل وحی بوساطت انبیائے کرام (یا بالفاظ دیگر ایمان بالرسل) کے تصوّر کی مخالفت کے لئے وضع کئے گئے تھے ۔ لیکن مسلمانوں کی حالت یه ھے که وہ بھی ان عقائد کو سینے سے لگائے لگائے پھرتے ھیں اور نهیں سوچتے که اس سے سلسلۂ رشد و ھدایت بوساطت انبیائے کرام کی ساری عمارت نیچے آ گرتی ھے ۔ اس کے ساتھ ھی وہ دین میں جور و اکراہ کو بھی دین اسلام سمجھتے ھیں ۔ ذھنی اکراہ کے سلسله میں وہ تقلید کو دین کی بنیاد قرار دیتے ھیں اور قلبی اکراہ کے لئے مرتد کی سزا قتل بتاتے ھیں ۔ یعنی جو شخص (کسی وجه سے) دل سے دین کا قائل نهیں رھتا اسے بزور شمشیر دین کا قائل رکھنا چاھتے ھیں ۔ یه تمام عقائد قرآن کریم کو پس پشت ڈال دینے

کا نتیجہ ہیں۔

---: o :---

اب ایک قدم اور آگے بڑھو۔ ایک اور خصوصیت بھی ہے جس کی بنا پر انسان دیگر اشیائے کائنات سے منفرد ہے، اور وہ ہے عقل و فکر کی صلاحیت۔ کائنات میں عقل و فکر انسان کے علاوہ کسی اور کو نہیں دی گئی۔ اصل یہ ہے کہ جب قانونِ زندگی کو کسی شے کی فطرت کے اندر رکھ دیا جائے اور وہ اس کی اطاعت پر مجبور ہو جائے تو اسے عقل و فکر کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ عقل و فکر کی ضرورت اسے ہوتی ہے جسے کوئی مسلک اپنی مرضی اور ارادے سے اختیار کرنا ہو۔ عقل و فکر کی نشو و نما علم اور تجربہ سے ہوتی ہے۔ اور چونکہ دیگر اشیائے کائنات عقل و فکر سے عاری ہیں اور اپنے فطری تقاضوں سے اس راستہ پر چلی جا رہی ہیں جو ان کے لئے تجویز کر دیا گیا ہے اس لئے انہیں اس علم کے علاوہ جو ان کی فطرت میں رکھ دیا گیا ہے، کسی اور علم کی ضرورت نہیں۔ ملائکہ کا یہ اعتراف کہ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا (۲/۳۲) (ہمیں اس علم کے علاوہ جو تو نے ہمیں دیا ہے اور کسی بات کا علم نہیں) اسی حقیقت کا ترجمان ہے۔ بکری کا بچہ اپنی پیدائش کے ساتھ ہی وہ سب کچھ جانتا ہے جس کی اسے آخری عمر تک ضرورت ہے۔ اسے اپنی زندگی کے تقاضوں کا علم حاصل کرنے کے لئے کسی اسکول میں جانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن انسانی بچہ بالکل کورا پیدا ہوتا ہے۔ اور اسے ساری زندگی علم حاصل کرنا پڑتا ہے۔ جو اس حقیقت سے واقف ہیں ان کے دل میں ہر وقت یہ آرزو موجزن رہتی ہے کہ رَبِّ زِدْنِیْ عِلْماً (۲۰/۱۱۹)۔ انسانی عقل و فکر علم و تجربے سے پختگی حاصل کرتی ہے۔ انسانی بچہ کو علم ماں باپ سے ورثہ میں

نہیں ملتا ۔ ایک ایم ، اے پاس باپ کے بیٹے کو بھی اسی طرح الف بے سیکھنی پڑتی ھے جس طرح ایک ان پڑھ باپ کے بچے کو ۔ لیکن ھر انسانی نسل (Generation) اس علم و تجربه کی اکتساباً وارث بن سکتی ھے جو سابقه نسلوں سے منتقل ھوتا چلا آ رھا ھے ۔ یہی وجه ھے که علم و تجربه کے میدان میں ھر نئی نسل سابقه نسل سے ایک قدم آگے ھوتی ھے ۔ مثلاً ھم بیسویں صدی کے انسان ھیں ۔ ھم نے اپنی زندگی کو اس مقام سے شروع کیا ھے جس مقام تک آنیسویں صدی کا انسان پہنچا تھا ۔ یعنی آنیسویں صدی کے انسان کا آخری مقام ھمارے سفر زندگی کا نقطۂ آغاز تھا ۔ ھم آنیسویں صدی کے انسان سے اتنا ھی آگے ھیں جتنا فاصله ھم نے بیسویں صدی میں خود طے کیا ھے ۔ یعنی ھمارا علم مجموعه ھے (۱) اس علم کا جو آنیسویں صدی تک سابقه انسانی نسلوں نے حاصل کیا اور (۲) اس علم کا جو ھم نے بیسویں صدی میں خود حاصل کیا ۔ چونکه انسانی عقل و فکر ، علم و تجربه کی بنا پر پختگی حاصل کرتی ھے اس لئے بالفاظ دیگر یوں سمجھو که ھر نئی نسل کا انسان عقل و فکر کے اعتبار سے اپنی سابقه نسل سے آگے ھوتا ھے بشرطیکه اس کی قوم حصول علم میں متواتر کوشاں رھے (اسے اچھی طرح سمجھ لینا سلیم ! که یه کچھ میں نے اکتسابی علم کے متعلق کہا ھے ۔ وحی کے متعلق نہیں ۔ وحی کو انسان کسب و محنت سے حاصل نہیں کر سکتا ۔ یه علم نبی کو اسی طرح وھبی طور پر عطا ھوتا ھے جس طرح خارجی کائنات میں خدا کی وحی وھبی طور پر ھوتی ھے) ۔ اب اور آگے بڑھو ۔

وحی کا کام یه ھے که وہ عقل انسانی کی راہ نمائی کرتی ھے ۔ اب ظاھر ھے که جس قدر انسان کی عقل خام ھوگی اسے اسی قدر تفصیلی راہ نمائی کی ضرورت ھوگی ۔ اگر تمہیں کسی بچه کو راسته بتانا ھو تو اس کے لئے تمہیں

بڑی تفصیل سے کام لینا ہوگا۔ لیکن ایک پختہ عقل کے انسان کے لئے صرف اتنا ہی کافی ہوگا کہ جہاں دوراہا آئے وہاں نشان کا کھمبا (Sign post) لگا دیا جائے جس پر یہ اشارہ موجود ہو کہ دائیں ہاتھ کی سڑک کس طرف جاتی ہے اور بائیں ہاتھ کی کس طرف۔ وحی خداوندی نے بھی اسی تقاضا کو سامنے رکھا اور ہر دَور کے انسان کو اس کی علمی اور عقلی سطح کے مطابق تفصیلی راہ نمائی دی۔ مثلاً حضرت نوحؑ کے زمانہ میں یہ بات بھی بذریعہ وحی بتانی پڑی کہ سیلاب سے بچنے کے لئے کشتی کس طرح بنانی چاہئے۔ حضرت نوحؑ سے کہا گیا کہ وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا (۱۱/۳۷)۔ ہماری زیر نگرانی ہماری وحی کے مطابق کشتی بناؤ۔ پھر جوں جوں انسانی علم و عقل میں پختگی آتی گئی ان تفاصیل میں کمی ہوتی چلی گئی۔

اس مقام پر اس بات کو اچھی طرح سمجھ لو سلیم! کہ بعض امور وہ ہیں جو انسانی عقل کی حد سے یکسر ماوراء ہیں۔ یعنی انسانی عقل خواہ اپنی انتہا تک بھی کیوں نہ پہنچ جائے وہ امور اس کے دائرہ سے باہر رہتے ہیں۔ دوسرے امور وہ ہیں جو ایک زمانہ میں انسانی عقل کی حد سے آگے ہوتے ہیں، لیکن جب انسانی عقل آگے بڑھ جاتی ہے تو وہ امور اس کے دائرے کے اندر آ جاتے ہیں۔ اول الذّکر امور وہ ہیں جو ہر نبی کی طرف نازل شدہ وحی میں یکساں طور پر آتے رہے اور ہر زمانہ کے انسان کو ان کی ضرورت رہی اور ضرورت رہے گی۔ لیکن دوسری قسم کے امور وہ ہیں جن کی تفاصیل میں کمی بیشی ہوتی رہی۔ یعنی جوں جوں انسان کی عقل آگے بڑھتی رہی، ان تفاصیل میں کمی ہوتی چلی گئی۔

یہ سلسلۂ وحی اس طرح مسلسل آگے بڑھتا چلا آیا۔ تاآنکہ مشیت کے پروگرام میں اس دوسرے عظیم انقلاب کا وقت آ گیا جس کی طرف میں نے شروع میں اشارہ کیا ہے۔ اب انسانیت کے لئے اس دور میں داخل ہونے کا وقت آ گیا جس میں اس کی عقل نے بالغ ہو کر پختگی حاصل کر لینی تھی۔ چنانچہ اس دور کے آغاز میں کیا یہ گیا کہ ان تمام امور کے متعلق، جن تک پہنچنا عقل انسانی کے لئے ممکن نہیں ہے یا جن تک پہنچنے کے لئے اسے قرنہا قرن درکار ہیں، وحی کی راہ نمائی اصولی طور پر دے دی گئی۔ اس وحی کو قرآن کی دفتین میں ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا گیا اور اس کے بعد سلسلۂ وحی یکسر بند کر دیا گیا۔ یعنی نبوت کا خاتمہ ہو گیا۔ یہ ہے سلیم! دوسرا عظیم انقلاب جو اس کارگۂ کائنات میں رونما ہوا۔ یعنی پہلا انقلاب تو یہ تھا کہ وحی کو (اشیائے کائنات کی طرح) انسانی فطرت میں داخل کرنے کے بجائے اسے ایک فرد کے ذریعہ باقی انسانوں تک پہنچانے کا طریق اختیار کیا گیا۔ اور دوسرا انقلاب یہ تھا کہ وحی کی اصولی تعلیم کو منضبط کرکے، مزید سلسلۂ وحی کو ختم کر دیا گیا۔ سوچو سلیم! کہ سلسلہ تخلیق کائنات میں یہ انقلاب کس قدر عظیم ہے!

آگے بڑھنے سے پہلے اس مقام پر ایک اور نقطہ کا سمجھ لینا بھی ضروری ہے۔ میں نے اوپر کہا ہے کہ بعض امور وہ ہیں جن تک عقل انسانی از خود پہنچ ہی نہیں سکتی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان حقائق کا دریافت کر لینا عقل انسانی کے بس کی بات نہیں۔ لیکن عقل انسانی اپنے تجرباتی طریق سے ان حقائق کی صداقت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتی ہے۔ مثلاً خدا کی صفات اور مستقل اقدار کیا ہیں، عقل انسانی انہیں از خود معلوم نہیں کر سکتی۔ یہ صرف وحی بتا سکتی ہے۔ لیکن ان صفات خداوندی کا کائنات میں ظہور کس طرح

ھوتا ھے اور مستقل اقدار کی رو سے کیا کیا تعمیری نتائج مرتب ھوتے ھیں، عقل انسانی ان باتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتی ھے۔ یہ مطلب ھے قرآن کی اس آیۂ جلیلہ کا جس میں کہا گیا ھے کہ سَنُرِیْهِمْ اٰیَاتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَ فِیْ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ (۴۱/۵۳)۔ ھم انہیں اپنی نشانیاں انفس و آفاق میں دکھاتے جائیں گے تا آنکہ یہ بات نکھر کر ان کے سامنے آ جائے کہ قرآن میں بیان کردہ امور فی الواقعہ حقیقت ثابتہ ھیں۔

اس ضمنی توضیح کے بعد پھر اصل موضوع کی طرف آؤ۔ تم نے غور کیا ھے سلیم! کہ یہ انقلابات کس حقیقت کا اعلان تھے۔ پہلا انقلاب اس امر کا اعلان تھا کہ انسان اس تمام کائنات میں منفرد اور واجب التکریم واقع ھوا ھے۔ وَ لَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْ آدَمَ۔ اور دوسرا انقلاب اس بلند حقیقت کا اعلامیہ تھا کہ اب انسانیت، عمر بلوغت اور سن رشد و تمیز کو پہنچ رھی ھے۔ اب یہ اس دور میں پہنچ رھی ھے جہاں اس کی عقل پختہ اور اس کا علم محکم ھوتا چلا جائے گا۔ اب اسے بچوں کی طرح ذرا ذرا سی تفاصیل سمجھانے کی ضرورت نہیں رھی۔ اب بچہ سیانا ھو گیا ھے، اب یہ سمجھدار ھو گیا ھے، اب اسے صرف اصولی راہ نمائی کی ضرورت ھے۔ ان اصولوں کی روشنی میں یہ اپنے لئے ضروری تفصیلات خود مرتب کرے گا۔ اصول نا قابل تغیر ھوتے ھیں۔ لیکن تفاصیل ھر دور میں بدلتی رھتی ھیں۔ اس لئے ان تفاصیل کو اس کی سمجھ پر چھوڑ دیا گیا ھے۔ اس لئے کہ اب یہ بچہ ماشاء اللہ جوان ھو گیا ھے۔

یہ تھا سلیم! ختم نبوت کا مفہوم۔ یہ تھا اس کا مقصد۔ اگر تم اس نقطۂ نگاہ سے انسانی تاریخ پر نگاہ ڈالو تو یہ حقیقت ابھر کر سامنے آ جائے گی کہ نبی اکرمؐ شاہراہِ کاروانِ انسانیت پر ایک حد فاصل کے طور پر تشریف فرما ھیں۔

حضورص سے پہلے ادوار کی انسانیت اپنے بچپن کے زمانہ میں تھی ۔ اس کے بعد اس کی جوانی کا زمانہ شروع ھو گیا ۔ انسانی عقل و علم نے قرآن سے پہلے کے چار پانچ ھزار سال میں اتنی ترقی نہیں کی تھی جتنی ترقی بعد کے تیرہ چودہ سو سال میں کی ھے ۔ جوں جوں زمانہ آگے بڑھتا جا رھا ھے یہ ترقی برق رفتار ھوتی چلی جا رھی ھے ۔ تم گذشتہ چالیس پچاس سال پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالو اور پھر سوچو کہ اتنے قلیل سے عرصہ میں ھی دنیا کہاں سے کہاں چلی گئی ھے ۔ کیا یہ سب تبدیلیاں اس حقیقت کی شاھد نہیں ھیں کہ حضورص کی بعثت سے انسانیت ایک نئے دور میں داخل ھو گئی ھے ؟ کیا یہ تمام شہادات ختم نبوت ھی کی مؤید نہیں ھیں ؟

لیکن سلیم ! جس طرح مسلمانوں نے پہلے انقلاب کی اھمیت کو صحیح طور پر نہ پہچانا ، اسی طرح یہ اس دوسرے انقلاب کی اھمیت کا بھی اندازہ نہیں لگا سکے ۔ ھم نے نظری طور پر تو ختم نبوت کو اپنا جزو ایمان سمجھا ، لیکن عملاً قدم قدم پر اس سے انکار کرتے چلے گئے ۔ چنانچہ ھمارے ھاں یہ عقیدہ موجود ھے کہ نبی اکرمص کے بعد منتخب افراد کو خدا کی طرف سے براہ راست علم حاصل ھونے کا سلسلہ جاری ھے ۔ کہیں یہ علم بالکل نبی کی طرح وھبی طور پر ملتا ھے (جیسا کہ شیعہ حضرات کے ھاں ائمہ کرام کے متعلق عقیدہ ھے) اور کہیں اسے اکتسابی طور پر حاصل کیا جا سکتا ھے ۔ جیسے اولیائے کرام کا کشف والہام* ۔ اسی امکان کو آگے بڑھا کر ھمارے زمانہ میں مرزا غلام احمد

---

*جیسا کہ اس سے پہلے بھی بتایا جا چکا ھے انسان کے اندر ایسی صلاحتیں موجود ھیں جنہیں نشو و نما دینے سے اس کے اندر خاص قسم کی قوت بیدار ھو

بقیہ حاشیہ بر صفحہ ۱۰۳

نے وهبی اور اکتسابی ڈانڈے ملا دئے اور یه دعویٰ کر دیا که میں اکتسابی طور پر مقام نبوت تک پهنچ چکا هوں۔ اسی امکان سے هر صدی کے سر پر ایک مجدد کا عقیده وضع کیا گیا اور اسی سے مهدی آخری الزمان کا عقیده۔ یه عقائد ختم نبوت کی حقیقت کبریٰ کا صحیح اندازه نه کر سکنے کا نتیجه هیں۔ اور مهر نبوت توڑ دینے کا ذریعه۔ ان کے علاوه ایک اور عقیده بهی هے جو اس انقلاب عظیم کا صحیح اندازه نه لگانے کا نتیجه هے جو ختم نبوت کے اعلان سے کائنات میں رو نما هوا تها۔ تم نے دیکھ لیا سلیم! که ختم نبوت کا مفهوم یه تها که اب انسانوں کو صرف اصولی راه نمائی کی ضرورت هے، ان اصولوں کی روشنی میں تفصیلات وه خود متعین کریں گے۔ لیکن همارے هاں یه عقیده پیدا هو گیا (اور اسی عقیده پر مسلمانوں کا عمل چلا آ رها هے) که زندگی کے هر معامله کی هر تفصیل بهی پهلے سے متعین کر دی گئی هے اور ان تفاصیل میں اب کسی قسم کا رد و بدل نهیں هو سکتا۔ یه عقیده اس مقصد عظیم کے منافی هے جس کے لئے ختم نبوت کا انقلاب عمل میں لایا گیا تها۔ قرآن نے اسی حقیقت کی طرف توجه

بقیه حاشیه از صفحه ۱۰۲ :

جاتی هے۔ هو سکتا هے که انسان اس قوت سے بعض ایسی باتیں معلوم کر لے جو ان لوگوں کے لئے ممکن نه هوں جنهوں نے اپنی ان صلاحیتوں کو (Develop) نه کیا هو۔ اس ذریعۂ معلومات کو وجدان یا (Intution) کهتے هیں۔ لیکن یه علم نه خدا کی طرف سے براه راست حاصل شده هوتا هے نه اسے وحی یا نبوت سے کوئی تعلق هوتا هے۔ یه ایک فنی چیز هے۔ اسے دین سے بهی کوئی تعلق نهیں هوتا حتیٰ که اس کے لئے مسلمان هونے کی شرط بهی نهیں هوتی۔ جو انسان چاهے ان صلاحیتوں کو نشو و نما دے سکتا هے۔

دلائی تھی جب یہ کہا تھا کہ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَاتَسْئَلُوْا عَنْ اَشْیَآءَ اِنْ تُبْدَ لَکُمْ تَسُؤْکُمْ وَاِنْ تَسْئَلُوْا عَنْھَا حِیْنَ یُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَکُمْ عَفَا اللّٰہُ عَنْھَا وَ اللّٰہُ غَفُوْرٌ حَلِیْمٌ ۔ قَدْ سَاَلَھَا قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِکُمْ ثُمَّ اَصْبَحُوْا بِھَا کٰفِرِیْنَ ($\frac{۵}{۱۰۱—۱۰۲}$) ۔ یعنی خدا نے قرآن میں جن تفصیلات کو بیان نہیں کیا تو یہ بھول چوک کی وجہ سے نہیں، ایسا دانستہ کیا گیا ہے ۔ ان تفاصیل کا وحی کی رو سے متعین کرنا مقصود ہی نہ تھا ۔ اس لئے اے جماعت مومنین تم ان تفاصیل کے متعلق خواہ مخواہ پوچھنا نہ شروع کر دیا کرو ۔ اس وقت وحی کا سلسلہ جاری ہے ۔ اگر تمہارے دریافت کرنے پر ان چیزوں کو بیان کیا گیا تو تم مشکل میں پھنس جاؤ گے ۔ وحی کا سلسلہ بند ہو جانے کے بعد کوئی اور نبی آئے گا نہیں اور وہ تفاصیل بھی قرآن کے اصولوں کی طرح ہمیشہ ہمیشہ غیر متبدل قرار پا جائیں گی ۔ لیکن زندگی کے تقاضے بدلتے رہتے ہیں ۔ اس لئے یہ تفاصیل ان کا ساتھ نہیں دے سکیں گی ۔ اس طرح تم انہیں نباہ نہیں سکو گے ۔ تم سے پہلے بھی ایک قوم نے ایسا ہی کیا تھا (کہ خواہ مخواہ ایسی تفاصیل پوچھنی شروع کر دیں جن کا غیر متبدل رکھا جانا مقصود نہ تھا) ۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ جب وہ تفاصیل، زندگی کے بدلنے والے تقاضوں کا ساتھ نہ دے سکیں تو وہ ان سے انکار کر بیٹھے ۔ اللہ کو چونکہ تمہاری حفاظت مقصود ہے ۔ اس لئے تمہارے پوچھنے کے باوجود اس نے ان تفاصیل کو بیان نہیں کیا ۔ اس کے علم کا یہی تقاضا تھا ۔

تم نے غور کیا سلیم! کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ ختم نبوت سے مقصود یہ ہے کہ تم زندگی کی چھوٹی چھوٹی جزئیات

کے لیے وحی کی راہ نمائی کی طرف آنکھیں لگا کر نہ بیٹھ رہا کرو ۔ ان کے متعلق عقل و فکر سے کام لیا کرو ۔ اور وحی کے اصولوں کی روشنی میں انہیں خود متعین کیا کرو ۔ یہی وہ تفاصیل تھیں جن کے متعین کرنے کے لئے خود نبی اکرم ص سے کہا گیا کہ وَ شَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ($\frac{۳}{۱۵۸}$) ۔ یعنی ان کا فیصلہ اپنی جماعت کے مشورے سے کر لیا کرو ۔ لیکن بعد کے مسلمانوں نے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا اور جن تفاصیل کو خدا نے دانستہ غیر متعین چھوڑا تھا انہیں متعین کر کے ہمیشہ کے لئے غیر متبدل قرار دے دیا ۔ اس کا نتیجہ کیا ہوا ؟ وہی جو اس قوم کی صورت میں ہوا تھا جس کی طرف قرآن نے اشارہ کیا ہے ۔ اسے سمجھنے کے لئے تم اس بات پر غور کرو کہ ہماری شریعت میں (یعنی ان تفاصیل میں جنہیں قرآن نے غیر متعین چھوڑا تھا) سینکڑوں باتیں ایسی ہیں جو زمانے کے بدلنے والے تقاضوں کا ساتھ نہیں دیتیں ۔ ہمارے ارباب شریعت کا تقاضا ہے کہ وہ زمانہ کے تقاضوں کا ساتھ دیں یا نہ دیں ، انہیں اسی طرح سے ماننا اور ان پر اسی طرح سے عمل کرنا ہوگا ۔ کیونکہ (بقول ان کے) وہ شریعت الٰہیہ کے احکام ہیں جن میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی ۔ نتیجہ اس کا یہ کہ قوم کے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کے دل میں خود دین کے متعلق طرح طرح کے شبہات پیدا ہو رہے ہیں اور (اگرچہ وہ ابھی اعلانیہ اس کا اقرار نہیں کرتا لیکن) دل میں وہ خود دین کے منجانب اللہ ہونے سے انکار کر رہا ہے ۔ تمہیں یاد ہے گذشتہ عید پر خالد نے کیا کیا تھا ؟ پچھلی عید پر اسے جو جوتا لے کر دیا گیا تھا ۔ وہ اس کے پاؤں میں تنگ ہو گیا تھا (اس کا پاؤں ماشاء اللہ دن بدن بڑھ رہا ہے اور جوتا ویسے کا ویسا رہتا ہے) اس کی امی کا اصرار تھا کہ وہ وہی جوتا پہنے ۔ چنانچہ اس نے طوعاً و کرھاً اس وقت تو وہ جوتا پہن لیا ۔ لیکن واپسی پر اسے عید گاہ میں کھو آیا ۔ میری آنکھیں سلیم ! اس

خطرے کو دن بدن قریب آتے دیکھ رہی ہیں۔ ہم اپنے نوجوانوں کو تنگ جوتا پہننے پر مجبور کر رہے ہیں۔ یہ نہیں کرتے کہ جوتے کو کابوت دے کر پاؤں کے مطابق بنا دیں۔ نوجوان اس وقت کسی نہ کسی مجبوری کی بناء پر اس جوتے کو پہنے ہوئے۔ لیکن نمعلوم وہ کس وقت اسے اتار کر کھڈ میں پھینک دے۔ وہ ایسا کرنے میں سچا ہوگا۔ ایسے جوتے کو جس سے پاؤں ہر وقت شکنجے میں جکڑے رہیں، کوئی کب تک پہنے رکھ سکتا ہے؟ تمہیں یاد ہے تمہاری نانی اماں ایسے موقع پر کیا کہا کرتی تھی۔ "بھٹ پڑے وہ سونا جس سے ٹوٹیں کان"۔ مجھے ڈر ہے کہ ہمارا نوجوان طبقہ کسی دن اس مثل ہی کو نہ دھرا دے۔ دین اس لئے آیا تھا کہ انسانی زندگی میں آسانیاں پیدا کرے۔ رسول اللہؐ کی بعثت کا مقصد قرآن نے یہ بتایا ہے کہ وَ یَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَ الْاَغْلَالَ الَّتِیْ کَانَتْ عَلَیْهِمْ (۷/۱۵۷)۔ وہ اس بوجھ کو اتار دے گا جس کے نیچے انسانیت دبی چلی آ رہی ہے، وہ ان زنجیروں کو کاٹ کر پھینک دے گا جس میں انسان اپنی خود ساختہ شریعت اور نظام کے ہاتھوں جکڑا ہوا ہے۔ ختم نبوت نے اس مقصد کو پورا کر دیا۔ اس نے انسان کو صرف ان حدود اللہ (Boundary Lines) کا پابند رکھا جو وحی کے غیر متبدل اصولوں نے اس کے معاشرے کے ارد گرد کھینچی تھیں۔ ان حدود کے اندر اسے آزاد چھوڑ دیا کہ وہ اپنے اپنے زمانہ کے تقاضوں کے مطابق جزئیات خود متعین کرے۔ لیکن ہماری خود ساختہ شریعت نے ان ٹوٹی ہوئی زنجیروں کے ٹکڑوں کو ایک ایک کر کے مژگان عقیدت سے اٹھا لیا۔ اور انہیں پہلے سے بھی زیادہ سخت زنجیروں میں ڈھال کر ملت کو ان میں جکڑ دیا۔ اور اس طرح اس امت کو جس نے، اقطار السموت والارض، سے بھی آگے نکل

جانا تھا ایسا زمین گیر بنا دیا کہ اس کی گردن ہی اوپر کو نہیں اٹھ سکتی۔ قرآن کے الفاظ میں إِنَّا جَعَلْنَا فِي أَعْنَاقِهِمْ أَغْلَالًا فَهِيَ إِلَى الْأَذْقَانِ فَهُمْ مُقْمَحُونَ۔ وَجَعَلْنَا مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ سَدًّا وَمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَأَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُونَ (٣٦/٨-٩) گردن میں طوق و سلاسل اور آگے پیچھے دیواریں جن سے کچھ نظر ہی نہ آئے۔ ہم نے ان زنجیروں میں خود اپنے آپ ہی کو نہیں جکڑا بلکہ قرآن کو بھی اپنی خود ساختہ تفاسیر کے تابع رکھ کر اس بری طرح سے جکڑ دیا کہ وہ ایک قدم بھی آزادانہ نہیں اٹھا سکتا۔ تم نے سلیم! اُس دن اس بھینس کو دیکھا تھا جو اس بری طرح سے چل رہی تھی۔ اُس کے مالک نے کیا یہ تھا کہ ایک چھوٹی سی رسی ایک طرف اس کے سینگ سے اور دوسری طرف اس کے پاؤں سے باندھ دی تھی۔ رسی اتنی چھوٹی تھی کہ اس سے اس بیچاری کا سر بالکل پاؤں کے قریب آ گیا تھا۔ وہ اس رسی سے اس بری طرح جکڑ رہی تھی کہ وہ ایک قدم بھی اپنی پوری رفتار سے نہیں اٹھا سکتی تھی۔ وہ اسی رفتار سے چل سکتی تھی جس رفتار سے اسکا مالک چاہتا کہ وہ چلے۔ اس کی ساری آزادی سلب ہو چکی تھی۔ اس انداز سے جکڑے ہوئے جانور کو عرب ''مہجور'' کہتے ہیں۔ مہجور کے اس مفہوم کو سامنے رکھو اور پھر قرآن کریم کی اس آیت کا مطلب سمجھو جس میں کہا گیا ہے کہ حضور نبی اکرمؐ خدا سے فریاد کریں گے کہ يٰرَبِّ إِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوا هٰذَا الْقُرْآنَ مَهْجُورًا (٢٥/٣٠) اے میرے نشو و نما دینے والے میری قوم نے اس قرآن کو مہجور بنا رکھا تھا۔ ایسا کرنے والوں کے متعلق اس سے اگلی آیت میں ہے وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِنَ الْمُجْرِمِينَ۔ اور اس

طرح ہم نے مجرمین کے طبقہ میں سے ہر نبی کے دشمن بنا دئے۔ یعنی ایسا کرنے والے مجرم ہیں اور نبوت کے دشمن۔ اس کا علاج کیا ہے؟ یہ کہ وَكَفٰى بِرَبِّكَ هَادِيًا وَّ نَصِيْرًا ($\frac{۲۵}{۳۱}$)۔ خدا کی راہ نمائی اور نصرت کو کافی سمجھا جائے اور انسانوں کی ان خود ساختہ جکڑ بندیوں کو توڑ کر رکھ دیا جائے جنہیں وہ شریعت خداوندی کے نام سے آگے بڑھاتے ہیں اور جن سے نجات دلانے کے لئے حضور خاتم النبینص تشریف لائے تھے۔

———:o:———

تصریحات بالا سے یہ حقیقت تمہارے سامنے آگئی ہوگی سلیم! کہ:

۱۔ کائنات میں ہر شے کی طرف خدا کی وحی براہ راست ہوتی ہے۔ یعنی ہر شے کا قانون زندگی اس شے کے اندر رکھ دیا جاتا ہے۔ یہ قانون اس شے کی فطرت کہلاتا ہے۔

۲۔ جس شے کی فطرت میں کوئی قانون رکھ دیا جائے وہ اس قانون کی اطاعت پر مجبور ہوتی ہے۔ اسے اس سے سرتابی کا اختیار ہی نہیں ہوتا۔ یہ وجہ ہے کہ کائنات میں کسی شے کو اختیار و ارادہ حاصل نہیں۔

۳۔ انسان کی تخلیق دیگر اشیائے کائنات سے بالکل مختلف انداز میں ہوئی ہے۔ اُسے اختیار و ارادہ دیا گیا ہے۔ اسی وجہ سے اُس کا قانون زندگی اس کی فطرت کے اندر نہیں رکھا گیا۔ اُس کی طرف خدا کی وحی حضرات انبیائے کرامؑ کی وساطت سے آتی رہی ہے۔ یعنی اس نوع کے ایک منتخب فرد کی وساطت سے دیگر افراد تک وحی پہنچائی جاتی رہی ہے۔

۴۔ وحی کے اس منفرد طریق کے علاوہ انسان کو عقل و بصیرت بھی عطا کی گئی ہے ۔ وحی کا کام یہ ہے کہ وہ انسانی عقل کی راہ نمائی کرے ۔

۵۔ جس قدر انسان کی عقل خام تھی اسی قدر وحی خداوندی زیادہ سے زیادہ تفصیلی احکام دیتی تھی ۔ جوں جوں اس کی عقل میں پختگی اور علم میں وسعت آتی جاتی تھی یہ تفاصیل کم ہوتی جاتی تھیں ۔ تا آنکہ

۶۔ وہ دور آ گیا جس میں انسانی عقل بلوغت کی حد میں داخل ہو گئی ۔ اس وقت خدا کی طرف سے آخری وحی آئی اور نوع انسان کی مکمل راہ نمائی کے لئے جو کچھ دیا جانا مقصود تھا ، اسے اصولی طور پر قرآن کے اندر محفوظ کر کے وحی کا سلسلہ بند کر دیا گیا ۔ اب کسی انسان کو خدا کی طرف سے براہ راست علم حاصل نہیں ہو سکتا ۔ قرآن کے اصولوں کی روشنی میں مختلف زمانوں کے تقاضوں کے مطابق تفاصیل کا مرتب کرنا انسان کی عقل و بصیرت پر چھوڑ دیا گیا ۔ کیونکہ یہ تقاضے بدلتے رہتے ہیں ۔

اس سے واضح ہے کہ تمام خارجی کائنات کے مقابلہ میں انسان کی حیثیت منفرد ہے ۔ اور ختم نبوت کے بعد کاروان انسانیت ایک نئی منزل میں داخل ہو گیا ہے جس میں انسان کی خود اعتمادی پر زیادہ سے زیادہ زور دیا گیا ہے اور اس کی آزادی کو حدود اللہ کے علاوہ کسی اور چار دیواری سے محدود نہیں کیا گیا ۔ یہ ہے سلیم ! تمہارے سوال کا جواب ۔ اچھا اب میں رخصت ہوتا ہوں ۔ وہ دیکھو سامنے کی پہاڑی پر سورج کی آخری کرن برف آلود چوٹی کو بوسہ دے

کر صبح تک کے لئے رخصت ہو گئی۔ ان چوٹیوں پر شام و سحر کے یہ مناظر کس قدر پر کیف ہیں، اور جو کچھ غالب نے کہا تھا اس کی کیسی حسین تفسیر کہ

وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد
ہزار بار برو صد ہزار بار بیا

پرویز
جون ۱۹۵۶ء

اکیسواں خط

(عید میلاد النبی)

سلیم بیٹا ! اللہ تمہیں خوش رکھے اور تمہارے ذوقِ قرآنی میں برکت عطا فرمائے۔ رفتہ رفتہ تمہاری نگاہ کس قدر صاف اور تمہاری بصیرت کس قدر نورانی ھوتی جاتی ھے۔ قرآن کو غور و فکر سے سمجھنے کا یہ لازمی نتیجہ ھے۔ وہ خود نور (روشنی) ھے اور انسان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ھے۔

جیسا کہ میں نے تمہیں ایک مرتبہ پہلے بھی لکھا تھا (اور یہ غالباً شروع ۱۹۵۳ء کی بات ھے)، میرے نزدیک دنیا کے لئے جشنِ مسرّت کی تقریبات دو ھی ھیں۔ ایک نزول قرآن کی عید اور دوسری عید میلاد النبیؐ۔ اور یہ دونوں تقریبات بھی ایک ھی سکہ کے دورخ اور ایک ھی اصل کی دو شاخیں ھیں، اس لئے کہ نہ رسول اللہؐ کو قرآن سے الگ کیا جا سکتا ھے اور نہ ھی قرآن کو رسول اللہؐ سے الگ۔ قرآن، قلبِ محمّدیؐ پر نازل شدہ وحیِ خداوندی کا نام ھے اور رسول اللہؐ قرآنی سیرت کے درخشندہ پیکر۔ یہی وجہ ھے کہ قرآن نے صرف احکام و قوانین ھی عطا نہیں کئے بلکہ سیرتِ محمدیہؐ کے اصولی

گوشوں کو بھی اپنے دامن میں محفوظ کر لیا ہے۔

تم نے پوچھا یہ ہے کہ رسالتِ محمدیہؐ کا مقصود کیا ہے؟ اس نے نوعِ انسانی کو کیا دیا ہے؟ اس کا وہ کونسا کارنامہ ہے جس کی وجہ سے حضورؐ کا اسم گرامی، محسنینِ عالمِ انسانیت کی فہرست میں سرِ عنوان چمکتا دکھائی دیتا ہے؟ اس سوال کے تفصیلی جواب میں تو ضخیم مجلدات لکھی جاسکتی ہیں (اور خود میری کتاب ”معراج انسانیت“ بھی اسی سوال کے جواب کی کوششِ ناتمام ہے)۔ لیکن قرآن نے ان تمام تفاصیل کو جس حسن و خوبی سے ایک فقرہ میں سمٹا کر رکھ دیا ہے، جب نگۂ بصیرت اس پر غور کرتی ہے تو اس پر والہانہ وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ سورۂ اعراف میں بعثتِ محمدیؐ کی غایت و مقصود کا ذکر کرتے ہوئے قرآن نے کہا ہے کہ

وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ (۷/۱۵۶)۔

وہ نوعِ انسانی کے سر سے تمام بوجھ اتار کر رکھ دے گا جس کے نیچے وہ دبی ہوئی چلی آرہی ہے اور ان تمام زنجیروں کو توڑ دے گا جن میں وہ جکڑی ہوئی ہے۔ یہ ہے سلیم! بعثتِ محمدیہؐ کی وہ عظیم غایت، جسے قرآن نے اس ارتکاز و اختصار سے ان چند الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ تم اگر غور کرو گے تو یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجائے گی کہ رسالتِ محمدیہؐ ایک حدِ فاصل ہے، زمانۂ قدیم اور دورِ جدید میں۔ اس سے پہلے کی انسانی تاریخ در اصل ایک مسلسل داستان ہے ان گراں بار سلوں کی جن کے نیچے انسانیت بری طرح دب رہی تھی اور ان اطواق و سلاسل کی جن میں اس کا بند بند جکڑا ہوا تھا، بایں نمط کہ وہ اپنی مرضی سے ایک قدم ادھر ادھر نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ زنجیریں وہ تھیں جن میں انسان کا دل اور دماغ دونوں ماخوذ تھے۔ ان سے نہ اس کے ذہن

میں صحیح فکر پرورش پا سکتی تھی ، نہ ھی اس کے سینے میں حسین و خوشگوار جذبات کی بالیدگی ممکن تھی ۔ قصۂ بنی اسرائیل میں دیکھو ، قرآن نے ان مسیطرانِ نوعِ انسانی کا تذکرہ کس شرح و بسط سے کیا ہے جو انسانی قلب و دماغ پر بُری طرح مسلّط رہتے ھیں ۔ فرعون ، استبداد ملوکیّت کا مُجسّمہ (کہ جس کا نام آج تک بطور ضرب المثل استعمال ھوتا ہے) ھامان ، مذھبی پیشوائیت کی دسیسہ کاریوں کا نمایندہ (جس کی سحر کاری کی بنیاد پر قصرِ فرعونیت استوار تھا) اور قارون ، سرمایہ داری کی لعنت کا نمایندہ (جس نے خود اپنی قوم کے لہو کا آخری قطرہ تک چوس لیا تھا) ۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان میں سے ھر سنگِ گراں انسانیت کی ھڈیاں توڑ دینے کے لئے کافی تھا ۔ لیکن جس انداز سے مذھبی استبداد اس کے دل و دماغ پر مسلّط ھو رھا تھا اس کی مثال دوسرے شعبوں میں بھی نہیں مل سکتی تھی ۔ رسالتِ محمدیہؐ کا سب سے بڑا معرکہ آرا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے فکرِ انسانی کو اُن زنجیروں سے آزاد کیا ۔ اس مقام پر شاید تمہارے دل میں یہ خیال پیدا ھو کہ اسلام تو خود ایک مذھبی تحریک (Religious Movement) ہے ۔ اس لئے اس نے انسان کو "مذھب" کے چنگل سے کس طرح چھڑا دیا ؟ اگر کوئی دھریہ (Atheist) یہ کہے کہ میں نے فکرِ انسانی کو مذھب کی گرفت سے آزاد کرایا ہے تو اس کا یہ دعویٰ قابل فہم ھوگا ۔ لیکن ایک مذھبی تحریک کا یہ دعویٰ کس طرح قابل پذیرائی سمجھا جا سکتا ہے ؟ تمہارے دل میں اس خیال کا پیدا ھونا بجا ہے ۔ لیکن حقیقت وھی ہے جس کی طرف میں نے اوپر اشارہ کیا ہے ۔ یہ مقام ذرا مشکل ہے ۔ اس لئے اسے غور سے سمجھنے کی ضرورت ہے ۔

مذھب کی دنیا میں بنیادی تصوّر خدا کا ہے ۔ اس تصوّر کو اس قدر

اہمیت حاصل ہے کہ کسی قوم میں جس قسم کا خدا کا تصوّر ہوگا اس کے مطابق اس قوم کی تہذیب و معاشرت اور ذہنیت اور نفسیاتی کیفیت ہوگی۔ (خدا کے صحیح تصوّر کے متعلق میں ایک سابقہ خط میں تفصیل سے لکھ چکا ہوں۔ اس وقت اتنا سمجھ لینا کافی ہوگا کہ) رسالت محمدیہ سے پہلے، مذاہب کی دنیا* میں خدا کا تصوّر ایک مستبد اور مطلق العنان حکمران کا سا تھا، جو نہ کسی قاعدے کا پابند تھا نہ قانون کا۔ جس کے ہاں نہ کوئی آئین تھا نہ دستور، وہ جو جی میں آئے کرتا تھا اور جس قسم کا جی چاہے حکم دے دیتا تھا۔ دنیا کے عام شاہنشاہوں کی طرح اس کی بھی یہ کیفیت تھی کہ (سعدی کے الفاظ میں) گاہے بہ سلامے برنجند و گاہے بہ دشنامے خلعت بہ بخشند۔ اس کے ہاں سے بطور استحقاق کچھ طلب کرنا تکبر و نخوت سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے کہ وہ جسے کچھ دیتا تھا اپنی خوشی سے، بطور احسان دیتا تھا۔ لہٰذا انسان کی ہر وقت کوشش یہ رہتی تھی کہ وہ کسی نہ کسی طرح خدا کو خوش رکھے (انسانی بادشاہوں کی طرح) اسے خوش کرنے کے لئے کبھی اس کی شان میں حمد و ستائش کے قصیدے پڑھے جاتے تھے اور کبھی اس کے حضور گڑ گڑا کر رحم کی درخواستیں گزاری جاتی تھیں، کبھی اس کی بارگہ میں نذرانے پیش کئے جاتے تھے اور کبھی اسے قربانیوں سے خوش کیا جاتا تھا۔ پھر، دنیاوی بادشاہوں کی طرح، خدا کا دربار بھی ہوتا تھا جس میں ”مقربین“ اس کے گرد و پیش بیٹھتے تھے۔ باہر، حاجب

---

*اس سے مراد وہ تصوّر ہے جو مذاہب میں رائج تھا ورنہ حضرات انبیائے کرام نے خدا کا صحیح تصوّر ہی دیا تھا۔ اُن کی تعلیم میں تحریف کی وجہ سے یہ صحیح تصور باقی نہیں رہا تھا۔

و دربان ہوتے تھے ۔ لہٰذا عام انسان کے لئے اس تک براہ راست پہنچنا ناممکن تھا ۔ اسے ، خدا تک اپنی بات پہنچانے کے لئے وسیلوں اور سفارشیوں کی تلاش کرنی پڑتی تھی ۔ یہ سفارشی وہ مقرب تھے جو خدا کے دربار میں موجود رہتے تھے ، ان کی سفارش سے عوام کے کام نکلتے تھے ۔ عوام کو ان کی سفارش حاصل کرنے کے لئے بھی بہت کچھ کرنا پڑتا تھا ۔ غرضیکہ اس قسم کا خدا اور اس کے یہ تمام مقربین ، انسان کے لئے مستقل ہوّا بنے رہتے تھے ۔

تم غور کرو سلیم ! کہ اگر کسی ذی حس انسان کو اس قسم کے بادشاہ کے زیر حکومت چار دن بھی گزارنے پڑیں تو اس کے احساس انسانیت کا حشر کیا ہوگا ؟ اور اگر اُسے اس دنیا کی پوری زندگی اور اس کے بعد کی زندگی دونوں اس قسم کے خدا کی حکومت میں بسر کرنی پڑیں ، جس میں ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہے کہ اب چھری صیاد نے لی ، اب قفس کا در کھلا ۔ تو اس میں اس کی کیفیت کیا ہوگی ؟ یہ تھیں وہ ناقابل برداشت پتھر کی سلیں جن کے نیچے انسانیت دبی چلی آ رہی تھی ۔ اور یہ تھیں وہ استخواں شکن زنجیریں جن میں انسان جکڑا ہوا تھا ۔ رسالتِ محمدیہ نے آ کر خدا کا ایسا تصوّر دیا جس سے مجبور و مقہور انسان ان تمام اغلال و سلاسل سے آزاد ہو کر شرفِ انسانیت سے ہم آغوش ہو گیا ۔ اس نے بتایا کہ بیشک خدا ، لا انتہا قوّتوں کا مالک اور اپنے ارادوں اور فیصلوں میں مختار مطلق ہے ، لیکن اس نے نظم و نسق کائنات اور انسانی سعی و عمل کے نتائج کے لئے ایسے اٹل قوانین بنا دئے ہیں جن میں کبھی کمی بیشی نہیں ہوتی ۔ خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا (۲۵/۲) ۔ اس نے ہر شے کو پیدا کیا اور پھر اس کے لئے پیمانے مقرر کر دئے ۔ یہ ”قدر“ یا پیمانے ہی ہیں جنہیں دور حاضر کی اصطلاح میں قانون (Law)

کہا جاتا ہے (قانون یا Law سے مراد وہ قانون نہیں جس کی عدالتوں میں مٹی پلید ہوتی ہے ۔ بلکہ وہ قانون جس کے مطابق کارگۂ کائنات اس حسن و خوبی سے چل رہا ہے) قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا (٦٥/٣) ۔ یہ حیقت ہے کہ اللہ نے ہر شے کے لئے ایک قانون بنا دیا ہے ۔ للہذا یہاں کسی مستبد حاکم کی مطلق العنانی کارفرما نہیں ۔ یہاں ہر کام قاعدے اور قانون ور آئین و دستور کے مطابق ہوتا ہے ۔ جسے ہم ” امر اللہ “ یا خدا کا حکم کہتے ہیں ، خود اس کے لئے قانون مقرر ہے ۔ وَكَانَ أَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُورًا (٣٣/٣٩) ۔ ظاہر ہے سلیم ! جہاں ہر کام قانون کے مطابق سرانجام پاتا ہو وہاں نہ کسی کی خوشامد درآمد کی ضرورت ہوتی ہے ، نہ رشوت اور نذرانے کی ، وہاں نہ کسی وسیلے کی احتیاج ہوتی ہے نہ کسی سفارش کی تلاش ، یہاں نہ کسی سے بے انصافی ہوتی ہے نہ کسی کی رو رعایت ۔ اس انداز حکومت میں ، لَا تَجْزِي نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا هُمْ يُنْصَرُونَ (٢/٤٨) ۔ پھر یہ قانون بھی اس طرح نتیجہ خیز ہوتا ہے جس طرح سنکھیا کھانے سے ہلاکت اور پانی پینے سے پیاس کی تسکین ہو جاتی ہے ۔ اس میں نہ کسی عدالت میں جانے کی ضرورت پڑتی ہے نہ کورٹ فیس لگانے کی حاجت ، نہ گواہ بلانے کا مطالبہ ہوتا ہے نہ دستاویزیں پیش کرنے کا تقاضا ۔ ادھر عمل سرزد ہوا ، اُدھر اس کا نتیجہ مرتب ہونا شروع ہو گیا ۔

سوچو سلیم ! کہ اس قسم کی فضا میں انسان کو کس قدر حریت اور آزادی نصیب ہوتی ہے اور اس کی پیشانی میں سربلندیوں اور سرفرازیوں کے

کتنے عظیم عرش جھلک اُٹھتے ہیں۔ اس میں قانون کی اطاعت کرنی ہوگی اور اور بس۔ اس میں کسی فرد کی غلامی اور محکومی کا سوال ہی نہیں ہوگا۔ نہ ہی وہ تذبذب اور اضطراب جو مستبد شہنشاہ قسم کے ”خدا“ کے تصور کے ماتحت ہر وقت سینۂ آدم میں آتش خاموش کی طرح سلگتا رہتا تھا کہ نہ معلوم وہ کس بات سے ناراض ہو جائے اور اس کا نتیجہ کیا ہو؟ اب ہر شے کے پیمانے مقرر ہیں۔ ان پیمانوں (قوانین) کا علم حاصل کیجئے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ فلاں عمل کا نتیجہ کیا ہوگا۔ اس کے بعد آپ کا ہر قدم حتم و یقین کے ساتھ اُٹھے گا۔ اس حتم و یقین کے ساتھ کہ دنیا خواہ ادھر سے اُدھر ہو جائے جس قانون کا سررشتہ آپ نے تھاما ہے وہ کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔ تمہیں سلیم! وہ رسے کا پل (Rope-Way) یاد ہے جس میں پنگوڑا لٹکا کر اتنی گہری کھڈ کو عبور کیا کرتے تھے۔ جب وہ پنگوڑا عین بیچ میں جاتا تھا اور نیچے کھڈ کا بھیانک اندھیرا نظر آتا تھا تو وہ سماں کس قدر ہولناک ہوتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود ہم کس ہنسی خوشی سے ادھر سے اُدھر آیا جایا کرتے تھے۔ یہ اطمینان کس چیز سے حاصل تھا؟ صرف اس سے کہ اس کا رسہ اس قدر مضبوط ہے کہ وہ کبھی ٹوٹے گا نہیں۔ وہ دبمیان میں جا کر دھوکا نہیں دے گا۔ بس ایسا ہی اطمینان اس قانون کی طاعت سے ہوتا ہے جس کے متعلق یقین ہو کہ وہ کبھی دغا نہیں دے گا، کبھی ٹوٹے گا نہیں۔ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا (۲/۲۵۶)۔ جس نے ہر غیر خداوندی قانون سے منہ موڑ کر صرف قانون خداوندی پر بھروسہ کر لیا تو اس نے ایک ایسا مضبوط سہارا تھام لیا جو کبھی ٹوٹ نہیں

سکتا۔ اور اس ”قانون کی اطاعت“ بھی کسی تھانیدار کے حکم کی اطاعت نہیں بلکہ ایک ڈاکٹر کی ھدایات کی تعمیل ھے۔ جو ان ھدایات کی تعمیل کرے گا وہ بیماری سے محفوظ رھے گا۔ جو ان کے خلاف جائے گا، اس کی صحت تباہ ھو جائے گی۔ فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ۔ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَکَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ (۲/۳۸)۔

کائنات میں قانون کی کارفرمائی کے تصور نے ھر قسم کی توھم پرستی کا خاتمہ کر دیا۔ اس کا مطلب یہ ھے کہ کائنات میں کوئی حادثہ یونہی ھنگامی طور پر رونما نہیں ھوتا بلکہ سلسلہ علت و معلول (Cause and Effect) کے مطابق ھوتا ھے۔ اس حقیقت نے ھر ذھن کو دعوت غور و فکر دی اور اس طرح، خدا کے اس صحیح تصور سے سائنٹفک دور کا آغاز ھو گیا اور علم انسانی کے لئے تحقیق و کاوش کے لا انتہا راستے کھل گئے۔

تم نے دیکھا سلیم! کہ خدا کے تصوّر میں اس بنیادی تبدیلی سے، رسالت محمدیہ ﷺ نے انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا اور اس کے قلب و اذھان سے کس کس قسم کا بوجھ اتار کر اسے صحیح انسانیت کی آزادی عطا کر دی۔

مذھب کی دنیا میں خدا کے بعد رسول کا درجہ آتا ھے۔ رسالت محمدیہ ﷺ سے پہلے، اقوام عالم نے اپنے مذھب کے بانیوں کو انسانی سطح سے اٹھا کر، خدائی مسند پر بٹھا دیا تھا۔ ھندو اپنے رشیوں کو پرمیشور کا اوتار مانتے تھے، زرتشتیوں کا میترا خود خدا مانا جاتا تھا، عیسائیوں

نے حضرت مسیحؑ کو خدا کا بیٹا ہی نہیں بلکہ خدائی میں تیسرے حصے کا شریک قرار دے رکھا تھا ۔ علاوہ اس کے کہ یہ چیز علم و حقیقت کے خلاف تھی ، ذہن انسانی پر اس کا اثر یہ تھا کہ لوگ سمجھتے تھے کہ وہ بڑے بڑے کارنامے جو اُن بزرگوں سے سرزد ہوئے دوسرے انسانوں سے عمل میں نہیں آ سکتے کیونکہ وہ مافوق البشر قوتوں کے حامل تھے ۔ یہی وجہ تھی کہ یہ اقوام ، اپنی نشاۃ ثانیہ (تازہ حیات قومی) کے لئے کسی مافوق البشر ”آنے والے“ کا انتظار کرتی تھیں ۔ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ یہ کام ہم لوگوں سے ہو ہی نہیں سکتا ۔ تم سمجھتے ہو سلیم ! کہ اس عقیدہ کا نتیجہ کیا ہوا ؟ یہ قومیں فکر اور عمل دونوں اعتبار سے قامت انسانیت (Human Stature) تک پہنچ ہی نہ سکیں ۔ ان کے اعصاب پر ہر وقت جذبۂ مرعوبیت (Inferiority Complex) سوار رہتا تھا جو ان کے مضمر جوہروں میں بالیدگی پیدا نہیں ہونے دیتا تھا ۔

رسالت محمدیہؐ نے آ کر اعلان کیا کہ ”اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ یُوْحٰی اِلَیَّ“ اس خصوصیت کو چھوڑ کر کہ نبی کو خدا کی طرف سے وحی ملتی ہے ، وہ تمہارے ہی جیسا انسان ہوتا ہے ۔ لہٰذا (وحی کے علاوہ) جو انقلاب اس نے برپا کیا تھا وہ تم بھی کر سکتے ہو ۔ اس کے لئے کسی مافوق البشر قوت و استعداد کی ضرورت نہیں ۔ رسول کی زندگی تمہارے لئے اس اعتبار سے نمونہ بنتی ہے کہ جو کچھ اُس نے کہا تھا وہ تمہارے لئے ناممکن الحصول یا ناممکن العمل نہیں ۔ تم نے غور کیا سلیم ! کہ رسولؐ کے تصور میں اس تبدیلی نے انسان کو زمین کی پستیوں سے اُٹھا کر کس طرح آسمان کی بلندیوں تک پہنچا دیا ؟ لیکن رسالت محمدیہؐ تو اس سے بھی ایک قدم آگے چلی گئی ۔ اس سے پہلے انسان اپنے عہد طفولیت میں تھا جہاں

اسے قدم قدم پر کسی انگلی پکڑنے والے کے سہارے کی ضرورت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس دور میں انبیاء کا سلسلہ پیہم و متواتر جاری رہا۔ لیکن رسالت محمدیہ ص نے اعلان کر دیا کہ اب سلسلۂ نبوت ختم ہوگیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اب انسانوں کو اپنے معاملات کے فیصلے آپ کرنے ہوں گے۔ صرف یہ دیکھنا ہوگا کہ ان کا کوئی فیصلہ آن غیر متبدل اصولوں کے خلاف نہ جائے جو وحی نے عطا کئے ہیں اور جو اب قرآن کی دفتین میں محفوظ ہیں۔ انسانیت کی تاریخ میں ختم نبوت کا اعلان ایک بہت بڑا انقلاب ہے۔ اس سے انسانی تاریخ میں نئے دور کا آغاز ہوتا ہے اور یہ اعلان (معاذ اللہ) کسی منکر نبوت کی طرف سے نہیں ہوا۔ ختم نبوت کا اعلان خود زبان نبوت سے ہوا ہے۔ یہ اعلان ہے اس حقیقت کا کہ اب انسان، سن شعور کو پہنچ گیا ہے اور اسے صرف اتنی راہ نمائی کی ضرورت ہے کہ ہر دو راہے پر معلوم ہو جائے کہ یہ راستہ کس طرف جاتا ہے اور وہ راستہ کس سمت کو۔ تم نے غور کیا سلیم! کہ رسالت محمدیہ ص نے اس باب میں کس قدر حریت فکر و عمل اور خود اعتمادی و خود فیصلگی عطا کی ہے؟

مذہب کی دنیا میں تیسری چٹان یا زنجیر (زنجیر کیا پورے کا پورا جیل خانہ) پیشوائیت کی لعنت ہے۔ (وہی جسے انگریزی میں (Priesthood)، ہندوؤں کے ہاں برہمنیت، اور ہمارے ہاں ملائیت کہا جاتا ہے)۔ یہ زنجیریں وہ ہیں جو انسان کو ایک قدم بھی اپنی مرضی سے اٹھانے نہیں دیتیں۔ یوں بیٹھو، یوں اٹھو، یوں سوؤ، یوں جاگو، یوں چلو، یوں پھرو، یوں کھاؤ، یوں پیو۔ دایاں پاؤں ادھر رکھو بایاں ادھر۔ سیدھا ہاتھ یوں اٹھاؤ الٹا یوں۔ پوری کی پوری ایک مستبد ڈکٹیٹر کی (Regimentation) بنا دی جاتی ہے۔ سوچو سلیم! کہ انسانیت پر یہ بوجھ کس قدر گراں اور یہ زنجیریں کیسی

استخواں شکن تھیں۔ رسالتِ محمدیہؐ نے ان تمام زنجیروں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیا اور کہہ دیا کہ خدا اور بندے کے درمیان کوئی قوت حائل نہیں ہو سکتی۔ قانون کی اطاعت میں پیشوائیت کا کیا کام؟

اس سے آگے بڑھئے۔ مذہب کی دنیا میں "نجات" کا تصور سامنے آتا ہے۔ اسے درحقیقت مذہب کا مقصود و منتہیٰ قرار دیا جاتا ہے۔ خود لفظ "نجات" اس کی غمازی کرتا ہے کہ انسان کسی جیل خانے میں محبوس یا سخت زنجیروں میں مقید ہے اور ان زنجیروں سے رہائی حاصل کرنا نجات ہے۔ رسالتِ محمدیہؐ نے اس کا اعلان کیا کہ نجات کا یہ تصوّر غلط ہے۔ انسان کسی مصیبت میں گرفتار نہیں کہ اسے اس سے نجات دلائی جائے۔ اسے کچھ قوّتیں اور صلاحیتیں دی گئی ہیں اور ممکنات کی ایک وسیع دنیا اس کے سامنے رکھ دی گئی ہے۔ اس کے بعد اس سے کہہ دیا گیا ہے یہ اپنی سعی و عمل سے جو کچھ حاصل کرنا چاہتا ہے، کرے۔ جو جس قدر متاع حاصل کرے گا، اتنا ہی کامیاب و کامران ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے زندگی کا مقصود نجات کی بجائے فلاح و فوز قرار دیا ہے۔ فلاح کے معنی ہیں کھیتی کا پروان چڑھنا۔ محنتوں کا ثمربار ہونا، اور فوز کے معنی ہیں (Achievement)۔ ان صلاحیتوں کی نشو و نما جن سے زندگی اپنی ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی چلی جائے۔ تم نے غور کیا سلیم! کہ رسالتِ محمدیہؐ نے بیک جنبش ان محکم زنجیروں کو کس طرح تارِ عنکبوت بنا کر رکھ دیا!

مذہب کی دنیا سے آگے بڑھ کر معاملات کی دنیا میں آئیے تو ملوکیت کا استبداد، نوعِ انسان کے سر پر ہمالیہ سے زیادہ گراں بار پہاڑ تھا جس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ رسالتِ محمدیہؐ

نے نوع انسان کو یہ انقلاب آفریں پیغام دیا کہ کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے انسان سے اپنا حکم منوائے۔ انسانوں کو اپنے معاملات قوانین خداوندی کی روشنی میں باہمی مشاورت سے طے کرنے چاہئیں۔ جو ان میں سے اُن قوانین و ضوابط کی نگہداشت سب سے زیادہ کرتا ہے وہ ان میں سب سے زیادہ واجب التکریم ہے۔

ملوکیت کی غلامی سے بھی زیادہ کربہ انگیز اور انسانیت سوز غلامی، اقتصادی غلامی (Economic Slavery) ہے۔ نوع انسانی اس قدر مدت مدید سے اس غلامی میں ماخوذ چلی آرہی تھی کہ غلاموں کو اپنی غلامی کا احساس تک بھی باقی نہیں رہا تھا۔ رسالت محمدیہؐ نے آکر اعلان کیا کہ خدا نے زمین کے دسترخوان پر رزق کو اس لئے بکھیر رکھا ہے کہ اس سے تمام نوع انسان کی پرورش ہو سکے۔ لہٰذا کسی فرد کو یہ حق حاصل نہیں کہ رزق کے سرچشموں پر ذاتی قبضہ جما لے۔ یہ معاشرے کی تحویل میں رہنے چاہئیں اور معاشرے کو تمام افراد کی ضروریات زندگی کا کفیل ہونا چاہئے۔

اس مقام پر سلیم! ممکن ہے تمہارے دل میں ایک سوال پیدا ہو جس کا جواب ضروری ہے۔ تاریخ اس پر شاہد ہے کہ جب کوئی قوم رزق کی طرف سے مطمئن ہو جائے تو اس کے قوائے عملیہ مفلوج ہو جاتے ہیں اور وہ رفتہ رفتہ زندگی کی حرارت سے محروم ہو جاتی ہے۔ اگر قرآنی نظام کے ماتحت، افراد معاشرہ کو حصول رزق کی کشمکش سے نجات دلا دی جائے تو کیا ان کی بھی یہی حالت نہ ہو جائے گی؟ یہ اعتراض بڑا معقول نظر آتا ہے اور تاریخ اقوام، انسان کو اسی نتیجہ پر پہنچاتی ہے۔ لیکن سلیم! اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان نے اپنی زندگی کا مقصود صرف حصول رزق

قرار دے رکھا ہے۔ اس کے نزدیک زندگی حیات طبیعی کا نام ہے اور جب اسے اس زندگی کی بقا کا سامان (رزق) میسّر آجائے تو اس کے بعد اس کے سامنے کوئی ایسا مقصد نہیں رہ جاتا جس کے حصول کے لئے جد و جہد کرنی پڑے۔ یہ وجہ ہے کہ جب کوئی قوم رزق کی طرف سے مطمئن ہو جاتی ہے تو اس کی قوتوں میں اضمحلال شروع ہو جاتا ہے۔ لیکن قرآن نے طبیعی زندگی کو محض حیوانی سطح کی زندگی قرار دیا ہے۔ اس لئے یہ مقصود و منتہائے انسانیت نہیں۔ اس نے انسان کے سامنے اس سے کہیں بلند اور وسیع مقاصد رکھے ہیں۔ (ان کی تفصیل مختلف مواقع پر بتا چکا ہوں اس لئے ان کے دُہرانے کی یہاں ضرورت نہیں)۔ قرآن نے یہ دیکھا کہ انسان کی یہ کس قدر بد نصیبی ہے کہ اس کی ساری توانائیاں محض حصول رزق میں ضائع ہو جاتی ہیں اور وہ ان سے بلند مقاصد کی طرف توجہ ہی نہیں دے سکتا۔ اس نے اسے روٹی کی طرف سے مطمئن کرکے اس کی تمام توانائیوں کو اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لئے محفوظ (Conserve) کر لیا اور اس سے کہ دیا کہ وہ اپنی تمام توجہات کو ان مقاصد پر مرکوز کر دے اور اس طرح "اقطار السموت والارض" سے آگے نکل جانے کی کوشش کرے۔

ذرا غور کرو سلیم! کہ رسالت محمدیہؐ نے اس ایک تبدیلی سے عالم انسانیت میں کتنا بڑا انقلاب پیدا کر دیا۔ اس نے انسان کی تمام توانائیوں کو جو حصول رزق جیسے اسفل مقصد ہی میں ضائع ہو جاتی تھیں، محفوظ کر لیا۔ لیکن رزق کی طرف سے اطمینان ہو جانے سے انسان میں جو تعطّل پیدا ہو جاتا تھا اس کے سامنے بلند ترین مقاصد رکھ کر نہ صرف اس تعطّل کو دور کر دیا، بلکہ اس کی زندگی کو جہاد مسلسل میں تبدیل کر دیا۔ ایسے مسلسل جہاد میں، کہ جانے والی نسل جس حد تک راستہ طے کر جائے آنے والی نسل کے

لئے وہ مقام، سفر کا نقطۂ آغاز بن جائے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن ماضی کی طرف نگاہ رکھنے کی بجائے ہمیشہ مستقبل کو سامنے رکھنے کی تاکید کرتا ہے۔ اسی کا نام ایمان بالآخرت ہے اور یہ بجائے خویش بہت بڑا انقلاب ہے جسے رسالت محمدیہؐ نے انسانی نگاہ میں پیدا کیا ہے۔ یعنی ہمیشہ نگاہ مستقبل پر رکھنی۔ وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ۔ اس زندگی میں بھی مستقبل پر اور اس کے بعد کی زندگی میں بھی۔

خط لمبا ہو گیا ہے لیکن اسے ختم کرنے سے پہلے میں اس خصوصیتِ کبریٰ کا تذکرہ ضروری سمجھتا ہوں جو میرے نزدیک رسالت محمدیہؐ کا نوعِ انسانی پر احسان عظیم ہے۔ تم غور کرو سلیم! کہ انسان اپنی طبعی دنیا میں نسلاً بعد نسل ترقی کرتا ہوا کس طرح آگے بڑھتا ہوا چلا آ رہا ہے۔ مثال کے طور پر امراضً اور ان کے علاج کے شعبہ ہی کو دیکھو۔ جن امراض کو آج سے چند صدیاں پہلے لا علاج سمجھا جاتا تھا (بلکہ یہ بھی معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ امراض ہیں کیا) ان پر انسان کس طرح قابو پاتا چلا جا رہا ہے۔ پھر طریق علاج پر غور کرو۔ ابھی پچاس سال پہلے دانت نکلوانا اس قدر کرب انگیز تھا کہ آج اس کے تصوّر سے کپکپی پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن آج ایک دانت تو کیا، پورے کا پورا جبڑا اس طرح نکال کر رکھ دیا جاتا ہے کہ آدمی کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ یہ کب ہو گیا۔ اسی طرح سرجری (جراحی) کی دوسری مثالوں کو سمجھ لو۔ اب تم غور کرو کہ پچھلی صدی کے انسان کے لئے یہ تصوّر کس قدر یاس انگیز اور حسرت ناک ہوگا کہ میں یونہی سو سال پہلے پیدا ہو گیا۔ اگر میں بھی بیسویں صدی میں پیدا ہوتا تو اس تمام کرب و درد سے بچ جاتا جس میں مختلف امراض اور ان کے علاج کی وجہ سے مبتلا رہا۔ یہ اس لئے ہے سلیم! کہ انسانی عقل کا طریق تجرباتی ہے۔ وہ

مختلف تجارب کے بعد رفتہ رفتہ انکشاف حقائق کرتی ہے۔ یہ وجہ ہے کہ اس باب میں سابقہ نسل کا انسان، آنے والی نسل کی سطح سے نیچے رہ جاتا ہے۔ یہ اس کی بے بسی ہے جس کا کوئی علاج نہیں۔

لیکن وحی کا طریق تجرباتی نہیں۔ اس کی رو سے وہ تمام حقائق جو انسانیت کی نشو و نما کے لئے ضروری ہیں، بیک وقت نوع انسانی پر (نبی کے ذریعے) منکشف کر دئے جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سابقہ اور موجودہ اور آنے والی نسل کے تمام انسان ایک ہی سطح پر ہوتے ہیں۔ اس میں کسی گذشتہ نسل کے انسان کو اس کا افسوس نہیں ہوتا کہ وہ آنے والی نسل سے پہلے کیوں پیدا ہو گیا؟ وہ بھی اسی مقام پر ہوتا ہے جس مقام پر آنے والی نسل کے انسان نے ہونا ہے۔ لہٰذا اس میں کسی دور کے انسان کے لئے وجۂ مایوسی اور احساس بے بسی نہیں ہوتا۔ وحی کی رو سے عطا فرمودہ پروگرام سب کے لئے یکساں طور پر باعث رحمت ہوتا ہے۔ جو قوم جس دور میں بھی اسے اختیار کرے اس کے سامنے وہی نتائج آ جاتے ہیں۔ چونکہ یہ پروگرام رسالتِ محمدیہؐ میں تکمیل تک پہنچ گیا اور ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا گیا اس لئے رسالتِ محمدیہؐ تمام نوع انسانی کے لئے رحمت ہے۔ وَمَآ أَرْسَلْنٰكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ کا مفہوم یہی ہے۔

کیوں سلیم! کتنا بڑا ہے یہ احسان؟ اس کی سپاس گزاری میں تمام نوع انسانی کی گردن اس رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ کے حضور جھکنی چاہئے یا نہیں؟ اب تم سمجھے کہ میں اس تقریب عظیم کو کیوں تمام دنیا کے انسانوں کے لئے سب سے بڑا جشن مسرت قرار دیتا ہوں؟ سلیم! دنیا نے ابھی تک رسالتِ محمدیہؐ کی غایت و مقصود کو سمجھا ہی نہیں۔ لیکن اس میں دنیا والوں

کا کیا قصور ؟ ہم انہیں سمجھاتے تو وہ سمجھتے !

اور اس کے جواب میں تم کہ دو گے کہ اس میں ہمارا بھی کیا قصور ؟ ہم خود سمجھتے تو دوسروں کو بھی سمجھاتے !

بہر حال اب تو تم سمجھ گئے کہ رسالت محمدیہؐ کس طرح رَحْمَةٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ہے ؟ اس نکتہ کی مزید تشریح دوسرے خط میں کروں گا ۔

والسلام
پرویز
اکتوبر ۱۹۵۵ء

بائیسواں خط

(رَحْمَۃٌ لِّلْعَالَمِیْنَ)

سلیم میاں ! دعا ۔ پچھلے خط میں میں نے وعدہ کیا تھا کہ نبی اکرمؐ کی رحمۃٌ للعالمینی کے متعلق مزید تصریحات کسی دوسرے وقت لکھوں گا۔ آج اس کے لئے فرصت مل گئی۔ اس خط کو، اُس سابقہ خط ہی کا ایک حصہ سمجھو ۔ اس میں بعض باتیں ایسی بھی آ جائیں گی جو سابقہ خط میں لکھی جا چکی ہیں ۔ انہیں ان کا تشریحی بیان سمجھو ۔

دنیا کی کسی قوم کو لو، اس نے سال میں کچھ دن ایسے تجویز کر رکھے ہوں گے جنہیں وہ بطور قومی تیوہار منائے گی ۔ قومی زندگی میں تیوہاروں کی تقریبات ایک خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ تیوہار درحقیقت کسی قوم کے اجتماعی جذبات کے اظہار کا ذریعہ ہوتے ہیں اور اظہارِ جذبات (بشرطیکہ وہ آئین و ضوابط اور سنجیدگی و شرافت کی حدود سے تجاوز نہ کرے) انسانی ذات کی نشو و نما کے لئے نہایت ضروری ہے ۔

تیوہار عام طور پر کسی اہم واقعہ کی یاد میں منایا جاتا ہے

جس واقعہ کی یاد میں کوئی قوم اپنا تیوہار مناتی ہے اس سے اس امر کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس قوم کے نزدیک زندگی کے مختلف عناصر کی اہمیت کا معیار کیا ہے ۔ مثلاً ہندوستان کی ابتدائی آریہ قوم زراعت پیشہ تھی ۔ اس لئے اُنہوں نے جہاں گنگا جمنا جیسے دریاؤں ، بڑ اور پیپل جیسے درختوں کو اپنا دیوتا اور زمین (دھرتی) کو ماتا بنایا ، وہاں موسموں کے تغیرات کے اوقات (بسنت ، ہولی ، وغیرہ) کو قومی تیوہار قرار دے لیا ۔ اسلامی زندگی میں سب سے بلند اور عظیم مقام قرآن کریم کو حاصل ہے ۔ اس لئے ان کے ہاں نزول قرآن سے زیادہ اہم واقعہ اور کونسا ہو سکتا تھا جسے ملّی تیوہار کی حیثیت حاصل ہوتی ۔ اس ضمن میں خود اللہ تعالیٰ نے کہہ دیا کہ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰہِ وَبِرَحْمَتِہٖ فَبِذٰلِکَ فَلْیَفْرَحُوْا ۔ ھُوَ خَیْرٌ مِّمَّا یَجْمَعُوْنَ (۱۰/۵۸) ”ان سے کہ دو کہ (قرآن کا ملنا) اللہ کے فضل اور رحمت سے ہے ۔ اُنہیں چاہئے کہ اس پر خوشیاں منائیں ۔ یہ ہر اس شے سے بہتر ہے جسے لوگ جمع کرتے ہیں ۔ (اس نکتہ کی تفصیل کسی دوسرے خط میں لکھوں گا) ۔

لیکن قرآن کے بسیط حقائق (Abstract Realities) اور فطری قوانین (Theoretical Laws) کو ایک جیتے جاگتے عملی نظام کی شکل میں سب سے پہلے نبی اکرم ص نے پیش کیا ۔ اس لئے نزولِ قرآن کی یاد منانے کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اس ذاتِ اقدس و اعظم ص کی حیاتِ طیّبہ کو بھی سامنے لایا جائے جس نے قرآنی حقائق کو محسوس پیکروں میں متشکل کرکے دنیا کو دکھا دیا کہ اس نظام کے نتائج نوع انسانی

کے حق میں کس قدر حیات بخش اور انسانیت ساز ہیں۔ ہمارے ہاں اس حقیقت کبریٰ کی یاد تازہ کرنے کے لئے حضورص کے یوم پیدائش کو بطور جشن مسرت (ملی تیوہار) منایا جاتا ہے جسے عام طور پر عید میلاد النبی ص کہا جاتا ہے۔ یہ تقریب حضورص کے یوم پیدائش سے متعین ہوتی یا یوم وفات سے، واقعۂ ہجرت کی یاد میں ہوتی یا تکمیل دین کی مناسبت سے۔ میرے نزدیک اس سے اصل حقیقت پر کچھ فرق نہیں پڑتا، نہ پڑ سکتا ہے۔ مقصود و مطلوب، بہر حال، قرآنی حقائق کی روشنی میں حضورص کی سیرت طیبہ کو دنیا کی نگاہوں کے سامنے لانا ہے۔ اگر ہم اس مقصد کے لئے اس تقریب سعید کو مناتے اور اس انداز و اسلوب سے آپ ص کی سیرت مقدسہ کو دنیا کے سامنے پیش کرتے، تو آج دنیا کا نقشہ کچھ اور ہوتا۔ اگر ہم اب بھی اس تقریب کو اس انداز سے منائیں اور دنیا کے سامنے خالص قرآن کی تعلیم اور اس کی روشنی میں حضورص کی سیرت کو پیش کریں، تو میں علیٰ وجہ البصیرت، دل کے پورے یقین سے، کہہ سکتا ہوں کہ پوری نوع انسان اس تقریب کو منانے لگ جائے۔ اس لئے کہ میرے گھر کا دیا میرے صحن خانہ کو روشن کرتا ہے، اس لئے وہ صرف میرا دیا کہلاتا ہے۔ لیکن سورج ساری دنیا کو روشن کرتا ہے اس لئے وہ پورے عالم انسانیت کا مشترکہ چراغ ہوتا ہے۔ کسی خاص فرد، خاندان، قبیلہ، قوم یا ملک کا سورج نہیں ہوتا۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف قرآن نے یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے کہ یَا اَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّا اَرْسَلْنٰکَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا وَّدَاعِیًا اِلَی اللّٰهِ

بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا (۳۳/۳۶) اے نبی ! ہم نے تجھے (اقوام عالم کے اعمال کا) نگران ، زندگی کی صحیح روش پر چلنے کے خوشگوار نتائج کی خوشخبری دینے والا اور غلط راستے پر چلنے کے تباہ کن عواقب سے آگاہ کرنے والا بنا کر بھیجا ہے ۔ نیز خدا کے قانون کے مطابق لوگوں کو خدا کی طرف بلانے والا اور دنیا کو روشن کرنے والا سورج ''۔

نبی اکرم ص سے پہلے ، حضرات انبیاء کرام ع مختلف قوموں کی طرف آتے تھے (اس لئے کہ اُس وقت ابھی انسان کی نگاہ اتنی وسیع اور اس کا ذہن اتنا بلند نہیں ہوا تھا کہ وہ تمام نوعِ انسان کی عالمگیر برادری کے تصور کو اپنا سکتا) ۔ لیکن آپ کا ظہور تمام عالمِ انسانیت کے لئے تھا (اور خدا کے آخری نبی کو ہونا بھی ایسا ہی چاہئے تھا) ۔ اس لئے قرآن نے واضح الفاظ میں اعلان کر دیا کہ وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا (۳۴/۲۸) ''اور ہم نے تجھے تمام نوعِ انسان کے لئے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے ''۔ اس کی تشریح دوسری جگہ ان الفاظ سے کر دی کہ قُلْ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا (۷/۱۵۸) ''عالم انسانیت کو مخاطب کرکے کہہ دو کہ میں تم سب کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں ۔ اسی سلسلۂ زرین کی ایک درخشندہ کڑی وہ آیۂ جلیلہ بھی ہے جو اس خط کے موضوع کا عنوان ہے ۔ یعنی :

وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ (۲۱/۱۰۷)

اور ہم نے تجھے اقوام عالم کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے ۔

اسلام کا خدا ، رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (۱/۱) - اس کا ضابطۂ قوانین (قرآن) ذِکْرٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ (۳۸/۸۸) اور اس کا رسول رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ (۲۱/۱۰۷) اس میں رنگ ، نسل ، خون ، زبان ، وطن کی کوئی تخصیص و تمیز نہیں -

اس مقام پر ایک سوال پیدا ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ ایک غیر مسلم یہ کہہ سکتا ہے کہ آپ اپنے رسول کے متعلق ، جو عقیدہ چاہیں ، رکھیں - لیکن آپ یہ کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ وہ غیر مسلم اقوامِ عالم کے لئے بھی رحمت ہیں ؟ یہ سوال غور طلب ہے اور اس خط میں اسی کا جواب میرے پیش نظر ہے - لیکن قبل اس کے کہ میں اس موضوع کی طرف آؤں ، یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ رَحْمَةً کے معنی کیا ہیں ؟ عام طور پر رحمت اور رحم کو مرادف المعنی سمجھا جاتا ہے اور اس اعتبار سے رحمة کا ترجمہ بھی رحم ہی کیا جاتا ہے - یعنی (Mercy) - چنانچہ تم قرآن کریم کے انگریزی تراجم میں اس لفظ کا ترجمہ (Mercy) ہی دیکھو گے - لیکن اس سے اس لفظ (رَحْمَةٌ) کا صحیح مفہوم سامنے نہیں آ سکتا - اس کا مفہوم سمجھنے کے لئے لفظ رحم کو سامنے لاؤ جس میں جنین (بچے) کی نشو و نما ہوتی ہے - لہٰذا '' رَحْمَةٌ '' کے معنی ہوتے ہیں سامان پرورش یا وہ قالب (Pattern) ، جس کے اندر کسی کی مضمر صلاحیتوں کی نشو و نما ہو سکے - اس میں نرمی اور لطافت کا پہلو شامل ہوتا ہے - بنا بریں آیت زیر نظر کے معنی یہ ہوں گے کہ اقوام عالم کی مضمر صلاحیتوں کی نشو و نما (Development) اُسی قالب (Pattern) میں ہو سکتی ہے ، جسے نبی اکرم ص نے پیش کیا - اُسی سے افراد انسانیہ کو وہ

سامان زیست و ارتقاء مل سکتا ہے ۔ جس سے ان کی دبی ہوئی، خوابیدہ صلاحیتیں ابھر کر توانائی حاصل کر لیں ۔ قرآن نے رَحْمَةٌ کے اس مفہوم کو ایک مثال کے ذریعے خود واضح کر دیا ہے جہاں کہا ہے کہ وَهُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِنْ بَعْدِ مَا قَنَطُوْا وَيَنْشُرُ رَحْمَتَهٗ ($\frac{۴۲}{۲۹}$) ”اور وہی ہے جو مایوسیوں کے بعد بارش برساتا ہے اور (اس طرح) اپنی رحمت کو پھیلا دیتا ہے“ ۔ بارش کیا کرتی ہے؟ مردہ زمین کو زندگی عطا کرتی ہے، اس کی دبی ہوئی صلاحیتوں کو نشو و نما دیتی ہے ۔ اسی کو قرآن رحمة سے تعبیر کرتا ہے ۔

اس مثال میں قرآن نے بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت (سامان نشو و نما) کو انتہائی مایوسیوں کے عالم میں بھیجتا ہے ۔ سوال یہ ہے کہ جب حضور رحمة للعالمین کا ظہور ہوا تو دنیا کا نقشہ کیا تھا؟ کیا وہ بہار آفریں امیدوں اور مسرتوں کا گہوارہ تھی یا افسردگی خیز مایوسیوں اور نامرادیوں کا حسرت کدہ؟ اس کے متعلق مجھ سے نہیں، بلکہ ایک غیر مسلم مؤرخ کی زبان سے سنو (میں نے شروع میں کہا ہے کہ ایک غیر مسلم یہ سوال کر سکتا ہے کہ نبی اکرمؐ کا ظہور، غیر مسلم اقوام عالم کے لئے کس طرح آیۂ رحمت تھا ۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس کے جواب میں جو کچھ کہا جائے، غیر مسلموں کی شہادات سے کہا جائے تاکہ قرآن کے اس دعوے کی صداقت نکھر کر سامنے آ جائے) ۔ تہذیب کے مؤرخ ڈینی سن (Denison) نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام (Emotion as the Basis of

Civilization) ہے۔ اس مصنف کی شہرت اور اس کی تصنیف کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگاؤ کہ ایک طرف وھائٹ ھیڈ (Whitehead) جیسا بین الاقوامی پایہ کا مفکر اپنی کتابوں میں اسے (Quote) کرتا ہے اور دوسری طرف علامہ اقبال رحہ جیسا حکیم الامت اس کا اقتباس اپنے خطبات میں دیتا ہے۔ وہ ظہور نبوی ص کے زمانہ کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچتا ہے :

> آس وقت ایسا دکھائی دیتا تھا کہ تہذیب کا وہ قصر مشید ، جس کی تعمیر پر چار ہزار سال صرف ہوئے تھے ، منہدم ہونے کے قریب پہنچ چکا تھا اور نوع انسان پھر اسی بربریت کی طرف لوٹ جانے والی تھی جہاں ہر قبیلہ ، دوسرے قبیلے کے خون کا پیاسا تھا اور آئین و ضوابط کو کوئی جانتا تک نہیں تھا۔ قدیم قبائلی آئین و مسالک اپنی قوت و احترام کو کھو چکے تھے۔ اس لئے اب ملوکیت کے پرانے طریق و انداز کا سکہ دنیا میں نہیں چل سکتا تھا۔ عیسائیت نے جن قواعد و ضوابط کو رائج کیا تھا وہ نظم و ضبط اور وحدت و یک جہتی کے بجائے تشتت و افتراق اور بربادی و ہلاکت کا موجب بن رہے تھے۔ غرضیکہ وقت وہ آ چکا تھا جبکہ ہر طرف فساد ہی فساد نظر آتا تھا۔ تہذیب کا وہ بلند و بالا درخت ، جس کی سرسبز و شاداب شاخیں کبھی ساری دنیا پر سایہ فگن تھیں۔ اور آرٹ ، سائنس اور لٹریچر کے سنہری پھلوں سے لدی ہوئی تھیں ، اب لڑکھڑا رہا تھا۔ عقیدت و احترام کی زندگی بخش

> نمی اس کے تنے سے خشک ھو چکی تھی اور وہ اندر تک سے بوسیدہ اور کھوکھلا ھو چکا تھا۔ جنگ و جدال کے طوفاں نے اس کے ٹکڑے کر ڈالے تھے جو صرف پرانی رسموں کے بندھن سے یک جا کھڑے تھے اور جن کے متعلق ہر وقت خطرہ تھا کہ اب گرے یا اب۔
>
> کیا ان حالات میں کوئی ایسا جذباتی کلچر پیدا کیا جا سکتا تھا، جو نوع انسان کو ایک مرتبہ پھر ایک نقطہ پر جمع کر دے اور اس طرح تہذیب کو مٹنے سے بچا لے؟ اس کلچر کو بالکل نئے انداز کا ھونا چاھئے تھا، اس لئے کہ پرانی رسومات و آئین سب مردہ ھو چکے تھے اور ان ھی جیسے اور قوانین کا مرتب کرنا صدیوں کا کام تھا۔

اس سوال کا جواب وہ خود ھی ان الفاظ میں دیتا ھے:

> یہ امر موجب حیرت و استعجاب ھے کہ اس قسم کا نیا کلچر عرب کی سر زمین سے پیدا ھوا اور اس وقت پیدا ھوا جب اس کی اشد ضرورت تھی۔

یہ نیا کلچر (اسلام) کس قسم کا انقلاب لایا، اس کے متعلق کارلائل اپنی مشہور تصنیف (Heroes and Hero Worship) میں لکھتا ھے:

> عربوں کے لئے یہ انقلاب ایک نئی زندگی تھی جو انہیں تاریکیوں سے نور کی طرف لے آئی تھی۔ عرب اس کے ذریعے پہلی دفعہ زندہ ھوا۔ ایک ایسی قوم، جو ابتدائے آفرینش سے گمنامی کے عالم میں ریوڑ چراتی پھرتی تھی

اُس کی طرف ایک رسول آیا ، جو اپنے ساتھ ایک پیغام لایا ، جس پر وہ قوم ایمان لے آئی ۔

وہ دیکھو ! وہی گمنام چرواہے ، دنیا کی ممتاز ترین قوم بن گئے ۔ وہ حقیر قوم ایک عظیم‌الشان ملت میں تبدیل ہو گئی ۔ ایک صدی کے اندر اندر عرب ایک طرف غرناطہ اور دوسری طرف دہلی تک چھا گئے ۔ اس کے بعد سینکڑوں برس ہو چلے ہیں کہ یہ اُسی شان و شوکت اور درخشندگی و تابندگی سے کرۂ ارض کے ایک عظیم حصہ پر مسلط ہیں ۔ یہ سب ایمان کی حرارت سے ہوا ۔ ایمان بہت بڑی چیز ہے ۔ ایمان سے زندگی ملتی ہے ۔ جونہی کسی قوم میں ایمان پیدا ہوا اس قوم کی تاریخ ، اعمال میں نتائج ، اور روح میں بالیدگی پیدا کرنے والی بن گئی

وہ عرب — یہ محمد ص — اور صرف ایک سو سال کا عرصہ ! کیا یہ انقلاب ایسا ہی نہیں ، جیسے ریت کے کسی گمنام ٹیلے پر آسمان سے بجلی آ گرے اور وہ ریت کا تودہ دیکھتے ہی دیکھتے ایک آتشگیر مادہ میں تبدیل ہو کر اس طرح بھک سے اُڑ جائے کہ دہلی سے غرناطہ تک اُس کے شعلوں کی لپیٹ میں آ جائے ۔

نوع انسان خشک نیستاں کی طرح ایک شرارہ کے انتظار میں تھی ۔ وہ بجلی کا شرارہ اس بطل جلیل کی صورت میں آسمان سے آیا اور تمام نوع انسان کو شعلہ صفت بنا گیا ۔ (کارلائل)

یہ تو اس سر زمین میں ہوا جو اس ”جدید کلچر“ کا اولین گہوارہ بنی اور اس قوم کے لئے ہوا، جس نے اس ”کلچر“ کو سب سے پہلے محسوس پیکر (قرآنی نظام) میں متشکل کیا۔ سوال یہ ہے کہ یہ ”کلچر“ باقی دنیا کے لئے کس طرح حیات آفرین ثابت ہوا اور اس سے نوع انسان کی دبی ہوئی صلاحیتوں نے کس طرح نشو و نما پائی۔

جیسا کہ میں سابقہ خط میں لکھ چکا ہوں۔ قرآن نے نبی اکرمؐ کی بعثت کا مقصد یہ بتایا ہے کہ وَ یَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَ الْاَغْلٰلَ الَّتِیْ کَانَتْ عَلَیْهِمْ (۷/۱۵۷) - وہ اُن تمام بوجھوں کو اُتار دے گا جن کے نیچے انسانیت دبی ہوئی چلی آ رہی تھی اور اُن تمام زنجیروں کو توڑ کر پھینک دے گا جن میں افراد انسانیہ جکڑے ہوئے تھے۔ سوال یہ ہے کہ وہ کون سے بوجھ تھے جن کے نیچے انسانیت دبی ہوئی تھی اور کونسی زنجیریں تھیں جن میں ان کا بند بند جکڑا ہوا تھا۔ تفصیل اس اجمال کی طول طویل ہے، لیکن اگر اسے مختصراً دو لفظوں میں بیان کرنا چاہیں تو کہا جا سکتا ہے کہ وہ بوجھ اور زنجیریں ارباب قوت و اقتدار کا استبداد تھا جس نے انسانیت کو کچل کر رکھ دیا تھا۔ اس استبداد کی نوعیتیں مختلف تھیں لیکن قرآن نے اسے تین بڑی بڑی شقوں میں تقسیم کر کے اس حقیقت کو واضح کر دیا ہے کہ استبداد کی نوعیت کچھ بھی کیوں نہ ہو، وہ اصل کے اعتبار سے ان تین شقوں میں سے کسی ایک سے متعلق ہوگا۔ ان شقوں کو اس نے داستان بنی اسرائیل میں یک جا بیان کر دیا ہے، یعنی ملوکیت کا استبداد۔ جس کا نمایندہ فرعون تھا۔ پیشوائیت (Priestcraft) کا استبداد جس کی زنجیریں جسم کو نہیں، بلکہ انسان کے قلب و دماغ کو جکڑ دیتی ہیں، اس کا ترجمان ہامان تھا۔ اور سرمایہ پرستی کا استبداد جو شیروں کو لومڑی بنا دیتا ہے، اس کا مجسمہ قارون تھا۔ تم تاریخ انسانیت پر غور

کرو ہر جگہ یہی نظر آئے گا کہ ملوکیت ، پیشوائیت اور سرمایہ داری نے اپنے گٹھ جوڑ سے انسانیت کا گلا گھونٹ رکھا ہے ۔ ملوکیت ، انسان کی طبیعی آزادی کو سلب کرتی ہے ۔ پیشوائیت اس کی فکری صلاحیتوں کو تباہ کرتی اور سرمایہ داری اس کی اخلاقی جرأتوں کو پامال کرتی چلی آئی ہے ۔ یہی تھیں وہ استبداد کی زنجیریں اور توہم پرستی کی برف کی سلیں جنہیں اس نظام نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جسے قرآنی اصولوں کی روشنی میں نبی اکرمؐ نے قائم کیا ۔ یہی نظام ، وہ رحمت (Pattern) ہے جس کے اندر نوع انسان کی دبی ہوئی صلاحیتیں نشو و نما پاتی ہیں ۔

ملوکیت کے استبداد کو یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسان سے اپنا حکم منوائے ۔ محکومی یا اطاعت ، قانون کی ہوگی نہ کہ اشخاص کی ۔ اور جہاں تک قانون کا تعلق ہے اس کے غیر متبدل اصول و حدود خود خدا کے مقرر کردہ ہیں ۔ کسی انسان کو اختیار نہیں کہ وہ ان میں کسی قسم کا رد و بدل یا حک و اضافہ کر سکے ۔ ان اصولوں کی روشنی میں ، انسانوں کے معاملات باہمی مشاورت سے طے ہوں گے ۔ اس مشاورت میں ساری اُمت اپنے نمایندگان کی وساطت سے شریک ہوگی ۔ ان نمایندگان کے انتخاب میں معیار قلب و دماغ کی صلاحیت ہوگا نہ کہ حسب نسب یا دولت و حشمت ۔

پیشوائیت کے استبداد کا خاتمہ یہ کہہ کر کر دیا کہ خدا اور بندے کے درمیان کوئی حاجب و دربان نہیں ، کوئی وسیلہ اور واسطہ نہیں ۔ اطاعت خدا کے اس قانون کی ہوگی جو اس نے اپنے رسولؐ کی وساطت سے نوع انسان کو دیا ۔ اور یہ اطاعت ہوگی اس نظام کی وساطت سے جو اس قانون کو عملاً

نافذ کرنے کے لئے وجود میں آئے۔ اس قانون و نظام کی طرف دعوت علیٰ وجہ‌البصیرت دی جائے گی اور کسی سے کوئی عقیدہ یا نظریہ زبردستی نہیں منوایا جائے گا ۔

اس نے صرف پیشوائیت ہی کو ختم نہیں کیا بلکہ خود سلسلۂ نبوت کو بھی یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ نوع انسان کی راہ نمائی کے لئے جس قدر اصولی تعلیم کی ضرورت تھی اسے مکمل شکل میں دے کر (قرآن کی دفتین میں) ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا گیا ہے ۔ اب انسان ، ان اصولوں کی روشنی میں ، زندگی کے بدلنے والے تقاضوں کا حل اپنے علم و بصیرت کی رو سے خود تلاش کرے ۔ اب یہ بچہ جوان ہو گیا ہے ۔ اب اسے کسی انگلی پکڑ کر چلانے والے کی ضرورت نہیں رہی ۔ اس کے سامنے قرآن کے اصول اور ان کی عملی شکل اس نظام کا نقشہ ہے جسے محمد رسول اللہ والذین معہ نے قائم کیا تھا ۔ اس کے بعد اسے کسی ”آنے والے“ کے انتظار کی ضرورت نہیں ۔ جسے آنا تھا وہ آخری بار ساری دنیا کے لئے بشیر و نذیر بن کر آ گیا ۔

علامہ اقبال کے الفاظ میں :

> اس نقطۂ خیال سے دیکھئے تو پیغمبر اسلام دنیائے قدیم و جدید کے درمیان بطور حد فاصل کھڑے دکھائی دیں گے ۔ اگر یہ دیکھا جائے کہ آپ کی وحی کا سرچشمہ کیا ہے تو آپ دنیائے قدیم سے متعلق نظر آئیں گے ۔ لیکن اگر اس حقیقت پر نظر کی جائے کہ آپ کی وحی کی روح کیا ہے تو آپ کی ذات‌گرامی دنیائے جدید سے متعلق نظر آئے گی ۔ آپ کی بدولت زندگی نے علم کے ان سر چشموں کا سراغ پا لیا جن کی اسے اپنی نئی شاہراہوں کے لئے ضرورت تھی ۔ اسلام کا ظہور

> استقرائی علم کا ظہور ہے ۔ اسلام میں نبوت اپنی تکمیل کو پہنچ گئی اور اس تکمیل سے اُس نے خود اپنی خاتمیت کی ضرورت کو بے نقاب دیکھ لیا ۔ اس میں یہ لطیف نکتہ پنہاں ہے کہ زندگی کو ہمیشہ کے لئے عہد طفولیت میں نہیں رکھا جا سکتا ۔ اسلام نے دینی پیشوائی اور وراثتی بادشاہت کا خاتمہ کر دیا ۔ قرآن کریم غور و فکر اور تجارب و مشاہدات پر بار بار زور دیتا ہے اور تاریخ اور فطرت دونوں کو علم انسانی کے ذرائع ٹھیراتا ہے ۔ یہ سب اسی مقصد کے مختلف گوشے ہیں جو ختم نبوت کی تہ میں پوشیدہ ہے ۔
>
> (خطبات)

جہاں تک توہم پرستیوں کا تعلق تھا اس نے ان کا خاتمہ یہ کہ کر کر دیا کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے انسان کے لئے تابع تسخیر کر دیا گیا ہے ۔ ’’ یہ وہ ملائکہ ہیں جو آدم کے سامنے سجدہ ریز ہیں‘‘ ۔ لہذا انسان کا مظاہر فطرت میں سے کسی کے سامنے جھکنا یا کسی سے ڈرنا تذلیل آدمیت اور تحقیر شرف انسانیت ہے ۔ انسان کو قوانین الٰہیہ کے آستانۂ عالیہ پر جھک کر دنیا کی چوکھٹ سے بے نیاز سرفرازانہ انداز سے آگے بڑھ جانا چاہئے ۔

اس نے غلامی کا یہ کہ کر خاتمہ کر دیا کہ خدا نے ہر انسان کو محض انسان ہونے کی جہت سے واجب التکریم بنایا ہے اس لئے کسی انسان کو اس کا حق نہیں پہنچتا کہ وہ دوسرے انسان کو اپنا غلام بنائے ۔ باقی رہے مدارج ، سو ان کا معیار سیرت و کردار کی بلندی اور فرائض شناسی و حسن کارکردگی ہے اور یہ میدان تمام افراد انسانیہ کے لئے یکساں طور پر کھلا ہے ۔

ہست ایں میکدہ و دعوت عام است ایں جا
قسمت بادہ باندازۂ جام است ایں جا

اس نے انسان اور انسان میں غلط معیاروں کے مطابق تفریق و تقسیم کو کسی خاص معاشرہ ، خاص قوم ، خاص خطۂ زمین ھی میں نہیں مٹایا ۔ اس نے اعلان کر دیا کہ تمام اقوام عالم اصل کے اعتبار سے ایک ھی درخت کی شاخیں اور ایک ھی برادری کے اجزاء ھیں ۔ لہذا رنگ ، نسل ، خون ، زبان ، وطن کے خود ساختہ معیاروں کے مطابق نوع انسان کو قبیلوں اور قوموں میں تقسیم کر دینا اور پھر ایک قوم کا دوسری قوم کے مقابلہ میں محاذ قائم کر لینا اور یوں اس جنت ارضی کو درندوں کا بھٹ بنا لینا ، انسانیت نہیں سبعیت و بہیمیت ھے ۔ انسانوں میں تفریق و تقسیم کا معیار صرف ایک ھے ۔ اور وہ یہ کہ جو لوگ انسانیت کے بلند نصب العین حیات پر یقین رکھیں وہ ایک برادری کے فرد اور جو اس کے برعکس ذاتی مفاد پرستیوں کے پیچھے لگ کر اس عالمگیر برادری کے تصور کی مخالفت کریں ، وہ دوسری قوم کے افراد ۔ بالفاظ دیگر قومیت کا معیار ، آئڈیالوجی کا اشتراک ھے نہ کہ نسل اور وطن کا اشتراک ۔ سرمایہ پرستی کے قارونی استبداد کو اس نے یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ ذرائع رزق اور وسائل پیداوار (ارضی) کو تمام نوع انسان کی پرورش کے لئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاھئے ۔ کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ انہیں ذاتی ملکیت سمجھ کر ان پر سانپ بن کر بیٹھ جائے ۔ جہاں تک دولت کا تعلق ھے ، ضرورت سے زاید دولت کسی شخص کے پاس نہیں رھنی چاھئے ۔ تمام افراد معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کی ذمہ داری معاشرے (نظام) پر ھونی چاھئے ۔ جو معاشرہ اس ذمہ داری کو پورا نہیں کرتا اسے حق نہیں کہ وہ زمام کار اپنے ھاتھ میں رکھے ۔ انسانی آزادی کا بنیادی نقطہ یہ ھے کہ کوئی فرد اپنی کسی ضرورت کے لئے ، کسی دوسرے فرد کا محتاج نہ ھو ۔

کس نباشد در جہاں محتاج کس
نکتۂ شرع مبیں این است و بس

یہ تھیں انسانی استبداد کی وہ زنجیریں جنھیں ایک ایک کرکے توڑا گیا ۔ لیکن اس استبداد کا ایک گوشہ ایسا ہے جو ابھی تک ہمارے سامنے نہیں آیا ۔ دنیا میں مَردوں نے ایک افسانہ تراشا کہ ”آدم کو جنت سے نکلوانے کا باعث اس کی بیوی تھی“ اور اس کے بعد یہ فتویٰ صادر کر دیا کہ تمام فتنے اور فساد کی جڑ عورت ہے اس لئے اس پر جس قدر سختی کی جائے، کم ہے ۔ تم تاریخ انسانیت پر نگاہ ڈالو اور دیکھو کہ ظہور نبویؐ سے پہلے دنیا میں عورت کی حالت کیا تھی؟ اس حالت پر غور کرو اور پھر اس اعلان عظیم کو دیکھو کہ پیدائش کے اعتبار سے مرد اور عورت کی حیثیت یکساں ہے اور فطری فرائض کے اعتبار سے اگر مرد کو عورت پر فضیلت حاصل ہے تو ویسی ہی فضیلت عورت کو مرد پر بھی حاصل ہے ۔ فتنہ و فساد کا سرچشمہ نہ عورت ہے نہ مرد ۔ دونوں میں لغزش کا امکان اور استقامت کی صلاحیت موجود ہے ۔

یہ ہیں عزیزم! وہ چند اہم اصول جن کی بنیادوں پر نبی اکرمؐ نے ایک ایسا معاشرہ استوار کیا جس نے ہر نظام کہن کی بساط الٹ کر، استبداد کی ہر اس زنجیر کو توڑ دیا جو انسانی صلاحیتوں کی نشو و نما کے راستے میں آہنی دیوار بن کر حائل تھی ۔ قرآن نے اس تمام داستان کو چند الفاظ میں اس حسن و خوبی سے سمٹا کر رکھ دیا ہے کہ جب نگۂ بصیرت اس پر غور کرتی ہے تو روح وجد میں آ جاتی ہے ۔ تم ان آیات کو سامنے لاؤ، جن میں نبی اکرمؐ کو رحمۃ للعالمین کہہ کر پکارا گیا ہے اور پھر دیکھو کہ قرآن نے اس حقیقت کبریٰ کی کس حسین و جمیل انداز سے نقاب کشائی کی ہے ۔ قبل اس کے کہ ان آیات کو سامنے لایا جائے تم ایک مرتبہ پھر اس داستان کہن کو دھرا لو کہ حضورؐ کے ظہور قدسی سے پہلے دنیا کا نظام کیا تھا؟ نظام یہ تھا کہ ”جس کی لاٹھی اس کی بھینس“ ۔ جس نے کسی طرح قوت حاصل کر لی، اقتدار کی مسندوں

پر قابض ہو گیا ۔ اور پھر یہ قبضہ و اختیار ، یہ سطوت و اقتدار ، اس کی اولاد میں وراثتاً منتقل ہوتا چلا آیا ۔ اس میں نہ استعداد و قابلیت کا کوئی سوال تھا نہ صلاحیت کی کوئی شرط ۔ اس پس منظر میں دیکھو کہ وہ نظام جسے اس رحمة للعالمینؐ کے مقدس ہاتھوں نے متشکل فرمایا ، اس کا اصل الاصول کیا تھا ؟ فرمایا وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ ۔ ” ہم نے ہر آسمانی کتاب میں ، اخلاق اقدار و ضوابط بیان کر دینے کے بعد لکھ دیا تھا (اور اب اس بنیادی حقیقت کو قرآن میں دہراتے ہیں) کہ زمین کا نظم و نسق صرف ان لوگوں کے ہاتھ میں رہنا چاہئے جن میں اس کی صلاحیت ہو“ ۔ (صلاحیت میں قلب و دماغ دونوں کی صلاحیت آجاتی ہے) ۔ تم غور کرو سلیم! کہ قرآن نے اس مختصر سے ٹکڑے میں کتنے بڑے انقلاب کا اعلان کیا ہے جس سے نظم و نسق اور اقتدار و اختیار کے تمام سابق معیار الٹ کر ان کی جگہ صرف صلاحیت نے لے لی ۔ اِنَّ فِي هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِيْنَ اس انقلاب آفریں اصول میں ، اس قوم کے لئے جو قوانین الٰہیہ کی محکومی اختیار کرے ، ایک بڑی دور رس حقیقت پوشیدہ ہے ۔ اس کے بعد ہے ۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (۲۱/۱۰۵-۱۰۹) ۔

> ”یوں اے رسول ! تمہاری بعثت تمام اقوام عالم کے لئے وہ قالب ، وہ ذریعہ ، وہ (Pattern) بن جاتی ہے جس کے اندر رہتے ہوئے افراد انسانیہ کی مضمر صلاحیتوں کی نشو نما ہو سکتی ہے ۔

تم نے سلیم ! حضور رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ کی بعثت سے پہلے کی ہزاروں سال کی

تاریخ کا مطالعہ کیا ہے ۔ اس کے بعد تم اس ظہور قدسی کے بعد کی چودہ سو سال کی تاریخ پر نگاہ ڈالو اور دیکھو کہ زندگی کے وہ اصول جنہیں قرآن نے عطا کیا اور جن کی روشنی میں نبی اکرمؐ نے ایک نظام جدید کی بنیاد ڈالی، کس طرح وہ قالب بن گئے جن کے اندر نوع انسان کی دبی ہوئی صلاحیتوں نے انگڑائی لے کر آنکھ کھولی ۔ اور پھر یہ سبزۂ نورستہ دیکھتے ہی دیکھتے شادابیوں اور شگفتگیوں کا لالہ زار بن گیا ۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں ورنہ میں مغرب کے غیر مسلم مفکرین ، مصنفین اور مؤرخین کے سینکڑوں آراء و اقوال پیش کرتا جن میں انہوں نے اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ حضور رحمۃ للعالمین کا ظہور نہ ہوتا تو اس خاکدان کی رنگینیاں اور رعنائیاں کبھی اس ہجوم و وفور سے تبسم ریز و کیف بار نہ ہوتیں ۔ اس وقت میں صرف (Briffault) کی شہرۂ آفاق کتاب (The Making of Humanity) کا ایک اقتباس دیتا ہوں ۔ تم دیکھو کہ یہ نامور مورخ اس حقیقت کا اعتراف کن الفاظ میں کرتا ہے ۔ وہ لکھتا ہے :

> یورپ کی نشاۃ ثانیہ پندرھویں صدی میں نہیں ہوئی بلکہ اس وقت ہوئی جب یورپ عربوں کے کلچر سے متاثر ہوا ۔ یورپ کی خلقت جدیدہ کا گہوارہ اٹلی نہیں بلکہ اندلس ہے ۔ ادھر روما کی تہذیب گرتے گرتے بربریت کی حد تک پہنچ چکی تھی اور ادھر دنیائے اسلام ، تہذیب و ذہنی تحریکات کا مرکز بن رہی تھی ۔ انہی شہروں میں وہ نئی زندگی نمودار ہوئی جسے انسانی ارتقاء میں ایک نئے باب کا اضافہ کرنا تھا ۔ جس وقت یہ نئی تہذیب محسوس طور پر سامنے آئی ، دنیا حیات نو سے آشنا ہوئی ۔ اگر عرب نہ ہوتے تو یورپ کی تہذیب کا وجود ہی عمل میں نہ آتا ۔ ان کے بغیر یہ یقیناً اس خصوصیت کو حاصل نہ کر سکتا تھا جس نے اسے ارتقائی مراحل میں بلند ترین سطح

> پر لا کھڑا کیا ہے ۔ ویسے تو مغربی کلچر میں کوئی شعبہ بھی ایسا نہیں جس میں عربی ثقافت کا رنگ نہ جھلکتا ہو ۔ لیکن ایک شعبہ ایسا ہے جس میں یہ اثر بالکل نکھر کر سامنے آجاتا ہے ۔ اور یہی وہ شعبہ ہے جو در حقیقت عصر حاضر کی حقیقی قوت کا باعث اور اس کی فتوحات کا ذریعہ ہے ۔ یعنی علم الاشیاء ، سائنس کی روح ۔ ہماری سائنس صرف اُسی حد تک عربوں کی رهین منت نہیں کہ انہوں نے ہمیں عجیب و غریب نظریات و انکشافات سے رو شناس کرایا ، نہیں! بلکہ ہماری سائنس کا وجود ہی ان کا شرمندۂ احسان ہے ۔ اسلام سے پہلے دنیا کا زمانہ در حقیقت زمانۂ قبل از سائنس (Pre-Scientific) تھا ۔ پندرھویں صدی تک یورپ انہی علوم و فنون کو اپناتا رہا ۔ جو اُسے مسلمانوں نے دئے تھے ۔ اس پر کوئی اضافہ نہ کر سکا ۔ جب اندلس میں تہذیب و ثقافت نے پھر تاریکیوں کی چادر اوڑھ لی ، تو یورپ میں وہ جِن نمودار ہوا جسے اندلس کی سر زمین نے پیدا کیا تھا ۔ یورپ کو زندگی صرف سائنس نے دی ۔ اسلام کے گوناگوں اثرات اُس کی حرارت کا موجب بنے ۔

سلیم ! حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں جہاں جہاں انسانی صلاحیتوں کی نمود نظر آتی ہے یہ صدقہ ہے اس ”رحمت“ کا جسے تمام اقوام عالم کے لئے عام کر دیا گیا تھا ۔ دنیا قرآنی اصولوں اور اُس کی روشنی میں متشکل کردہ قرآنی نظام کے کئی ایک گوشوں کو اپنا چکی ہے ۔ بعض گوشوں کو اپنانے کی کوشش کر رہی ہے ۔ اور باقی گوشے ایسے ہیں جنہیں یہ مستقبل میں جا کر اپنائے گی ، اس لئے کہ ان کے بغیر نہ انسانی صلاحیتیں اپنی نشوو ارتقا کی آخری حد تک پہنچ سکتی ہیں ۔ نہ حسن کائنات میں نکھار پیدا ہو سکتا ہے ۔ لہذا بزم ہستی میں جہاں کوئی

روشنی کی کرن نظر آتی ہے وہ اسی آفتاب عالمتاب کی ضیا باریوں کے تصدق ہے اور گلشن عالم میں جہاں کوئی پھول مہکتا دکھائی دیتا ہے وہ اسی جان بہار کی نکہت باریوں کا رہین منت ہے ۔

هر کجا بینی جہان رنگ و بُو   آنکه از خا کش بروید آرزُو
یا ز نور مصطفیٰ ص او را بہاست   یا هنوز اندر تلاش مصطفیٰ ص است

میں نے جو کچھ ابھی کہا ہے وہ محض اظہار عقیدت نہیں ۔ وہ ایک واقعہ ہے جو ہر اس آنکھ کے سامنے بے نقاب ہو کر آ سکتا ہے جس پر تعصب کی پٹی نہ بندھی ہو ۔ آخر میں میں (Lamartine) کی مشہور تصنیف (Histore de la Turque) کا ایک اقتباس دینا چاہتا ہوں ۔ اقتباس طویل ضرور ہے ۔ لیکن حضور رحمة للعالمین کی شان اقدس میں ، ایک غیر مسلم کی زبان سے اس سے بہتر ”نعت“ کم از کم میری نظر سے نہیں گذری ۔ تم اسے غور سے دیکھو اور اس شہادت میں میرے ہمنوا ہو جاؤ ۔ وہ لکھتا ہے :

> دنیا میں کسی انسان نے برضا و رغبت یا طوعاً و کرهاً ، محمد کے نصب العین سے بلند نصب العین اپنے سامنے کبھی نہیں رکھا ۔ یہ نصب العین عام انسانی سطح سے بہت بلند تھا ، مافوق البشر نصب العین ۔ یہ نصب العین کیا تھا ؟ خدا اور بندے کے درمیان جو توہمات کے پردے حائل ہو چکے تھے انہیں ایک ایک کرکے اُٹھا دینا اور اس طرح خدا کو انسان کے سینے میں سمو دینا اور انسان کو خدائی صفات کے رنگ میں رنگ دینا ، اور باطل خداؤں کے ھجوم میں ایک منزہ خدا کا مقدس اور معقول تصور پیش کرنا ۔ آج تک کبھی کسی انسان نے اس کی همت نہیں کی کہ اس قسم کے عظیم الشان

کام کا بیڑہ اٹھائے جو اس طرح انسانی مقدرت سے باھر ھو اور اس کے ذرائع اس قدر مسدود ھوں۔ اس لئے کہ نہ اس وقت جب اس نے اس اھم فریضہ کا تصور کیا تھا اور نہ اُس وقت جب اُس کی عملی تشکیل کے لئے قدم اُٹھایا تھا، اُس کے پاس اپنی ذات یا صحرا کے ایک گوشے میں بسنے والے مٹھی بھر انسانوں سے زیادہ کوئی ساز و سامان اور ذریعہ اور وسیلہ تھا۔ اس فقدان ذرائع کے ساتھ آج تک کبھی کسی انسان نے دنیا میں اس قسم کا عظیم اور مستقل انقلاب پیدا نہیں کیا۔ وہ انقلاب جس کا نتیجہ یہ تھا کہ دو سو سال کے اندر اندر، اسلام عملاً اور اعتقاداً تمام عرب پر حکمرانی کر رھا تھا اور اس نے خدا کے نام پر، ایران، خراسان، مغربی ھندوستان، شام، مصر، حبش، شمالی افریقہ کا تمام وہ علاقہ جو اُس وقت دریافت ھو سکا تھا، اور بحر روم کے متعدد جزائر اور ھسپانیہ تک کو فتح کر لیا تھا۔

اگر نصب العین کی بلندی، وسائل کی کمی اور نتائج کی درخشندگی، انسانی نبوغ (Human Genius) کا معیار ھیں تو وہ کون ھے جو اس باب میں محمد ص کے مقابلہ میں کسی اور انسان کو پیش کرنے کی جرأت کر سکے۔ دنیا کے اور بڑے بڑے انسانوں نے صرف اسلحہ، قانون یا سلطنتیں پیدا کیں۔ وہ زیادہ سے زیادہ مادی قوتوں کی تخلیق کر سکے جو اکثر اوقات خود اُن کی آنکھوں کے سامنے راکھ کا ڈھیر ھو کر رہ گئیں۔ لیکن اس انسان نے صرف جیوش و عساکر، مجالس قانون ساز، وسیع سلطنتوں، قوموں اور خاندانوں کو ھی حرکت نہیں دی بلکہ اُن کروڑوں

انسانوں (کے قلوب) کو بھی جو اس زمانہ کی آباد دنیا کے ایک تہائی حصہ میں بستے تھے - اور ان سے بھی کہیں زیادہ اس شخصیت نے قربان گاھوں ، دیوتاؤں ، مذاھب و مناسک ، تصورات و معتقدات ، بلکہ روحوں تک کو ھلا دیا - اس نے ایک ایسی کتاب کی اساس پر جس کا ایک ایک لفظ قانون کی حیثیت رکھتا ہے ، ایک ایسی قومیت کی بنیاد رکھی جس نے دنیا کی مختلف نسلوں اور زبانوں کے امتزاج سے ایک اُمت واحدہ پیدا کر دی - یہ لافانی اُمت اور باطل کے خداؤں سے سرکشی و تنفّر ، اور ایک خدائے واحد کے لئے والہانہ جذب و عشق، یہ ھیں دنیا میں اس عظیم ھستی کی یادگاریں - افسانوی خداؤں کے ھجوم میں ، ایک خدا کے تصور کا اعلان بجائے خویش ایک ایسا معجزہ تھا کہ جونہی یہ الفاظ اس منّاد کی زبان سے نکلے ، اس نے تمام باطل خداؤں کی عبادت گاھوں کو تباہ کر دیا - اور ایک تہائی دنیا میں آگ لگا دی - اس کی زندگی ، اس کے مراقبات ، توھم پرستی کے خلاف اس کی مجاھدانہ سعی وکاوش اور باطل خداؤں کے غیظ و غضب کو استحقار کی ھنسی سے ٹھکرا دینے کی عظیم جرأت ، مکّی زندگی میں متواتر تیرہ برس تک تمام مصائب و نوائب کے مقابلہ میں استقامت و استقلال ، مخالفین کی تکذیب و تضحیک کا خندہ پیشانی سے استقبال ، یہ تمام مشکلات اور پھر ان کے بعد اس کی ھجرت اس کی مسلسل دعوت و تبلیغ ، اس کا غیر منقطع جہاد ، اپنے مقصد کی کامیابی پر یقین محکم اور نامساعدت حالات میں اس کی مافوق البشر جمیعت خاطر ، فتح و کامرانی میں تحمل و عفو ، سلطنت سازی کی خاطر نہیں ، بلکہ اپنے الوھیاتی مقصد کی کامیابی کے لئے اس کی امنگیں اور آرزوئیں - وجد و

کیف کی دنیا میں اس کی متواتر نمازیں اور دعائیں ، اپنے اللہ سے راز و نیاز کی باتیں ۔ اس کی حیات ۔ اس کی ممات ، اور بعد از موت اس کی مقبولیت ۔ یہ تمام حقائق کس قسم کی زندگی کی شہادت دیتے ہیں ؟ کیا ایک مکذب و مفتری کی زندگی کی یا ایسے انسان کی زندگی کی جسے اپنے دعوے کی حقانیت پر غیر متزلزل ایمان ہو ! اس کا یہی کوہ شکن ایمان تھا جس نے اس میں ایسی لرزہ انگیز اور بے پناہ قوت پیدا کر دی تھی کہ اس نے اپنے عقیدہ کو زندہ اور پایندہ بنا کر دکھا دیا ۔ یہ عقیدہ کیا تھا ؟ خدا کی توحید اور تنزیہہ ۔ اول الذکر ، یہ بتانے کے لئے کہ خدا کیا ہے اور ثانی الذکر ، اس کی وضاحت کے لئے کہ خدا کیا نہیں ؟ وہ اِلاّ اور یہ لا ۔ ایک حصہ ، دنیا سے باطل خداؤں کو مٹانے کے لئے (خواہ اس میں تلوار کی بھی ضرورت کیوں نہ پڑے) اور دوسرا حصہ خدائے حقیقی کی مسند اجلال بچھانے کے لئے ۔

بہت بڑا مفکر ، بلند پایہ خطیب ، پیغامبر ، مقنن سپہ سالار ، تصورات و معتقدات کا فاتح ۔ صحیح نظریۂ حیات کو علیٰ وجہِ البصیرت قائم کرنے کا ذمہ دار ۔ اس نظام کا بانی جس میں باطل خدا ذہنوں تک کی دنیا میں دخل نہ پا سکیں ۔ دنیاوی سلطنتوں اور ان کے اوپر ایک آسمانی بادشاہت کا بانی ۔ یہ ہے محمد ص ۔

ان تمام معیاروں اور پیمانوں کو اپنے ساتھ لے آؤ جن سے انسانی عظمت و بلندی کو ماپا اور پرکھا جاتا ہے

اور اس کے بعد اس سوال کا جواب دو کہ

کیا دنیا میں اس سے بڑا انسان بھی کوئی ہوا ہے ؟

تم نے دیکھا سلیم ! کہ ایک حقیقت شناس ”غیر مسلم“ کی نگاہیں کہاں تک پہنچی ہیں اور اس نے اس ، رحمۃ للعالمینؐ کی جھلک کہاں کہاں اور کس کس انداز سے دیکھی ہے ؟

اس مقام پر تمہارے دل میں یہ خیال پیدا ہوگا کہ اس ” رحمت “ سے دیگر اقوام عالم کی صلاحیتیں تو بیدار ہوگئیں لیکن مسلمانوں کی صلاحیتیں یکسر پژمردہ اور مفلوج ہیں ۔ اس کی وجہ کیا ہے ؟ اس کی وجہ خود قرآن نے بیان کر دی ہے ، جہاں کہا ہے کہ حضورؐ رحمت تو ضرور ہیں لیکن صرف ان کے لئے جو ایمان لائیں ۔ وَرَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ (۹/۶۱) ۔ اب تم کہو گے کہ مسلمان ، قرآن اور صاحب قرآن پر ایمان رکھتے ہیں ۔ لیکن یہ دعویٰ غور طلب ہے ۔ مسلمان ، قرآن اور نبی اکرمؐ کے اسم گرامی کے ساتھ اپنی نسبت ضرور رکھتے ہیں لیکن نسبت رکھنے اور ایمان رکھنے میں بڑا فرق ہے ۔ ایمان رکھنے کے معنی یہ ہیں کہ قرآن کے اصولوں کو زندگی کا نصب العین بنایا جائے اور اس ضابطۂ حیات کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا جائے ۔ اس کی وضاحت قرآن نے اس مقام پر کر دی ہے جہاں حضورؐ کو رحمۃ للعالمین کہا ہے ۔ فرمایا قُلْ اِنَّمَا يُوْحٰۤى اِلَىَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۔ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (۲۱/۱۰۸) ۔ ان سے کہہ دو کہ میری طرف یہ وحی ہوئی ہے کہ تمہارا الٰہ ، جس کے قوانین کی اطاعت اختیار کرنی چاہئے ۔ صرف ایک (خدائے واحد) ہے ۔ اب بتاؤ کہ کیا تم اس کے سامنے سر تسلیم خم کرتے

ہو''؟ سوال یہ ہے کہ کیا ہمارا سر قرآن کے سامنے خم ہے، یا اس سے سرکشی برتتے ہوئے، اپنے خود ساختہ قوانین و ضوابط کے سامنے؟ غیر مسلم تو قرآن کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ:

> اس کی تعلیم کسی مقام پر بھی ناکام ثابت نہیں ہو سکتی۔ ہم اپنے تمام نظام ہائے تمدن کے باوجود اس کی حد سے آگے نہیں جا سکتے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ کوئی انسان بھی اس سے آگے نہیں جا سکتا۔
>
> (گوئٹے کا خط ایکرمن کے نام)

لیکن ہم نے اس قرآن کو غلافوں میں لپیٹ کر رکھ چھوڑا ہے اور اپنی راہ نمائی کے لئے دوسرے دروازوں پر جبہ سائی کرتے ہیں۔ کیا ایمان اسی کو کہتے ہیں؟ لہذا، اگر ہماری صلاحیتیں نشو و نما نہیں پاتیں تو اس میں قصور کس کا ہے؟ سورج اسی کو روشنی دے سکتا ہے جو اپنی آنکھیں کھول کر رکھے۔ بارش اسی زمین کے لئے نفع بخش ثابت ہو سکتی ہے جو اس کے قطروں کو اپنے اندر جذب کرنے کے لئے اپنی آغوش وا کر دے۔ ہم نے اس سحاب کرم کی طرف سے اپنے لب بند کرکے، دنیا کے ہر چشمۂ تہذیب و تمدن کو آزما کر دیکھ لیا۔ کیا کہیں سے آب حیات کی ایک بوند بھی ہمارے لئے وجہ سیرابی ہوئی؟ کیا اس کے بعد بھی وقت نہیں آیا کہ ہم پھر آسی ابرنیساں کی طرف رجوع کریں جس کی گہر افشانیوں نے ایک بار ہماری زمین مردہ کو اس طرح زندگی اور شادابی عطا کی تھی کہ اس سے ساری دنیا پر بہار آگئی تھی۔ یاد رکھو سلیم! جیسا کہ میں معراج انسانیت میں لکھ چکا ہوں:

> خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا آخری مرتبہ کہہ دیا۔ شرف انسانیت کی تکمیل کے لئے جو قوانین دئے

جانے تھے وہ اپنی انتہائی شکل میں دے دئے گئے ۔ اب اس کے بعد انسان کو اپنی منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے کسی دوسری مشعل راہ کی ضرورت اور کسی ہادی طریقت کی احتیاج نہ رہی ۔ اب انسانیت کے مقام بلند تک پہنچنے کے لئے وہی ایک صراط مستقیم ہے جس پر آس ذات اقدس و اعظم کے نقوش قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور جنہیں دیکھ کر ہر خبیر و بصیر پکار اٹھتا ہے کہ

مقام خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق دل بند و راہ مصطفیٰ ص رو

ہمیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ اس قرآنی نظام کے علاوہ جسے حضور رحمة للعالمین نے ساری دنیا کے لئے وجۂ شادابی قلب و نگاہ بنایا تھا، انسان کے لئے نجات و سعادت کی کوئی اور راہ نہیں ۔ یہی وہ مساعد فضا ہے جس میں ہر تخم صالح بڑھتا، پھولتا، پھلتا ہے ۔ کشجرة طیبة اصلها ثابت و فرعها فی السماء ۔ اگر صحن عالم اس کی نسیم سحری سے محروم ہو جائے تو اس کی تمام سر سبزیاں اور شادابیاں جھلس کر رہ جائیں ۔

ہو نہ یہ پھول تو بلبل کا ترنم بھی نہ ہو
چمن دہر میں کلیوں کا تبسم بھی نہ ہو
یہ نہ ساقی ہو تو پھر مے بھی نہ ہو خم بھی نہ ہو
بزم توحید بھی دنیا میں نہ ہو تم بھی نہ ہو
خیمہ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے
نبض ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے

إِنَّ اللّٰهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۔

والسلام

پرویز

اکتوبر ۱۹۵۸ء

تیئیسواں خط

(درود کا مفہوم)

اس میں بھائی ! برا منانے کی کوئی بات نہیں کہ میں نے طاہرہ کے خط کا جواب پہلے دیا اور تمہارے خط کا جواب بعد میں دے رہا ہوں۔ بات صاف ہے اور اس میں مجھے کسی اخفاء کی ضرورت نہیں کہ جب بھی بیٹی اور بیٹے میں موازنہ ہوگا تو میری میزان میں بیٹی کا پلڑا ہمیشہ جھکے گا۔ اسے تم "جذبات" کہہ کر اپنے دل کو تسکین دے لو تو اور بات ہے۔ ورنہ میرے نزدیک تو یہ زندگی کی اٹل حقیقت ہے کہ ع

از اوست پختہ تر تعمیرِ ما در خطِ سیمائے او تقدیر ما

جو بات تم نے پوچھی ہے اس تک پہنچنے سے پہلے اگر تم قرآن کی دو آیتوں کو سامنے لے آؤ تو مسئلہ بہت آسان ہو جائے گا۔ سورۂ ابراہیم کی پہلی آیت یہ ہے کہ کِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ (۱۴/۱)۔ یہ قرآن ہم نے تیری طرف اس لئے نازل کیا ہے کہ اس کے ذریعے تو نوع انسان کو ظلمت (تاریکیوں) سے نکال کر نور (روشنی) کی طرف لے آئے (اور) ان کے نشو و نما

دینے والے کے قانون کے مطابق انہیں زندگی کے اس توازن بدوش راستے پر ڈال دے جو جلال و جمال ، غلبہ و قوت ، اور حسن و تزئین سب کچھ عطا کر دیتا ہے ، کیونکہ وہ اُس خدا کی طرف لے جانے والا راستہ ہے جو اُن تمام صفات کا مالک ہے ۔ اس آیۂ جلیلہ میں قرآن کی خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ اس کے ذریعے نوع انسان ظلمت سے نور کی طرف آ سکتی ہے ۔ اس میں لفظ ظلمات (تاریکیاں) جمع کے صیغے میں آیا ہے ، جس سے مراد ہر قسم کی تاریکیاں ہیں ۔ عقائد و تصورات کی تاریکیاں ۔ رسوم و مناسک کی تاریکیاں ۔ تمدن و معاشرت کی تاریکیاں ۔ سیاست و معیشت کی تاریکیاں ۔ غرضیکہ زندگی کے ہر گوشے کی تاریکی سے روشنی کی طرف لے آنے والی کتاب ۔ ان تاریکیوں کی تفصیل قرآن کے مختلف مقامات میں دی گئی ہے ۔ لیکن خود اسی سورہ میں تین ہی آیات کے بعد ، ایک ایسا ٹکڑا آتا ہے جس نے ساری بات کو واضح کرکے رکھ دیا اور نکھار کر سمجھا دیا ہے کہ ظلمات کسے کہتے ہیں اور نور کیا ہوتا ہے ۔ فرمایا وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی بِاٰیٰتِنَا اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَکَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ ($\frac{۱۳}{۵}$) ۔ ہم نے موسیٰ کو اپنے احکام و قوانین دے کر بھیجا اور اُس سے کہا کہ وہ اُن کے ذریعہ اپنی قوم کو ظلمات سے نور کی طرف لے جائے ۔ قرآن کی اس آیت نے خود بتا دیا کہ قوموں کی زندگی میں ظلمات کسے کہتے ہیں اور وہ نور کی وادی میں کس طرح داخل ہوتی ہیں ۔ فرعون کی محکومیت میں قوم بنی اسرائیل جس قسم کی زندگی بسر کر رہی تھی اُسے ظلمات سے تعبیر کیا گیا ہے ۔ اس کی مزید تشریح کی ضرورت نہیں کہ اُس دور میں بنی اسرائیل کی حالت کیا تھی ۔ تورات اور قرآن دونوں میں اس داستان الم انگیز کی تفاصیل ملتی ہیں ۔ حضرت موسیٰؑ ضابطۂ خداوندی کے مطابق اس قوم کو فرعون کی محکومیت سے نکال کر بیت المقدس کی اُن وادیوں

میں لے آئے جہاں ان کے اور اُن کے خدا کے درمیان کوئی دوسری قوت حائل نہ تھی اور جہاں انہیں اس امر کی پوری پوری آزادی حاصل تھی کہ وہ اپنے خدا کے قوانین کے ماتحت زندگی بسر کریں۔ اس کو قرآن نے نور سے تعبیر کیا ہے۔

حضرت موسیٰؑ ایک قوم (بنی اسرائیل) کو ظلمات سے نکال کر نور کی طرف لے آئے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے نبی اکرمؐ کے متعلق کہا ہے کہ ان کی بعثت کا مقصد یہ ہے کہ وہ قرآن کے ذریعے پوری کی پوری نوع انسان کو ظلمات سے نکال کر نور کی طرف لے آئیں گے۔ یعنی جو قومیں قرآن کا اتباع کریں گی وہ دنیا میں ہر قسم کی غلامی سے نجات حاصل کرکے ایسی آزادی کی نورانی منزل میں پہنچ جائیں گی جہاں ان پر صرف ان کے خدا کے قوانین کی حکومت ہوگی۔ ظاہر ہے کہ قرآن کے اس دعویٰ کا عملی تجربہ نبی اکرمؐ کے مقدس ہاتھوں سے ہوا۔ آپ نے اپنی قوم کی تربیت قرآن کی روشنی میں کی اور ساری دنیا نے دیکھ لیا کہ وہ قوم کس طرح ظلمات سے نکل کر نور کی طرف آ گئی۔ یہ کچھ کیسے ہوا تھا؟ قرآن اور تاریخ میں اس کی تفاصیل موجود ہیں۔ ان کا ماحصل یہی ہے کہ محمد رسول اللہ والذین معہ نے اپنے یقین محکم اور عمل پیہم سے باطل کی ہر قوت کا مقابلہ کیا۔ اور اُسے شکست دے کر فاتح و منصور آگے بڑھتے چلے گئے تا آنکہ عہد جاہلیت کی تمام انسان ساز تاریکیاں ایک ایک کرکے چھٹ گئیں اور ”زمین اپنے نشو و نما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھی“۔ اس جہاد مسلسل میں قوانین خداوندی کی تائید و نصرت اس جماعت کے ساتھ تھی۔ یعنی جب ان کا ہر قدم اُس قانون کے مطابق اُٹھتا تھا تو اُس قانون کے اتباع سے جس قدر درخشندہ نتائج مرتب ہونے تھے وہ سب مرتب ہوتے چلے جاتے تھے۔ قرآن ہمیں یہ بھی بتاتا ہے

کہ جو قوم قوانین خداوندی کے مطابق چلتی ہے کائناتی قوتیں (جنہیں قرآن ملائکہ کہہ کر پکارتا ہے) بھی اس کا ساتھ دیتی ہیں۔ کائناتی قوتوں میں کچھ تو وہ ہیں جو طبعی دنیا سے متعلق ہیں اور جن کی تسخیر سے انسان، حدود فراموش قوتیں حاصل کرتا چلا جاتا ہے۔ کچھ قوتیں اس کی نفسیاتی دنیا سے متعلق ہیں۔ قانون خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے سے یہ قوتیں بھی انسان کا ساتھ دیتی ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کا سینہ متضد قوتوں (Contradictions) کی رزمگاہ بننے کی بجائے سکون و طمانیت کی جنت بن جاتا ہے۔ تم تو سلیم! علم النفس (Psychology) کے طالب علم ہو۔ اس لئے تم اس حقیقت کو خوب سمجھ سکتے ہو کہ جس انسان کے دل میں تضادات کی کشمکش جاری ہو۔ وہ ہمیشہ وقف اضطراب رہتا ہے۔ اور اس کی توانائیاں اسی کشمکش کی نذر ہو جاتی ہیں۔ اس کے برعکس جو شخص ان تضادات میں توافق پیدا کرے، اس کی تمام توانائیاں اس کے پیش نظر مقصد کے حصول میں صرف ہوتی ہیں۔ اسے قرآن ملائکہ کی تائید کہتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا۔ جن لوگوں نے اس حقیقت کا اقرار کر لیا کہ ہماری نشو و نما کا مالک اللہ ہے۔ یعنی یہ اسی کے قانون ربوبیت کے مطابق مل سکتی ہے۔ اور پھر اس ایمان پر جم کر بیٹھ گئے اس طرح کہ کوئی چیز ان کے پائے استقامت میں لغزش نہ پیدا کر سکے۔ تَتَنَزَّلُ عَلَیْہِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ ان پر ملائکہ کا "نزول" ہوتا ہے۔ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا جو ان سے آ کر کہتے ہیں کہ تم کسی قسم کا خوف نہ کرو۔ نہ افسردہ خاطر ہو۔ یعنی ملائکہ کے نزول کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے دل سے خوف و حزن جاتا رہتا ہے۔ اور صرف اتنا ہی نہیں (کیونکہ خوف و حزن کا جاتے رہنا تو محض منفی نتیجہ

(Negative Result) ہے) ۔ بلکہ مثبت (Positive) کامرانیاں اپنی انتہائی درخشندگی و تابناکی سے ان کے سامنے آ جاتی ہیں ۔ وَأَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ (۴۱/۳۰) ۔ اور اُن سے کہتے ہیں کہ تم اس جنت کی خوشخبری لو جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا ۔ نَحْنُ أَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِی الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِی الْاٰخِرَةِ (۴۱/۳۱) ۔ ہم دنیاوی زندگی میں بھی تمہارے رفیق و دمساز ہیں اور مستقبل کی زندگی میں بھی ۔ یہی تھی ملائکہ کی وہ تائید جو جماعت مومنین کو بدر کے میدان میں حاصل ہوئی تھی اور جس کے متعلق سورۂ انفال میں ہے اِذْ يُوْحِیْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّیْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۔ سَاُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ (۸/۱۲) ۔ جب تیرے نشو و نما دینے والے نے ملائکہ کو حکم دیا کہ میں بھی تمہارے ساتھ ہوں ۔ تم جماعت مومنین کو ثابت قدم رکھو ، اُن کے پائے استقامت میں لغزش نہ آنے پائے ۔ میں اُن کے مخالفین کے دل میں اُن کا رعب طاری کر دوں گا ۔

یہ ہے سلیم ! خدا اور ملائکہ کی تائید و نصرت جو جماعت مومنین کو حاصل ہوتی ہے تاکہ وہ اپنے جہاد مسلسل سے ” ظلمات سے نور “ کی طرف آ جائیں ۔ اسی کو سورۂ احزاب کی اس آیت میں (جس کا مطلب تم نے دریافت کیا ہے) ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے ۔ هُوَ الَّذِیْ يُصَلِّیْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا (۳۳/۴۳) ۔ اے جماعت مومنین ! خدا اور اس کے ملائکہ تم پر اپنی رحمت اور برکت نازل کرتے ہیں ۔ ان کی تائید و نصرت تمہارے

ساتھ ہے۔ تاکہ وہ تمہیں ظلمات سے نور کی طرف لے جائے۔ مومنین پر اللہ کی رحمت ہوتی ہے۔ وہ ان کی پوری پوری نشو و نما کرتا ہے۔ اور ان کی کوششوں کو بھرپور نتائج سے نوازتا ہے۔ یہ کچھ کس طرح ہوتا ہے؟ اس کا جواب اس سے پہلی دو آیات میں ہے جہاں کہا کہ یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْکُرُوا اللّٰہَ ذِکْرًا کَثِیْرًا ۔ وَّ سَبِّحُوْہُ بُکْرَۃً وَّ اَصِیْلًا (۳۳/۴۱-۴۲)۔ جماعت مومنین! تم قوانین خداوندی کو ہر وقت اپنی نگاہوں کے سامنے رکھو۔ اس طرح کہ وہ کبھی تمہاری نظروں سے اوجھل نہ ہونے پائیں۔ اور اس کے متعین فرمودہ پروگرام کی تکمیل میں صبح و شام (ہمیشہ اور مسلسل) سرگرم عمل رہو۔ تم ایسا کرو تو اس کے بعد تم دیکھو گے کہ خدا اور اس کے ملائکہ کی تائید و نصرت کس طرح تمہارے ساتھ رہتی ہے۔ اور تم کس طرح ظلمات پر قابو پا کر اپنی زندگی کو نورانیت میں لے آتے ہو۔

یہ کچھ تو جماعت مومنین کے لئے کہا۔ اور اسی چیز کو نبی اکرمؐ کے لئے خصوصیت سے دہرایا جہاں فرمایا۔ اِنَّ اللّٰہَ وَ مَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ ۔ اللہ اور اس کے ملائکہ نبی پر برکات و رحمت نازل کرتے ہیں۔ ان کی تائید و نصرت رسول اللہؐ کے ساتھ ہے۔ یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ ۔ اے جماعت مومنین! تم بھی ایسا کرو کہ تمہاری تائید و نصرت رسول کے ساتھ رہے۔ یہ وہی چیز ہے جسے دوسری جگہ ان الفاظ میں کہا گیا کہ فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِہٖ وَ عَزَّرُوْہُ وَ نَصَرُوْہُ (۷/۱۵۷)۔ وہ لوگ جو اس رسول پر ایمان لائیں اور عظمت مندانہ انداز سے اس کی تائید و نصرت کریں۔ سورہ فتح میں ہے وَ تُعَزِّرُوْہُ وَ تُوَقِّرُوْہُ

(۴۸/۹) ۔ اب سوال یہ ہے کہ جماعت مومنین صَلُّوْا عَلَیْہِ کا فریضہ ادا کس طرح سے کرے ؟ اس کا جواب خود قرآن نے اس مقام پر دے دیا جہاں فرمایا کہ صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا (۳۳/۵٦) ۔ وہ اپنی تائید و نصرت رسول کے ساتھ رکھیں ۔ یعنی اس کی کامل اطاعت کریں ۔ یہ ہے سلیم ! صلوا علیہ کا عملی مفہوم ۔ اس مقام پر قرآن نے اطاعت کے لئے سلموا تسلیما کہا ہے ۔ اس کی تشریح دوسرے مقام پر اس طرح کر دی کہ فَلَا وَرَبِّکَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَھُمْ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْ اَنْفُسِھِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَیُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا (۴/٦۵) تیرا نشو و نما دینے والا اس حقیقت پر شاہد ہے کہ یہ لوگ اپنے دعویٰ ایمان میں کبھی سچے نہیں ہو سکتے جب تک ان کی عملاً یہ حالت نہ ہو کہ اپنے تمام متنازعہ فیہ امور میں تمہیں (اے رسولؐ) حکم بنائیں اور پھر جو فیصلہ تو دے اس کے متعلق اپنے دلوں کے اندر بھی کوئی گرانی محسوس نہ کریں ۔ اور اس طرح یہ تیری پوری پوری اطاعت کریں ۔ یہ ہے مفہوم سَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا کا ۔ اس مقام پر یہ کہا اور سورۂ اعراف کی جس آیت کا ایک حصہ اوپر نقل کیا گیا ہے یعنی عَزَّرُوْہُ وَنَصَرُوْہُ اس کا باقی حصہ یہ ہے وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْۤ اُنْزِلَ مَعَہٗۤ (۷/۱۵۷) ۔ مومنین پر لازم ہے کہ وہ اس رسول کی تائید و نصرت کریں ۔ یعنی اس کتاب کی اتباع کریں جو اس کے ساتھ نازل کی گئی ہے ۔

اب تم سلیم ! ان مختلف ٹکڑوں کو ملاؤ تو بات بالکل صاف ہو

جائے گی کہ:

۱- رسول اللہؐ کی بعثت کا مقصد یہ تھا کہ حضور قرآن کے ذریعے نوع انسان کو ظلمت سے نور کی طرف لے آئیں (۱۴/۱) ۔

۲- ظلمت سے نور کی طرف آنے کا عملی مفہوم وہ ہے جو حضرت موسیٰؑ نے بنی اسرائیل کے ساتھ کیا ۔ یعنی اس قوم کو انسانوں کی محکومی سے نکال کر خالص قوانین خداوندی کی اطاعت میں لے آنا (۱۴/۵) ۔

۳- اللہ اور اُس کی کائناتی قوتیں اپنی تائید و نصرت جماعت مومنین کے ساتھ رکھتی ہیں ۔ تاکہ وہ ظلمت سے نکل کر نور کی طرف آ جائیں (۳۳/۴۳) ۔

۴- اللہ اور اُس کی کائناتی قوتوں کا یہی عمل خود رسول اللہؐ کے ساتھ بھی ہے (۳۳/۵۶) ۔

۵- اور مومنین کو خدا کا حکم ہے کہ وہ بھی رسولؐ کے ساتھ یہی عمل رکھیں ۔ یعنی اپنی تائید و نصرت اُس کے ساتھ شامل رکھیں ۔ اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ وہ رسولؐ کی پوری پوری اطاعت کریں (۳۳/۵۶) ۔

۶- رسولؐ کی اطاعت سے مفہوم قرآن کی اطاعت ہے (۷/۱۵۷) ۔

اس سے تم نے سلیم ! سمجھ لیا ہوگا کہ یَا اَیُّھَا الّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْماً ایک بہت بڑا عملی پروگرام ہے جس

سے مراد ہے جماعت مومنین کی طرف سے پوری پوری اطاعت ، اور اس سے مقصود یہ ہے کہ یہ جماعت خود بھی ظلمات سے نکل کر نور کی طرف آ جائے۔ اور اس کے بعد تمام نوع انسان کو نور کی طرف لے آئے۔ ظاہر ہے سلیم ! کہ یہ پروگرام چند الفاظ کے دھرا دینے سے تو پورا ہو نہیں سکتا۔ یہ تو مسلسل جہاد چاہتا ہے۔

تم نے سلیم ! یہ دیکھ لیا ہے کہ سورۂ ابراہیم میں جہاں قرآن کا مقصود یہ بتایا گیا ہے کہ وہ انسانیت کو ظلمات سے نور کی طرف لانے کا ذریعہ ہے وہاں اس کی عملی توضیح' حضرت موسیٰؑ اور قوم بنی اسرائیل کی مثال سے دی گئی ہے (۱۴/۵) اب تم یہ دیکھو کہ جہاں جماعت مومنین سے کہا گیا ہے کہ صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (۳۳/۵۶) اس سے اگلی آیت میں ہے کہ اِنَّ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ (۳۳/۵۷) ”جو لوگ اللہ اور رسول کو ایذا پہنچاتے ہیں ، وہ دنیا اور آخرت میں نعمائے خداوندی سے محروم رہ جاتے ہیں“۔ یہاں سلموا تسلیما کے بالکل برعکس یؤذون آیا ہے۔ لہذا خدا اور رسولؐ کو ایذا دینے کے معنی ہیں ان کی سرکشی اور معصیت ، عدم اطاعت ، یہ بعینہ وہ چیز ہے جو نبی اسرائیل نے کی تھی۔ چنانچہ چند ہی آیات آگے جا کر اس کی تشریح کر دی جہاں فرمایا کہ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اٰذَوْا مُوْسٰى (۳۳/۶۹) اے جماعت مومنین ! دیکھنا کہیں تم نے اس قوم کی طرح نہ ہو جانا جس نے موسیٰؑ کو اذیت پہنچائی تھی۔ قوم بنی‌اسرائیل نے کس کس طرح حضرت موسیٰؑ کے احکام و ہدایات کی نافرمانی کی تھی ، اس کی تفصیل قرآن کے مختلف مقامات

میں موجود ہے۔ اس سے بھی ظاہر ہے کہ یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا سے مراد پوری پوری اطاعت ہی ہے۔

سورۂ احزاب کی اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے جماعت مومنین کو صلوا علیہ کا حکم دیا ہے۔ لیکن سورۂ توبہ میں خود رسول اللہ سے کہا گیا ہے کہ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً .... وَصَلِّ عَلَیْهِمْ اِنَّ صَلٰوتَکَ سَکَنٌ لَّهُمْ (۹/۱۰۳) یعنی جب یہ لوگ اس مقصد عظیم کے لئے مال و دولت لے کر آئیں تو ان کی یہ پیشکش قبول کیا کرو۔ اس کے بعد ہے، و صل علیہم، ان الفاظ کا مفہوم ظاہر ہے۔ جب کسی جماعت کے افراد اپنے فرائض کی ادائیگی میں اس حسن کارانہ انداز سے جدوجہد کریں گے تو مرکز جماعت کی زبان پر بے ساختہ تحسین و آفرین کے الفاظ آجائیں گے۔ وہ اُنھیں شاباش دے گا، اُن کے حق میں نیک دعائیں مانگے گا، اُن کے حسن عمل کو سراہے گا، اور اُن کی پیشکش کو تبریک و تہنیت کے جذبات سے قبول کرے گا۔ قرآن نے اس تمام کیفیت کو صل علیہم کی جامع اصطلاح میں بیان کر دیا ہے اور اس کے بعد اس نفسیاتی کیفیت کا بھی اظہار کر دیا ہے کہ اِنَّ صَلٰوتَکَ سَکَنٌ لَّهُمْ کہ تیری طرف سے تبریک تہنیت اور تحسین و آفریں کا اظہار اُن کے لئے سکون قلب کا باعث ہوگا۔ جماعت کے جانفروش مجاہدین کو جب یہ معلوم ہو کہ اُن کے اعمال کو شرف قبولیت عطا ہو رہا ہے۔ اُن کا قائد ان کی تصویب (Approve) کرتا ہے۔ صرف تصویب ہی نہیں بلکہ اسکی تحسین (Appreciation) بھی ان کے ساتھ ہے۔ تو اس سے ان کے حوصلے بہت بڑھ جاتے ہیں۔ وہ اور والہانہ انداز سے اپنے فرائض کی تکمیل میں منہمک ہو جاتے ہیں۔ یہ ہے

رسولؐ کی وہ صلوٰۃ جو جماعت کے لئے وجہ سکون قلب بنتی ہے۔

لیکن یہ ظاہر ہے سلیم! کہ اس حوصلہ افزائی (یا تبریک و تحسین) سے مراد یہ ہوتی ہے کہ جو کچھ تم کر رہے ہو، اسے ہماری تائید (Support) حاصل ہے۔ ہم اس کام میں تمہارے ساتھ ہیں۔ اس مفہوم کے پیش نظر بھی جب ہم سورۂ احزاب کی زیر نظر آیات کو دیکھتے ہیں تو بات واضح ہو جاتی ہے۔ ایک طرف جماعت مومنین سے کہا گیا کہ هُوَ الَّذِیْ یُصَلِّیْ عَلَیْکُمْ وَ مَلٰٓئِکَتُهٗ یعنی جس گرمجوشی اور سرفروشی سے تم اس پروگرام کی تکمیل میں مصروف سعی و عمل ہو، اسے دیکھ کر ہماری اور کائناتی قوتوں کی زبان پر بے ساختہ تہنیت و تبریک اور تحسین و آفرین کے الفاظ آجاتے ہیں۔ ہم تمہارے اس عمل کو بے حد پسند کرتے ہیں۔ جس سے مطلب یہ ہے کہ ہماری تائید تمہارے ساتھ ہے۔ دوسری طرف خود رسولؐ اللہ کے متعلق فرمایا کہ اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِکَتَهٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ اس مقصد کے حصول میں خود رسولؐ بھی جس مجاہدانہ سعی و عمل کا مظاہرہ کر رہا ہے اس سے خدا اور اس کی کائناتی قوتیں اس پر تہنیت و تبریک کے پھول برساتی ہیں۔ جس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ اسے ہماری پوری پوری تائید حاصل ہے۔ اس کے بعد یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْهِ۔ اے جماعت مومنین! اس رسول کی اس جد و جہد پر تم بھی غلغلہ ہائے تبریک و تحسین بلند کرو اور اس طرح اسے بتا دو کہ تمہاری تائید بھی اس کے ساتھ ہے۔ لیکن اس کا عملی طریقہ یہ ہے کہ سَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا (۳۳/۵۶) تم اس کا پورا پورا ساتھ دو۔ اس کی کامل اطاعت کرو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم ظلمت سے نور کی طرف آ جاؤ گے۔

تم نے دیکھ لیا سلیم! کہ دونوں صورتوں میں مفہوم ایک ہی ہے۔ یعنی

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (۳۳/۵۶)

مجاہدانہ سعی و عمل اور جانفروشانہ طاعت و فرماں پذیری کا ایک عملی پروگرام ہے۔ اس حقیقت کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھو سلیم! کہ خدا کی کتاب جماعت مومنین کو کچھ کرنے کا پروگرام دینے کے لئے آئی تھی۔ جب قوم سے قوت عمل جاتی رہی تو رفتہ رفتہ کرنا، پڑھنے میں بدلتا چلا گیا۔ اور اس کے متعلق اس سے زیادہ اور کیا کہا جائے کہ

واماندگیٔ شوق تراشے ہے پناہیں

اُمید ہے۔ ان اشارات میں تمہیں اپنے سوال کا جواب مل گیا ہوگا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں بیماری کی وجہ سے ابھی اس سے زیادہ مفصل خط نہیں لکھ سکتا۔

والسلام

پرویز

اکتوبر ۱۹۵۵ء

چوبیسواں خط

(اطاعت رسول ص)

ہاں سلیم! یہ بات سمجھنے کی ہے اور اچھی طرح سے سمجھنے کی۔

دین کا مقصود و مطلوب یہ ہے کہ انسان کو دوسرے انسانوں کی محکومی سے نکال کر قوانین خداوندی کی اطاعت میں لایا جائے۔ اس کے لئے اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ:

> مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ
> وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ
> مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبَّانِيّٖنَ (۳/۷۸)۔
>
> کسی انسان کو اس کا حق نہیں پہنچتا کہ اللہ اسے کتاب اور حکومت اور نبوّت دے اور وہ لوگوں سے کہے کہ تم اللہ کو چھوڑ کر میری محکومی اختیار کرو۔ اسے یہی کہنا چاہئے کہ تم سب ربّانی بن جاؤ۔

اسی حقیقت کو اس نے دوسری جگہ ان الفاظ میں دہرایا ہے کہ

اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ ۔ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاہُ ۔
ذٰلِکَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ ۔ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ
لَا یَعْلَمُوْنَ (١٢/٤٠) ۔

(یاد رکھو) حکومت صرف اللہ کے لئے ہے ۔ اس نے حکم دیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی اور کی محکومیت اختیار نہ کرو ۔ یہی دین محکم ہے ۔ لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے ۔

اس مقام پر اس حقیقت کو بھی سمجھ لینا چاہئے کہ قرآن کی رُو سے خدا کی محکومیت اور خدا کی عبادت سے مراد ایک ہی ہے ۔ یعنی قوانین خداوندی کی اطاعت ۔ مندرجہ بالا آیت میں دیکھو، پہلے کہا کہ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ حکومت صرف اللہ کے لئے ہے ۔ اور اس کے بعد کہا کہ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاہُ ۔ اس نے حکم دیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی اور کی عبادت مت کرو ۔ اب ظاہر ہے کہ اگر عبادت سے مراد پرستش لی جائے ، تو آیت کے کچھ معنی ہی نہیں بنتے ۔ یعنی حکومت صرف اللہ کے لئے ہے ، تم صرف اسی کی پرستش کرو ۔ خدا کی پرستش تو ہر حکومت میں ہو سکتی ہے ۔ اقوام متحدہ نے ” بنیادی حقوق انسانیت “ کا جو منشور شائع کیا ہے اس میں ” پرستش کی آزادی “ کو انسانوں کا بنیادی حق قرار دیا ہے ۔ اور اسے تمام اقوام عالم نے تسلیم کیا ہے ۔ اس لئے پرستش کے لئے خدا کی حکومت کا موجود ہونا ضروری نہیں ۔ خدا کی پرستش تو ہم انگریز

کے عہد حکومت میں بھی کرتے تھے ۔ اور آج ہندوستان کا مسلمان بھی خدا کی پرستش کرتا ہے ۔ اس لئے قرآن کی رو سے خدا کی عبادت سے مراد ہی اس کی محکومیت اختیار کرنا ہے ۔ اسی حقیقت کو قرآن نے سورۂ کہف کی دو آیات میں یوں واضح کیا ہے ۔ ایک جگہ ہے :

> لَا يُشْرِكُ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖ اَحَدًا ($\substack{۱۸\\۱۱۰}$) ۔
>
> اسے چاہئے کہ خدا کی عبادت میں کسی اور کو شریک نہ کرے ۔

اور دوسری جگہ ہے :

> لَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖ اَحَدًا ($\substack{۱۸\\۲۶}$) ۔
>
> خدا اپنی حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا ۔

دیکھو ! ایک جگہ عبادت کا لفظ آیا ہے اور اسی مفہوم کے لئے دوسری جگہ حکومت کا لفظ ۔

اس مقام پر اس نقطہ کی وضاحت اس لئے بھی ضروری سمجھی گئی ہے کہ ذرا آگے چل کر اس سے "مذہب" اور "دین" کا فرق سمجھ میں آسکے گا ۔

ہاں تو بات یہ ہو رہی تھی کہ اطاعت اور محکومیت صرف خدا کی ہو سکتی ہے کسی انسان کی نہیں ۔

لیکن خدا تو ہمارے سامنے (محسوس شکل میں) نہیں آتا ۔ ہم اس کے احکام کو براہ راست سن نہیں سکتے ۔ اس لئے اس کی اطاعت کس طرح کی جائے ؟

اس کے لئے اس نے خود ھی بتا دیا کہ یہ اطاعت اس کتاب کی رو سے کی جائے جسے اس نے نازل کیا ھے۔

> اَفَغَیْرَ اللّٰہِ اَبْتَغِیْ حَکَمًا وَّھُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ اِلَیْکُمُ الْکِتٰبَ مُفَصَّلًا (٦/١١٥)۔
>
> کیا میں خدا کے سوا کسی اور کو حاکم بنا لوں۔ حالانکہ اس نے تمہاری طرف اپنی وہ کتاب نازل کر دی ھے جو ھر بات کو نکھار کر بیان کر دیتی ھے۔

اس کتاب کے علاوہ اور کسی کی اطاعت جائز نہیں۔ کیونکہ وہ غیر اللہ کی اطاعت ھو جائے گی:

> اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِہٖٓ اَوْلِیَآءَ۔ قَلِیْلًا مَّا تَذَکَّرُوْنَ (٧/٣)۔
>
> تم اس کتاب کی اتباع کرو جو تمہارے خدا نے تمہاری طرف نازل کی ھے۔ اور اس کے سوا کسی کارساز کی اتباع نہ کرو۔ (لیکن) بہت کم لوگ ھیں جو اس اھم حقیقت کو اپنے سامنے رکھتے ھیں:

یہی کفر اور ایمان کا نقطۂ امتیاز ھے۔

> وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ (٥/٤٤)۔
>
> جو اس کے مطابق فیصلے نہیں کرتا جسے خدا نے نازل کیا

ہے تو یہی لوگ کافر ہیں۔

اگر خدا کی اطاعت سے مقصود محض خدا کی پرستش (Worship) پوجاپاٹ، بندگی ہوتا تو ہر شخص اپنی اپنی جگہ خدا کی کتاب کی اطاعت کر سکتا تھا۔ کوئی مندر میں، کوئی مسجد میں، کوئی صومعہ میں، کوئی کلیسا میں، کوئی خانقاہ میں، کوئی زاویہ میں۔ ”مذہب“ کی رو سے خدا کی اطاعت کا یہی مفہوم ہے۔ اس کی رو سے ”مذہب“ خدا اور بندے کے درمیان پرائیویٹ تعلق کا نام ہے جسے عملی زندگی سے کچھ واسطہ نہیں۔ لہٰذا ”مذہب“ میں ہر انسان اپنے اپنے طور پر خدا کی اطاعت کرتا ہے۔

لیکن ”دین“ کی رو سے حقیقت یہ نہیں۔ اس کی رو سے خدا کی اطاعت سے مفہوم یہ ہے کہ انسان اور انسان کے مابین جس قدر متنازعہ فیہ امور ہوں اُن کا فیصلہ قوانین خداوندی کی رو سے کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ صورت پیدا نہیں ہو سکتی جب تک کوئی ایسا مقام نہ ہو جہاں سے دو فریق اپنے متنازعہ فیہ معاملہ کا فیصلہ کرائیں۔ اس کے لئے کسی حَکم کی ضرورت ہوگی۔ بالفاظ دیگر، مذہب میں ہر شخص خدا کی اطاعت انفرادی طور پر کرتا ہے۔ لیکن دین میں خدا کی اطاعت اجتماعی طور پر کرائی جاتی ہے۔ لہٰذا مذہب میں اطاعت کے لئے صرف خدا کی کتاب کافی ہوتی ہے۔ لیکن دین میں خدا کی اطاعت کے لئے کتاب کے علاوہ کسی جیتی جاگتی شخصیت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اسلام، دین (نظام) ہے، مذہب نہیں۔ اس لئے اس میں تنہا کتاب کافی نہیں، اس کتاب کے مطابق اطاعت خداوندی کرانے والا بھی ضروری ہے۔ یہ مرکزی شخصیت خدا کا رسول ہوتا ہے۔ جو لوگ رسول کی اطاعت ضروری نہیں سمجھتے اور اطاعت کے لئے مجرد قرآن کو کافی سمجھتے ہیں وہ دین اسلام کو اس ”مذہب“ کی سطح پر لے جاتے ہیں جو دیگر

اقوام عالم میں رائج ہے۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ خدا نے کتاب کے ساتھ ہمیشہ رسول کو بھیجا، جس کی اطاعت خدا کی اطاعت ہوتی ہے کیونکہ رسول، خدا ہی کی اطاعت کراتا ہے۔ لہٰذا

وَمَنْ يُطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (۴/۸۰)۔

جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی۔

لیکن یہ اطاعت رسول کی ذات کی اطاعت نہیں ہوتی۔ کیونکہ (جیسا کہ شروع میں کہا جا چکا ہے) اللہ تعالیٰ نے واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ کسی نبی کو بھی اس کا حق نہیں پہنچتا کہ وہ لوگوں سے اپنی اطاعت کرائے۔ اس لئے خود رسول اللہؐ سے کہہ دیا گیا کہ اس نے لوگوں کے متنازعہ فیہ امور کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق کرنے ہیں:

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ (۵/۴۸)۔

تم ان کے درمیان کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کرو۔

اب بات یہ ہوئی کہ خدا کی اطاعت براہ راست نہیں کی جا سکتی۔ اس کی اطاعت رسول کی وساطت سے کی جا سکتی ہے۔ لیکن رسول چونکہ بشر ہوتا ہے، اور کسی بشر کی اطاعت جائز نہیں، اس لئے رسول کی اطاعت اس کی اطاعت نہیں بلکہ خدا کی اطاعت ہوتی ہے، اگرچہ نظر بظاہر اطاعت اسی (رسول) کے فیصلوں ہی کی ہو رہی ہوتی ہے۔ انسان اور خدا کے قانون کی اطاعت کا یہ فرق اتنا لطیف اور باریک تھا کہ آج سے چودہ سو سال پہلے جب لوگ اشخاص (بادشاہوں) کی اطاعت ہی کے خوگر تھے اور نظام (قانون) کی اطاعت کو (Appreciate) نہیں کر سکتے تھے، اس فرق کو سامنے لانا

قرآن ہی کا اعجاز تھا۔ وہ ایک جگہ اللہ کی اطاعت کا ذکر کرتا ہے تو اس خیال سے کہ اس سے لوگ اپنے اپنے طور پر ”خدا پرستی اور نیک عملی“ کی زندگی نہ سمجھ لیں، ساتھ ہی رسول کی اطاعت کا بھی ذکر کر دیتا ہے۔ لیکن پھر اس خیال سے کہ اس سے کہیں ایک شخص کی اطاعت نہ سمجھ لی جائے (جیسا کہ بادشاہوں کی اطاعت ہوتی تھی) پھر توجہ کو اللہ کی طرف منعطف کرا دیتا ہے اور یوں اللہ سے رسول اور رسول سے اللہ کی طرف لے جاتا ہوا اس اہم حقیقت کو اچھی طرح سے ذہن نشین کراتا چلا جاتا ہے۔ سورۂ نساء کی مندرجہ ذیل آیات میں دیکھو کہ اس لطیف نکتہ کو کس حسن و خوبی سے بیان کیا گیا ہے۔ پہلے اس اصول کو بیان کیا کہ وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللہِ۔ ہم نے ہر رسول کو اس لئے بھیجا تھا کہ اللہ کے حکم کے مطابق اس کی اطاعت کی جائے۔

اس اصولی حقیقت کے بیان کرنے کے بعد اس کے عملی پہلو کو سامنے لایا گیا اور کہا وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ جَاءُوْكَ۔ ان لوگوں سے جب قانون شکنی ہو گئی تھی۔ ان سے جب کوئی جرم صادر ہو گیا تھا۔ انہوں نے حکم خداوندی کی خلاف ورزی کی تھی تو اس کے ازالے کی شکل یہ نہیں تھی کہ یہ اپنی اپنی جگہ ”توبہ استغفار“ کر لیتے۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ جَاءُوْكَ یہ تیرے پاس آتے۔ اس سے ظاہر ہے کہ دین (نظام خداوندی) میں کسی ایسی شخصیت کا ہونا ضروری ہے جس کی طرف لوگ رجوع کریں۔

لیکن اس سے ذہن اس طرف جا سکتا تھا کہ اس باب میں صاحب اختیار (خدا نہیں بلکہ) وہ شخصیت ہے جس کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ اس لئے

اس کے ساتھ ہی کہہ دیا کہ جَاءُوْكَ ۔ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ آتے تو تیرے پاس لیکن اپنے جرم کی پاداش سے حفاظت (Protection) (جسے عرف عام میں معافی یا بخشش کہتے ہیں) اللہ سے مانگتے۔ اس سے پھر ذہن اس طرف جا سکتا تھا کہ اگر اللہ ہی سے حفاظت طلب کرنی تھی تو یہ اپنے اپنے ہاں براہ راست خدا سے معافی مانگ لیتے ۔ اس کے لئے رسول کے پاس آنے کی ضرورت کیا تھی؟ اس لئے اس کی وضاحت کر دی فَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ ۔ یہ حفاظت طلبی اورعفو خواہی ، خدا اور بندے کے درمیان انفرادی طور پر (براہ راست) نہیں ہو سکتی ۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ رسول بھی بیچ میں ہو اور وہ ان کے لئے حفاظت طلب کرے ۔

اب ظاہر ہے کہ یہ معافی رسول ہی کی زبان سے عطا ہوئی ۔ لیکن اس خیال سے کہ یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ اس میں خدا کا تو کوئی واسطہ ہی نہیں رہا اسے پھر دہرایا دیا کہ اگر وہ ایسا کرتے کہ اپنی حفاظت طلبی اور عفو خواہی کے لئے رسول کے پاس آتے اور رسول (حالات کے مطالعہ اور ان کی بات سننے کے بعد) مطمئن ہو جاتا کہ آن کا جرم (قانون خداوندی کی رو سے) قابل معافی ہے تو وہ آنہیں معافی دے دیتا ۔ لیکن یہ معافی درحقیقت قانون خداوندی کی رو سے معافی ہوتی لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا (۴/۶۴) تو یہ اللہ کو توبہ قبول کرنے والا اور سامان رحمت عطا کرنے والا پاتے ۔

اس کے بعد ، اگلی آیت میں بات صاف کر دی کہ دین میں متنازعہ فیہ امور میں خدا کے احکام کی اطاعت کی عملی شکل کیا ہے ۔ فرمایا کہ فَلَا وَرَبِّكَ

لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ۔ نہیں یہ بات نہیں (جیسا کہ یہ لوگ مذہب کے پرانے تصور کے مطابق اپنے دل میں سمجھے بیٹھے ھیں) ۔ بات یہ ھے کہ تیرا رب اس حقیقت پر شاھد ھے کہ یہ لوگ (خدا کا مطیع ھونا تو ایک طرف) مومن بھی نہیں ھو سکتے جب تک یہ اپنے متنازعہ فیہ امور میں تجھے (ک) اپنا حکم نہ بنائیں (پہلی آیت میں ”جَاءُوْكَ“ کہا گیا تھا ۔ اس سے مراد یہی تھی) یہ تجھے حکم بنائیں ۔ تو فیصلہ دے اور یہ تیرے فیصلہ کی اطاعت کریں ۔ لیکن کیسی اطاعت ؟ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (۵/۶۵) ۔ پھر جو کچھ تو فیصلہ کرے اس کے خلاف اپنے دل میں بھی کسی قسم کی گرانی محسوس نہ کریں اور اس کی پوری پوری اطاعت کریں ۔ اس لئے کہ انسان کسی فیصلہ کے خلاف دل میں گرانی اس وقت محسوس کرتا ھے جب وہ سمجھے کہ یہ شخص اپنا حکم منوا رھا ھے ۔ لیکن جب حقیقت یہ ھو کہ وہ قانون کی اطاعت کرا رھا ھو تو پھر اس اطاعت سے دل میں کبیدگی پیدا ھونے کا مطلب یہ ھے کہ آپ کو اس قانون کی صداقت پر ایمان نہیں ۔ اس لئے شروع میں کہا گیا تھا کہ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ......

(۴) تصریحات بالا سے واضح ھے کہ خدا کی اطاعت درحقیقت قوانین خداوندی (کتاب اللہ) کی ایسی اطاعت ھے جو اس رسول کی وساطت سے کی جائے جو اس قانون کو نافذ کرتا ھے ۔ اسی کو قرآن میں ” اللہ اور رسول کی اطاعت “ کہا گیا ھے ۔ اگر اس سے خدا اور رسول کی الگ الگ اطاعتیں مراد لی جائیں تو یہ چیز خود قرآن کے اس واضح اصول کے خلاف

چلی جائے گی کہ کسی بشر کو اس کا حق حاصل نہیں ، خواہ اسے خدا نبوّت و کتاب ہی کیوں نہ عطا کر دے کہ وہ لوگوں سے اپنی اطاعت کرائے۔ (۳/۷۸) اور خدا نے رسول کو بار بار بشر (بَشَرٌ مِثْلُكُمْ) کہا ہے ۔ قرآن نے اس حقیقت کو (کہ یہ دو الگ الگ اطاعتیں نہیں بلکہ ایک ہی اطاعت ہے) نہایت بلیغ انداز میں بیان کیا ہے اور وہ اس طرح کہ " اللہ اور رسولؐ" کا ذکر کرکے ، اس کے بعد ضمائر (Pronouns) واحد لائی گئی ہیں ۔ اور فعل کے صیغے بھی واحد (حالانکہ عربی قاعدے کی رو سے ان مقامات میں ضمائر اور صیغے تثنیہ کے آنے چاہئیں تھے) ۔ مثلاً

> يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۔
> وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ ۔ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ (۸/۲۰) ۔

> اے جماعت مومنین ! تم اللہ اور اس کے رسول ؐ کی اطاعت کرو اور اس سے رو گردانی مت کرو ۔ درآنحالیکہ تم سن رہے ہو ۔

دیکھو ! یہاں " اللہ اور رسول ؐ" (دو) کا ذکر ہے اور عَنْهُ میں ضمیر واحد ہے ۔ (نیز وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ سے یہ حقیقت بھی واضح ہے کہ اطاعت اسکی کی جاتی ہے جس کی بات سنی جا سکے ، جو محسوس طور پر درمیان میں موجود ہو ۔ جو محسوس طور پر موجود نہ ہو ، عملی معاملات میں اس کی اطاعت کی ہی نہیں جا سکتی) ۔

اسی طرح سورۂ انفال میں دوسری جگہ ہے :

> یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاکُمْ لِمَا یُحْیِیْکُمْ (۸/۲۴)۔
>
> اے جماعتِ مومنین ! تم اللہ اور رسول ص کی دعوت کا جواب دو ۔ جب وہ تمہیں اس بات کی طرف بلائے جو تمہیں (موت سے نکال کر) زندگی عطا کر دے ۔

یہاں بھی ” اللہ اور رسول “ کا ذکر ہے اور صیغہ (دَعَاکُمْ) واحد کا ہے ۔ اسی طرح سورۂ نور میں ہے :

> وَاِذَا دُعُوْا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِیَحْکُمَ بَیْنَهُمْ اِذَا فَرِیْقٌ مِّنْهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۔ وَاِنْ یَّکُنْ لَّهُمُ الْحَقُّ یَاْتُوْا اِلَیْهِ مُذْعِنِیْنَ (۲۴/۴۸-۴۹)۔
>
> اور جب ان لوگوں کو ” اللہ اور رسول ص “ کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ وہ ان کے متنازعہ فیہ امور میں فیصلہ کرے ۔ تو ان میں کا ایک فریق اس سے گریز کرتا ہے اور اگر ان کا کوئی حق کسی پر واجب ہو (جس سے وہ سمجھ لیں کہ فیصلہ ان کے حق میں جائے گا تو) وہ اس کی طرف سر جھکائے ہوئے چلے آتے ہیں ۔

یہاں بھی ” اللہ اور رسول ص “ کی طرف بلائے جانے کا ذکر ہے ۔ لیکن لِیَحْکُمَ میں صیغہ واحد ہے اور اِلَیْهِ میں ضمیر واحد کی ۔ اسی طرح کی اور مثالیں بھی ہیں ۔ اس انداز بیان کا سمجھ لینا ہمارے دور میں

کچھ مشکل نہیں۔ اسلئے کہ ہمارے ہاں بھی گورنمنٹ (حکومت) یانظام یا اجتماعی (Organisation) کے لئے واحد ہی کے صیغے استعمال ہوتے ہیں ۔ یہی مفہوم قرآن کے ان مقامات میں ہے ۔

۵۔ یہ حقیقت کہ ” اللہ اور رسول ص “ سے مراد وہ نظام یا نظامِ مرکز (امام ، امیر) ہے جو اللہ کے قانون کو عملاً نافذ کرتا ہے ، قرآن کے دیگرِ مقامات سے بھی واضح ہے ۔ مثلاً سورۂ انفال میں ہے :

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ۔ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ
وَلِلرَّسُوْلِ ($\frac{۸}{۱}$)

تجھ سے مالِ غنیمت کے بارے میں پوچھتے ہیں ۔ ان سے
کہ دو کہ مالِ غنیمت ” اللہ اور رسول “ کا ہے ۔

اس آیت میں ذرا آگے چل کر ہے :

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ
وَلِلرَّسُوْلِ.... ($\frac{۸}{۴۱}$) ۔

اور جان رکھو کہ جو کچھ تمہیں مالِ غنیمت سے ملے اس
کا پانچواں حصہ ” اللہ اور رسول ص “ کے لئے ہے ۔

ان تمام مقامات میں (نیز $\frac{۵}{۳۳}$) میں جہاں ” اللہ اور رسول ص “ کے خلاف جنگ ، بغاوت کرنے کے جرم کی سزائیں لکھی ہیں) ” اللہ اور رسول ص “ سے مراد امام یا امیر یا اسلامی نظام ہے ۔ یہ مفہوم انوکھا نہیں ، بلکہ شروع ہی سے ایسا سمجھا جاتا رہا ہے اور اب بھی ایسا ہی سمجھا جاتا ہے ۔

اس پر خود ہمارے دور کی تفسیریں شاہد ہیں۔

۶۔ ان تصریحات کی روشنی میں اس آیت کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ جس میں اللہ اور رسول ص اور اولی الامر کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔ وہ آیت یہ ہے:

> يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَطِيْعُوا اللّٰهَ
> وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُوْلِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ۔
> فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ
> وَ الرَّسُوْلِ (۴/۵۹)۔
>
> اے ایمان والو! تم اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول ص کی اور اپنے میں سے صاحب اختیار لوگوں کی۔ پھر اگر کسی معاملہ میں تمہیں اختلاف (منازعت) ہو تو اسے اللہ اور رسول ص کی طرف لے جاؤ۔

اس آیت میں اسلامی نظام کا پورا نقشہ دیدیا گیا ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ ''اللہ اور رسول ص'' کی اطاعت اس نظام خداوندی کی اطاعت ہے جسے سب سے پہلے رسول اللہ ص نے متشکل فرمایا۔ اس نظام میں تمام متنازعہ فیہ امور کے فیصلوں کے لئے رسول ص کے پاس آنے کا حکم تھا۔ لیکن جب یہ نظام مدینہ سے آگے بڑھا تو یہ عملاً ناممکن تھا کہ دور دراز کے لوگ اپنے مقدمات کے فیصلوں کے لئے مرکز کی طرف آتے۔ اس کے لئے مختلف مقامات میں ماتحت افسر (صاحبان امر) مقرر کرنے پڑے۔ ان افسروں (یا عدالتوں) کی اطاعت خود مرکزی حکومت کی اطاعت تھی۔ لیکن ایک فرق کے ساتھ۔ اور وہ یہ کہ

مرکزی حکومت کے فیصلوں کے خلاف کہیں اپیل نہیں ہوسکتی تھی۔ اس کا فیصلہ حرف آخر تھا۔ لیکن ان ماتحت عدالتوں کے فیصلہ کے خلاف مرکز میں اپیل ہوسکتی تھی۔ یہ مطلب ہے اس سے کہ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَ اِلَی الرَّسُوْلِ۔ اگر تم میں اور اولی الامر (صاحبان امر۔ افسران ماتحت) میں کسی بات میں اختلاف ہو جائے تو تم ایسے معاملہ کو مرکز کی طرف (Refer) کرو۔ وہاں سے جو فیصلہ صادر ہو اس کی اطاعت تم پر فرض ہو جائے گی۔

(۷) رسول اللہ ص کے ذمے اس ضمن میں دو کام تھے۔ ایک تو متنازعہ فیہ امور میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کرنا۔ اور دوسرے کتاب اللہ نے جن قوانین کو محض اصولی طور پر بیان کیا تھا اور جن کی جزئیات کو دانستہ چھوڑ دیا گیا تھا تاکہ وہ بھی اصولوں کی طرح، ہمیشہ کے لئے غیر متبدّل نہ قرار پا جائیں (جیسا کہ $\frac{۵}{۱۰۱}$ سے ظاہر ہے) اپنے حالات کے مطابق ان کی جزئیات متعین کرنا۔ سوال یہ ہے کہ حضورؐ ان امور کو کس طرح سرانجام دیا کرتے تھے۔ کیا یہ وحی کے ذریعہ ہوتا تھا یا حضورؐ اپنے طور پر کرتے تھے ؟ جہاں تک مقدمات میں فیصلہ کرنے کا تعلق ہے بخاری کی ایک حدیث اس سوال کا جواب واضح طور پر پیش کرتی ہے۔ اس کی جلد دوم کتاب الشہادت میں ہے کہ :

> حضرت ام سلمہ رض سے روایت ہے کہ رسول اللہ ص نے ایک مرتبہ فرمایا کہ تم لوگ میرے سامنے اپنے جھگڑے پیش کرتے ہو۔ سو ایسا ہو سکتا ہے کہ تم میں سے بعض لوگ اپنے دعوے کے ثبوت میں دلائل پیش کرنے میں زیادہ تیز واقع ہوں (الحن بحجتہ من بعض) (اور میں اس سے سمجھ لوں

> کہ وہ سچا ہے اور اس کے حق میں فیصلہ دے دوں) سو اگر میں کسی شخص کو اس کے بیان کے مطابق اس کے بھائی کا حق دے دوں، تو اسے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ میں اسے آگ کا ایک ٹکڑہ دے رہا ہوں۔ اسے چاہئے کہ اسے نہ لے۔

اس سے ظاہر ہے کہ حضورؐ مقدمات کے فیصلے اپنی ذاتی بصیرت کے مطابق کیا کرتے تھے، جس کا مدار ان بیانات اور شہادات پر ہوتا تھا جو آپ کے سامنے بہ حیثیت جج کے پیش کی جاتی تھیں۔ لہذا ان میں اس کا بھی امکان تھا کہ حقدار کے خلاف فیصلہ صادر کر دیا جائے۔ اگر یہ فیصلے وحی کی رو سے ہوتے تو ان میں اس قسم کا امکان ہو نہیں سکتا تھا۔ ہم اس حدیث کو اس لئے صحیح تسلیم کرسکتے ہیں کہ یہ قرآن کی اس آیت کے مطابق ہے جس میں حضورؐ سے کہا گیا ہے کہ :

> قُلْ اِنْ ضَلَلْتُ فَاِنَّمَا اَضِلُّ عَلٰى نَفْسِىْ وَاِنِ اهْتَدَيْتُ فَبِمَا يُوْحِىْٓ اِلَىَّ رَبِّىْ (۳۴/۵۰)

> ان سے کہہ دو کہ اگر میں کسی معاملہ میں غلطی کرتا ہوں تو وہ غلطی میری اپنی وجہ سے ہوتی ہے (اس کا ذمہ دار میں خود ہوتا ہوں۔ لہذا اس کا وبال بھی مجھ پر ہی پڑے گا) اور اگر میں صحیح راستہ پر ہوتا ہوں تو وہ اس وحی کی بنا پر ہے جو میرے رب کی طرف سے میری طرف آتی ہے۔

یہ آیت اور وہ روایت ایک ہی حقیقت کو پیش کرتی ہیں۔

اب رہا جزئیات کا متعین کرنا تو اس کے لئے قرآن نے حضورؐ کو حکم دے دیا تھا کہ وَشَاوِرْهُمْ فِی الْاَمْرِ (۳/۱۵۸) تم معاملات میں ان (جماعت مومنین) سے مشورہ کیا کرو۔ اس حکم کے ماتحت یہ تمام امور باہمی مشاورت سے طے پاتے تھے۔ چنانچہ کتب روایات و سیر میں کئی واقعات مندرج ہیں جن سے ظاہر ہے کہ حضورؐ، صحابہؓ سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ مثلاً قرآن میں ہے اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ ..... (۶۲/۹) (جب تمہیں جمعہ کی صلوٰۃ کے لئے پکارا جائے) اس میں صلوٰۃ کے لئے ندا (پکارنے) کا تو ذکر ہے۔ لیکن قرآن نے اس ندا کے طریق (اذان) کو متعین نہیں کیا۔ اب یہ دیکھئے کہ اذان کس طرح سے متعین ہوئی تھی۔ مشکوٰۃ کتاب الاذان میں ہے کہ:

> عبداللہ بن زید بن عبدربہ نے کہا کہ جب رسول اللہ نے ناقوس بجانے کا حکم دیا تاکہ اُسے بجا کر لوگوں کو نماز کے لئے جمع کریں تو مجھ کو خواب میں ایک شخص دکھائی دیا جس کے ہاتھ میں ناقوس تھا۔ پس میں نے خواب ہی میں اُس سے پوچھا۔ اے اللہ کے بندے کیا فروخت کرتا ہے تو ناقوس کو*؟ اُس نے کہا تو ناقوس کا کیا کرے گا۔ میں نے کہا ہم اس سے لوگوں کو نماز کے لئے بلائیں گے۔ اُس نے کہا کیا میں تجھ کو ایسی چیز نہ بتادوں جو اس سے بہتر ہے۔ میں نے کہا ہاں۔ اُس نے کہا اللہ اکبر، اللہ اکبر

---

* چونکہ میں ان احادیث کا ترجمہ خود نہیں کر رہا اس لئے جس طرح شائع شدہ ترجمہ موجود ہے اسے اسی طرح پیش کیا جارہا ہے۔

یہ کچھ انفرادی طور پر ہو رہا تھا۔ لیکن مسلمانوں کی حکومت بھی قائم تھی۔ وہ اپنے دائرے میں اپنے قوانین و احکام کی اطاعت کراتی تھی۔ چونکہ دو متوازی حکومتیں بیک وقت چل نہیں سکتی تھیں، اس لئے ان اختیارات کی تقسیم یوں ہوئی کہ ذاتی معاملات (Personal Law) کے متعلق علماء و فقہا اتھارٹی قرار پائے اور امور سلطنت کے متعلق اتھارٹی سلاطین کی تسلیم کی گئی۔ اس طرح اسلام میں وہ ثنویت (Dualism) آ گئی جسے مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا۔ یہ ثنویت آج تک جاری ہے۔ جہاں مسلمان غیر مسلموں کی حکومت میں رہتے ہیں، وہاں دنیاوی امور میں حکومت کے قوانین کی اطاعت کی جاتی ہے اور ذاتی معاملات (Personal law) میں شریعت کی جس کے فیصلے علماء اور مفتی حضرات کرتے ہیں۔ جہاں ان کی اپنی حکومتیں ہیں وہاں بھی علماء حضرات کتاب و سنت کی تعبیر کا حق اپنے پاس رکھتے ہیں حکومت کو نہیں دیتے۔

آپ نے غور کیا کہ ایک محسوس شخصیت (مرکز ملت) کے باقی نہ رہنے سے اُمت کی زندگی کے ہر گوشے میں کس طرح انتشار ہی انتشار (Chaos) پیدا ہو گیا۔ یہ انتشار اس وقت تک چلا آ رہا ہے۔

(۱۱) اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان حالات میں کیا کیا جائے؟ اس کا جواب صاف اور واضح ہے۔ جس محسوس شخصیت (مرکز ملت) کے گم ہو جانے سے یہ سارا انتشار پیدا ہوا ہے اسے پھر سے قائم کر دیا جائے۔ جہاں سے خلافت علیٰ منہاج نبوت کا سلسلہ منقطع ہوا تھا وہیں سے اسے پھر سے جوڑ دیا جائے۔ اس وقت اسلام، دین کی شکل کو چھوڑ کر مذہب کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ اسے پھر سے دین میں تبدیل کر دیا جائے۔ پھر وہ مرکز سامنے آ جائے جسے ہم تمام متنازعہ فیہ امور میں اپنا حکم بنائیں اور اس طرح خدا

کے اس حکم کی اطاعت کر سکیں۔ فلا و ربک لا یومنون حتی یحکموك فیما شجر بینھم ($\frac{۴}{۶۵}$) ۔ ہم میں جو یہ خیال پیدا کر دیا گیا ہے کہ اب خلافت راشدہ کا سلسلہ قائم ہی نہیں کیا جا سکتا، تو یہ ناامیدی (Frustration) کا نتیجہ ہے ۔ اسلام نے قیامت تک زندہ رہنا ہے ۔ اس لئے اس میں خلافت کا سلسلہ بدستور سابق قائم کیا جا سکتا ہے ۔ یہی وہ خلافت علیٰ منہاج نبوت ہوگی :

۱۔ جو اُمت کے تمام متنازعہ فیہ امور کا فیصلہ کرے گی ۔

۲۔ جو کچھ اس وقت ہمارے پاس شریعت کے نام سے موجود ہے ، کتاب اللہ کی روشنی میں اس کا جائزہ لے گی ۔ جو کچھ اس میں غلط ہوگا اسے محو کر دے گی ۔ جس بات میں موجودہ حالات کے مطابق کسی تبدیلی کی ضرورت ہوگی اس میں مناسب تبدیلی کر دے گی ۔ باقی علیٰ حالہٖ رہنے دے گی ۔

لیکن سلیم ! جب تک خلافت کا یہ سلسلہ قائم نہیں ہو جاتا ، کسی فرد کو اس کا حق نہیں پہنچتا کہ اُمت کے امور شریعت (نماز ، روزہ ، حج ۔ زکوٰۃ وغیرہ کی جزئیات) جس طریق پر چلی آ رہی ہیں اس میں کوئی تغیر و تبدل کرے ۔ وہ صرف اتنا کر سکتا ہے کہ یہ بتا دے کہ فلاں معاملہ میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ قرآن کے مطابق نہیں ۔

(۱۲) میری کوشش یہ ہے کہ ہم میں پھر سے خلافت علیٰ منہاج نبوت کا سلسلہ قائم ہو جائے ، تا کہ ہم پھر ” اللہ اور رسولؐ “ کی اطاعت کر سکیں۔ اسی طرح جس طرح حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانے

میں " اللہ اور رسولؐ" کی اطاعت کی جاتی تھی۔ اس کے لئے میرا طریق کار یہ ہے کہ (بغیر کسی قسم کی فرقہ سازی کے) قوم کے صاحب فکر طبقہ کے سامنے یہ حقیقت لائی جائے کہ دین کا صحیح مفہوم کیا ہے اور " خدا اور رسولؐ " کی اطاعت کی عملی شکل کیا ؟

و السلام
پرویز
اکتوبر ۱۹۵۶ء

پچیسواں خط

(اسلامی قانونِ شریعت کے مآخذ)

عزیزم سلیم میاں ! تمہارا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ اس بات کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ میں اتنے عرصہ تک تمہیں خط تک نہ لکھوں ۔ لیکن غور کرو تو خود یہی چیز تمہاری شکایت کا جواب بھی ہے ۔ حالات کچھ ایسے ھی تھے جنھوں نے مجھے اتنی بھی فرصت نہ دی کہ میں تمہیں خط لکھ سکتا ! ؎

نہ آسماں بگردش و ما درمیانہ ایم
غالب دگر مپرس کہ بر ما چہ می رود

لیکن اتنے لمبے عرصہ تک خط نہ لکھنے کے معنی یہ نہیں کہ میں تمہیں بھول گیا تھا ؎

گو میں رہا رہینِ ستم ھائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

تمہارے اور طاہرہ دونوں کے کئی ایک جواب طلب خطوط میرے سامنے ھیں ۔

ان میں سے غیر ضروری امور کو چھوڑ کر ، باقی استفسارات کے متعلق کوشش کروں گا کہ ایک ایک کر کے جواب لکھتا جاؤں ۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ تمہارا سوال تو دو ایک فقروں میں ختم ہو جاتا ہے اور مجھے جواب میں صفحوں کے صفحے لکھنے پڑتے ہیں ۔ مگر اس کے سوا چارہ بھی کیا ہے ع

دستِ تہ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے

تمہارا سوال یہ ہے کہ اسلامی قانون شریعت کے ماخذ کیا ہیں ؟ یہ سوال بڑا اہم ہے ۔ بالخصوص اس لئے کہ گزشتہ کچھ عرصہ سے ملک میں آئین سازی کے سلسلہ میں ایسی فضا پیدا ہو چکی ہے جس میں اس قسم کے سوالات رہ رہ کر سامنے آتے ہیں ۔ اگرچہ مملکت کا آئین اب منظور ہو چکا ہے ۔ لیکن اس کے بعد قانون سازی کے مراحل شروع ہوں گے ۔ اس لئے اس سوال کی اہمیت اور بھی بڑھ جائے گی ۔ بات اہم ہے اس لئے ذرا توجہ سے سنو ۔

تم جس سے یہ سوال پوچھو ، اس کا جواب یہی ملے گا کہ اسلامی قانون شریعت کے ماخذ چار ہیں : قرآن ، حدیث ، اجماع اور قیاس ۔ ان عناصر اربعہ نے ایسے مسلّمہ کی حیثیت اختیار کر رکھی ہے جس پر کسی غور و فکر کی ضرورت اور بحث و نظر کی گنجائش ہی نہیں سمجھی جاتی ۔ لیکن تم میرے مسلک سے واقف ہو ، میں ان امور پر بھی غور و فکر کرتا ہوں اور دوسروں کو بھی ان میں تدبّر و تفکّر کی دعوت دیتا ہوں جو عام طور پر بطور مسلّمات مانے جاتے ہیں ۔ اس لئے کہ میرے نزدیک کسی بات کے صحیح ماننے کے معنی یہ ہیں کہ انسان اسے غور و فکر کے بعد صحیح مانے ۔ قرآن نے تو اس باب میں یہاں تک کہہ دیا ہے کہ مومن وہ ہیں کہ اِذَا ذُکِّرُوْا

بِآیَاتِ رَبِّهِمْ لَمْ یَخِرُّوا عَلَیْهَا صُمًّا وَّعُمْیَانًا (۲۵/۷۳) - جب اُن کے سامنے آیاتِ خداوندی پیش کی جائیں تو اُن پر بھی بھرے اور اندھے ہو کر نہیں گر پڑتے - جب قرآن کی خود اپنی آیات کے متعلق یہ تاکید ہے تو عام مسلّمات کے متعلق اس کی روش ظاہر ہے -

سب سے پہلے یہ دیکھو کہ ان اصطلاحات کا مروّجہ مفہوم کیا ہے ؟ واضح رہے کہ یہ موضوع یکسر فنی اور اصطلاحی ہے ، لیکن میں کوشش کروں گا کہ تمہیں فنی اصطلاحات میں الجھائے بغیر ، عام فہم الفاظ میں بات سمجھا دوں -

پہلے قیاس کو لو - اس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ جب اسلام دور دراز ملکوں تک پہنچا اور مسلمانوں کا ربط و ضبط مختلف اقوام سے ہوا ، تو اس قسم کے معاملات سامنے آئے جن کے متعلق نہ قرآن میں کوئی تفصیلی حکم موجود تھا اور نہ ھی احادیث میں ایسا حکم ملتا تھا - اس لئے فقہاء نے عقل اور رائے سے کام لے کر قرآن اور حدیث کے ملتے جلتے احکام سے زیر نظر معاملات کے متعلق نئے احکام مستنبط کئے ، اس کا نام قیاس ہے - یعنی ایک بات سے دوسری بات کا اندازہ کرنا - انگریزی میں اسے (Analogical Reasoning) کہتے ہیں - اسے ایک مثال سے یوں سمجھو کہ قرآن کی رو سے خمر (شراب) ممنوع ہے - لیکن بھنگ کے متعلق قرآن اور حدیث میں بالصراحت کوئی حکم نہیں ملتا - اب ایک فقیہہ ، جو قیاس سے کام لے گا ، وہ کہے گا کہ شراب اس لئے ممنوع ہے کہ اس میں نشہ ہوتا ہے - لہذا اگر بھنگ میں نشہ ہے تو وہ بھی ممنوع ہے - اور اس سے یہ مسئلہ مستنبط ہوا کہ ہر نشہ آور شے ممنوع ہے - اس طرح استنباط مسائل کو اجتہاد بھی کہتے ہیں - جس کے معنی کوشش کرنا (To Exert) ھیں -

قیاس کے جواز اور عدم جواز کے بارے میں بھی دو گروہ ھیں: ایک گروہ اسے بالکل ناجائز قرار دیتا ھے۔ ان کی دلیل یہ ھے کہ قرآن کریم ایک مکمل کتاب ھے جس میں ھر بات کا حکم موجود ھے۔ لہٰذا شریعت کے معاملات میں قرآن نے قیاس کی گنجائش ھی نہیں چھوڑی۔ متقدمین میں ظاھری فرقہ کے مسلمان اسی خیال کے تھے اور متاخرین میں پنجاب کے فرقہ، اھل قرآن نے اسی مسلک کو اختیار کیا تھا۔ لیکن نہ ظاھری مسلک زمین گیر ھو سکا، اور نہ ھی اھل قرآن کا فرقہ آگے بڑھ سکا۔ اس لئے کہ ان کا بنیادی تصوّر خود منشائے قرآنی کے خلاف تھا۔ اسی خیال کا ایک دوسرا گروہ وہ ھے جو یہ کہتا ھے کہ تنہا قرآن نہیں بلکہ قرآن اور حدیث دونوں کو اکٹھا کر لیا جائے تو ان میں معاملات کے احکام مل جاتے ھیں اور کوئی بات ایسی نہیں رہ جاتی جس کے لئے کسی نئے فیصلہ کی ضرورت پڑے۔ چنانچہ تمہیں یاد ھو گا کہ فسادات پنجاب کی تحقیقاتی عدالت میں محترم ابو الحسنات صاحب نے یہی کہا تھا کہ اسلام میں ھر معاملہ کے متعلق پہلے سے احکام موجود ھیں۔ اس لئے اس میں قانون سازی کی گنجائش ھی نہیں۔

جو لوگ قیاس کے حق میں ھیں وہ قرآن اور حدیث دونوں سے اپنے مسلک کی تائید پیش کرتے ھیں۔ البتہ ان میں اس باب میں اختلاف ھے کہ قیاس کی کہاں ضرورت پڑتی ھے اور وہ کس حد تک قابل اعتماد ھے۔ اھل حدیث حضرات کا عام طور پر یہ عقیدہ ھے کہ حدیث خواہ ضعیف ھی کیوں نہ ھو، اسے قیاس پر ترجیح دی جائے گی۔ لہٰذا ان کے نزدیک قیاس کے ذریعہ اجتہاد کی وسعت بہت محدود ھے۔ ان کے برعکس، دوسرا گروہ (جنہیں اھل الرائے کہا جاتا ھے اور جن کے سرخیل امام ابو حنیفہ رح ھیں)۔ قیاس کو بڑی وسعت

دیتا ہے ۔ یہ مشہور ہے کہ امام ابو حنیفہرح نے اپنی فقہ مرتّب کرتے وقت احادیث سے بہت کم مدد لی ہے ۔ اتنی کم کہ ان کے ہاں سترہ اٹھارہ حدیثوں سے زیادہ ملتی ہی نہیں ۔ وہ قرآن کو سامنے رکھتے تھے اور اسی کی روشنی میں نئے نئے معاملات کے متعلق استنباطِ احکام کرتے تھے ۔ اہل حدیث اور اہل الرائے حضرات میں یہی بنیادی وجہٗ اختلاف ہے ۔ چونکہ امام اعظمرح کوفہ کے رہنے والے تھے (اور کوفہ عراق میں ہے) اس لئے ان کے مسلک کو اہل عراق کا مذہب بھی کہتے ہیں (مذہب کے معنی (Religion) نہیں بلکہ (School) کے ہیں) اہل حدیث اور اہل الرائے کے اس بنیادی اختلاف کے علاوہ خود اہل الرائے (اہلِ فقہ) کے مختلف مذاہب فکر (Schools of Thought) میں جو اختلاف پایا جاتا ہے اس کی وجہ ان کے ائمہ کے قیاس میں اختلاف ہے ۔ چنانچہ ہارٹن (Horton) کی تحقیق کے مطابق نویں اور بارھویں صدی عیسوی کے دوران میں ، مسلمانوں میں کم و بیش ایک سو فقہی مذاہب پیدا ہو چکے تھے اور علامہ اقبال رح کی تصریح کے مطابق پہلی صدی ہجری کے وسط سے چوتھی صدی تک قریب انیس فقہی مذاہب وجود میں آ چکے تھے ۔ یہ تفاصیل علامہ اقبال رح کے خطبات میں ملیں گی ۔

لیکن تم یہ سن کر حیران ہو گے کہ یہی اہل الرائے اور اہل قیاس حضرات ، جنہوں نے اہل حدیث حضرات سے اس بنیادی نقطہ پر اختلاف کیا تھا کہ زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں سے نِت نئے مسائل (Problems) سامنے آتے رہتے ہیں جن کے لئے فکر اور قیاس ہی سے احکامات مستنبط کئے جا سکتے ہیں ، اس لئے اجتہاد ناگزیر ہے ، خود کچھ عرصہ کے بعد اس عقیدہ کے ہو گئے کہ اب آئندہ کے لئے اجتہاد کا دروازہ بند ہے ۔ جو کچھ سوچا جانا تھا سوچا جا چکا ۔ جتنا کچھ قیاس کیا جانا تھا کیا جا چکا ۔ اب آنے والی

نسلوں کے لئے انہی فیصلوں کی پابندی لازمی ہے جو ان کے ائمہ اسلاف کر چکے ہیں ، وہ اُن سے ادھر اُدھر نہیں ہٹ سکتے۔ تم نے سلیم ! اپنے ہاں ”مقلد اور غیر مقلد“ کی بحثیں سنی ہوں گی ۔ ان کے مناظرے دیکھے ہوں گے ۔ مقلد یہی لوگ کہلاتے ہیں جو ائمہ اسلاف کے فیصلوں کی تقلید ضروری سمجھتے ہیں ۔ لیکن اس سے تم یہ نہ سمجھ لینا کہ غیر مقلد وہ ہوں گے جو اجتہاد کا دروازہ کھلا سمجھتے ہیں ۔ بالکل نہیں ۔ اجتہاد کا دروازہ تو ان میں سے کوئی بھی کھلا نہیں سمجھتا ۔ نہ مقلد ، نہ غیر مقلد۔ مقلد وہ ہیں جو ائمۂ فقہ کے فیصلوں کی تقلید کرتے ہیں اور غیر مقلد وہ جو حدیث کی پیروی کرتے ہیں ۔ اجتہاد کا سوال نہ اُن کے ہاں ہے نہ ان کے ہاں ۔ یعنی اس اعتبار سے دونوں کا مقام ایک ہی ہے ۔ دونوں کا عقیدہ یہ ہے کہ جو فیصلے ہونے تھے ہو چکے ۔ اب قیامت تک آنے والی نسلوں کے لئے انہی فیصلوں کی اتباع لازمی ہے ۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ایک گروہ کہتا ہے کہ یہ فیصلے فقہ کی کتابوں میں درج ہیں ۔ دوسرا کہتا ہے کہ یہ احادیث کے مجموعوں میں ہیں ۔ ان مقلدین میں بھی مختلف گروہ ہیں ۔ بعض صرف مطلق اجتہاد کے بند ہونے کے قائل ہیں اور بعض بہر نوع تقلید کے قائل ۔ لیکن یہ فنی اور فروعی باتیں ہیں جن کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ۔ بنیادی چیز وہی ہے جس کا ذکر اُوپر کیا جا چکا ہے ۔

تم یقیناً اس مقام پر پوچھو گے کہ اجتہاد کا دروازہ کھولنے والوں نے اسے خود اپنے ہاتھوں سے بند کیوں کر دیا ؟ اس کی کئی وجوہات تھیں ۔ لیکن سب سے بڑی (اور یوں سمجھو کہ آخری) وجہ زوالِ بغداد تھا ۔ ملّت اسلامیہ کا دینی مرکز تو مدت ہوئی ختم ہو چکا تھا ۔ بغداد کی تباہی کے بعد (جو تیرھویں صدی عیسوی میں ہوئی تھی) ان کی سیاسی مرکزیت

بھی تباہ ہو گئی تھی اور اُمت میں ہر طرف انتشار ہی انتشار پھیل گیا تھا ۔ ان حالات میں (علامہ اقبال رح کے الفاظ میں) ۔

> اُمت کو مزید انتشار سے بچانے کے لئے جو سیاسی زوال کا فطری نتیجہ ہوتا ہے ، قدامت پسند مفکرین نے یہی سوچا کہ قوم میں معاشرتی وحدت کو قائم رکھا جائے اور اس کا یہی طریقہ تھا کہ شرعی مسائل کے متعلق جو فیصلے فقہائے اسلام پہلے کر چکے تھے ، سب پر انہی کی پابندی لازم قرار دے دی جائے اور نئے فیصلوں کا دروازہ بند کر دیا جائے ۔ یعنی ان کے پیش نظر ملّت کا معاشرتی نظم تھا اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ اس باب میں کسی حد تک حق بجانب بھی تھے ۔ اس لئے کہ جماعتی نظم زوال آور عناصر کی کچھ نہ کچھ روک تھام تو کر ہی دیتا ہے * ۔

اُس وقت کے ارباب شریعت کے پیش نظر یہی مصلحت ہوگی ۔ لیکن تم نے غور کیا سلیم ! کہ اس وقتی مصلحت نے اسلام اور مسلمانوں کو کس قدر مستقل نقصان پہنچایا ہے ؟ اس نے فکر کا دروازہ بند کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ اُمت میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی مفقود ہو گئی اور اسلام جو ایک حرکت (Movement) کا نام تھا منجمد اور متحجر (Fossilised) رسوم کا مجموعہ بن کر رہ گیا ۔ چنانچہ علامہ اقبال رح مندرجہ بالا اقتباس کے تسلسل میں لکھتے ہیں :

(اُس وقت کے ارباب شریعت نے اس مصلحت کو تو پیش نظر

---

* خطبات صفحہ ۱۴۳—۴۴ ۔

> رکھا) لیکن اُنہوں نے اس حقیقت کو نہ سمجھا اور نہ ھی اسے ھمارے موجودہ علماء سمجھتے ھیں کہ کسی قوم کے مستقبل کا انحصار ان کے جماعتی نظم پر اتنا نہیں ھوتا جتنا افراد کی قوّت اور صلاحیت پر ھوتا ھے۔ ایک ایسے معاشرے میں، جس میں جماعتی نظم پر ضرورت سے زیادہ زور دیا جائے فرد کی انفرادیت کچل کر رہ جاتی ھے۔ وہ اپنے گرد و پیش کے معاشرتی فکر کی دولت کا مالک تو بن جاتا ھے، لیکن اس کی اپنی روح مردہ ھو جاتی ھے۔ (یاد رکھئیے) قوموں کے زوال کا علاج ان کے ماضی کی تاریخ کے جھوٹے احترام اور اس کے مصنوعی احیاء سے نہیں ھو سکتا۔

سلیم! ان الفاظ کو یوں ھی سرسری طور پر پڑھ کر آگے نہ بڑھ جانا، یہ ایک بہت بڑی حقیقت ھے جسے حضرت علامہ رحـ چند الفاظ میں بیان کر گئے ھیں۔ اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے تم خود اپنے زمانے کی ان مذھبی جماعتوں پر غور کرو جو اسلام کے احیاء اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود کا دعویٰ لیکر اٹھتی ھیں۔ تم نے دیکھا ھو گا کہ:

۱۔ ان کی دعوت کا مرکزی نقطہ یہ ھوتا ھے کہ ھمیں اسلاف کے نقش قدم پر چلنا چاھئیے۔ ھمیں اپنے ماضی کو دوبارہ زندہ کرنا چاھئیے۔ ھماری ترقی کا راز اتباع سلف میں ھے۔ اور

۲۔ اگر کوئی شخص قوم کو غور و فکر کی دعوت دے تو اُن کی طرف سے فوراً یہ آواز بلند ھو جاتی ھے کہ اس فتنہ کو کچل دو۔ یہ اُمت میں انتشار پیدا کرنا چاھتا ھے۔ یہ ایک نیا اسلام ایجاد کرنا چاھتا ھے۔

یعنی وہ اپنے جماعتی نظم کو اسلاف کے نام کی غلط تقدیس اور اُن کے مسلک کی متشدد تقلید کے زور پر قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ تم اس قسم کے جماعتی نظم پر گہری نگاہ ڈال کر دیکھو، تمہیں نظر آجائے گا کہ اس میں افراد کی سوچنے کی صلاحیتیں سلب ہو جاتی ہیں۔ وہ اسلام کی سب سے بڑی خدمت اسی میں سمجھتے ہیں کہ اپنے قائدین کے ہر حکم کی اطاعت کی جائے اور ان کے کسی فیصلے پر تنقیدی نگاہ نہ ڈالی جائے۔ وہ اپنے جماعتی تعصب کو مذہب سے والہانہ شیفتگی سمجھتے ہیں اور اس مقدس فریب میں مبتلا رہتے ہیں کہ ہمارے اس جہاد سے ملت کو عروج اور اسلام کو ترقی نصیب ہوگی۔ یہ وہ رجحان تھا جو زوال بغداد کے بعد پیدا ہوا اور ابھی تک بدستور چلا جا رہا ہے۔ بلکہ پاکستان میں بدقسمتی سے اسے اور بھی شدت کے ساتھ اُبھارا جا رہا ہے۔ اسی کو علامہ اقبال رحہ نے جماعتی نظم پر ضرورت سے زیادہ زور، ماضی کا جھوٹا احترام اور اس کا مصنوعی احیاء قرار دیا ہے۔ اس کے بعد و لکھتے ہیں:

> جیسا کہ دور حاضر کے ایک مصنف نے کہا ہے، تاریخ کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ خیالات اور نظریات جو اپنی توانائی کھو کر فرسودہ ہو چکے ہوں، ان لوگوں میں کبھی پھر سے توانائی حاصل نہیں کرسکتے جنھوں نے انہیں فرسودہ بنا دیا ہو۔ لٰہذا زوال آور عناصر کی روک تھام کا مؤثر طریقہ صرف یہ ہے کہ قوم میں بخود خزیدہ (Self Concentrated) افراد کو پیدا کیا جائے۔ یہی وہ افراد ہیں جو زندگی کی گہرائیوں کے سربستہ راز کھولتے ہیں۔ وہ ایسے نئے معیار زیست سامنے لاتے ہیں جن کی روشنی میں ہم یہ دیکھنا شروع کر دیتے ہیں کہ ہمارا ماحول ایسا غیر متبدّل نہیں

> کہ اسے چھوآ تک نہ جائے۔ تیرھویں صدی اور اس کے بعد کے علماء کا یہ رجحان کہ ماضی کی غلط تقدیس سے جماعتی نظم کو جامد اور متصلب طور پر قائم رکھا جائے، اسلام کی روح کے یکسر خلاف تھا (۱۴۳)

تصریحاتِ بالا سے تم نے سلیم! دیکھ لیا ہوگا کہ قیاس، درحقیقت شرعی قوانین کی تدوین کا ایک طریقہ (Process) تھا، ان قوانین کا مآخذ (Source) نہیں تھا۔ لیکن جب ہمارے دور انحطاط میں، فکر و تدبر کا دروازہ بند ہوگیا تو یہی چیز قانونِ شریعت کا مآخذ قرار پاگئی۔ یعنی اس وقت عقیدہ یہ پیدا کر لیا گیا کہ اسلاف نے اپنے قیاس (اجتہاد) سے جو مسائل مستنبط کئے ہیں، وہ اخلاف کے لئے غیر متبدل قوانین کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لہٰذا فقہ کی کتابیں ہمارے قوانین شریعت کا سر چشمہ ہیں۔

: o :

قیاس کے بعد قوانین شریعت کا دوسرا مآخذ اجماع قرار دیا جاتا ہے۔ قیاس کے متعلق تو مختلف گروہوں کے اختلاف ایسے شدید اور وسیع نہیں تھے۔ لیکن اجماع کے متعلق صورت عجیب تر ہے۔ اول تو آج تک یہی طے نہیں پا سکا کہ اجماع سے مراد کیا ہے؟ اور جو کچھ طے پایا ہے اس میں مختلف گروہوں کا اختلاف بڑا گہرا ہے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ عہد حضرت عمرؓ تک امت میں کسی قسم کا اختلاف نہیں تھا۔ حیقیت یہ ہے کہ اس قسم کے نظام میں اختلاف ہو ہی نہیں سکتا۔ حضرت عثمانؓ کے زمانے میں مسئلۂ خلافتِ حضرت علیؓ کے نام پر امت میں سب سے پہلا اختلاف رونما ہوا۔ غیر شیعہ حضرات اس اختلاف کو سیاسی کہتے ہیں، لیکن شیعہ حضرات کے نزدیک یہ دینی مسئلہ تھا اور بڑا بنیادی۔ بہر حال مسئلہ سیاسی تھا یا دینی، اس کی وجہ

سے جو اختلاف پیدا ہوا وہ غیر مندمل تھا۔ اس اختلاف کے بعد کوئی مسئلہ ایسا نہیں ہو سکتا جس کے متعلق کہا جائے کہ اس پر پوری اُمت کا اجماع تھا۔ لہٰذا اجماع سے مراد ساری اُمت کا اجماع نہیں۔ فقہاء کے نزدیک کسی حکم شرعی پر کسی زمانہ میں مسلمان مجتہدین کا متفق ہو جانا اجماع کہلاتا ہے۔ واضح تر الفاظ میں اجماع کی فنی تعریف یہ ہے کہ :

> رسول اللہؐ کی وفات کے بعد کسی بھی دور میں اُمت محمدیہؐ کے مجتہد کسی پیش آمدہ حادثہ پر خوب بحث و تمحیص کر کے ایک ہی وقت میں ایک ہی جگہ پر ایک ہی جیسے الفاظ میں اعلان کریں۔ اس میں اگر کسی نے بھی اختلاف نہیں کیا تو یہ اجماع حقیقی کہلائے گا۔

اس قسم کے اجماع کے شرعی دلیل ہونے یا نہ ہونے میں اختلافات تو ایک طرف، علماء کے ایک گروہ نے اس کے وجود کے امکان ہی سے انکار کر دیا ہے۔ اور بات ہے بھی ٹھیک۔ وہ کونسا مسئلہ ہے جس کے متعلق یہ ثابت کیا جاسکتا ہے کہ امت میں اس قسم کا اجماع کبھی ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بعض ائمہ نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ اس قسم کے اجماع کا مدعی جھوٹا ہے۔

اجماع کی دوسری شکل یہ بیان کی جاتی ہے کہ چند مجتہد ایک بات کہہ کر اس دور کے تمام مجتہدوں میں مشتہر کر دیں۔ اگر کسی نے اس کے خلاف یا تائید میں کچھ نہیں کہا تو اسے اجماع سکوتی کہا جاتا ہے۔ یعنی ان کا چپ رہنا اس کی دلیل ہے کہ وہ اس سے متفق ہیں۔ ایک گروہ نے اس کے حجتِ شرعی ہونے سے انکار کیا ہے۔ دوسری طرف اس کے موافقین کا گروہ ہے کہ وہ منکرینِ اجماع کو کافر تک

کہہ دیتے ہیں ۔ بعض کے نزدیک صرف اہل مدینہ کا اجماع شرعی دلیل بن سکتا ہے ، بعض کے نزدیک صحابہرض کا اجماع ۔ ان علماء کی بحثوں سے قطع نظر تم سیدھے سادے طور پر یہ سوچو! کہ امت میں فرقہ بندی کے بعد اگر کبھی کسی مسئلے میں اجماع ہوگا بھی تو وہ ایک فرقہ کے اندر ہی ہوگا ۔ دوسرے فرقہ کا الگ وجود خود اس کی شہادت ہے کہ وہ ان کے کسی فیصلے کو حجت شرعی نہیں مانتا ۔ اصل یہ ہے کہ جب اُمت میں پہلا تفرقہ (شیعہ اور غیر شیعہ) کا پیدا ہوا تو شیعہ قلیل تعداد میں تھے (اور ہمیشہ قلیل تعداد میں رہے ہیں) اور سنیوں کی اکثریت تھی ، پھر جب سنیوں میں مختلف گروہ پیدا ہوئے تو ان میں اہل فقہ کی اکثریت تھی ۔ اہل فقہ میں حنفیوں کی اکثریت تھی ، ان کی اکثریت ہر دور میں رہی ہے اور آج بھی یہ تمام دنیا کے مسلمانوں کا قریب دو تہائی حصہ ہیں ۔ اس لئےانکی طرف سے اس قسم کی احادیث تائیداً پیش کی جاتی ہیں کہ حضورص نے فرمایا کہ میری اُمت کا سواد اعظم کبھی گمراہی پر جمع نہیں ہوگا* ۔ یہی جذبہ در حقیقت اجماع کے سرچشمۂ قانون قرار دئے جانے کا محرک بھی ہے ۔ اس اعتبار سے اجماع اُمت سے مفہوم ہوگا اُمت کے گروہِ عظیم کا فیصلہ ۔ یعنی حنفی مسلمانوں کا مسلک ۔ یہ ظاہر ہے کہ ان کا ہر فیصلہ (غیر سنی تو ایک طرف خود سنیوں میں بھی) نہ اہل حدیث کے نزدیک قانون شریعت بن سکتا ہے نہ دیگر ائمہ فقہ ۔ امام مالک رح امام شافعی رح اور امام احمد بن حنبل رح اور ان کے متبعین کے نزدیک ۔

یہ ہے اجماع کا مروجہ مفہوم اور اس کی عملی حیثیت ۔

———: o :———

---

* اجماع کے متعلق تفصیلی بحث اور اس حدیث پر تنقید کے لئے طلوع اسلام بابت جولائی ۱۹۵۳ء دیکھئے ۔

قیاس اور اجماع کے بعد، قوانین شریعت کا تیسرا ماخذ حدیث قرار دیا جاتا ھے۔ ویسے تو احادیث کے متعلق شروع ھی سے بڑی طول طویل بحثیں چلی آ رھی ھیں، لیکن ھمارے زمانہ میں (بالخصوص پاکستان میں) اس سوال نے خاص اھمیت حاصل کر لی ھے کیونکہ یہاں یہ عملی سوال سامنے آ گیا ھے کہ اسلامی مملکت کی قانون سازی مین حدیث کا مقام کیا ھے؟ اس سوال کا ملت کے سامنے آنا بڑی نیک فال تھا۔ لیکن جیسا کہ تم نے دیکھا ھے، بجائے اس کے کہ اس کے متعلق خالص علمی اور دینی انداز سے گفتگو کی جاتی، اسے سطحی جذبات میں الجھا دیا گیا اور (جیسا کہ میں قیاس کے عنوان میں بتا چکا ھوں) سرے سے اس سوال ھی کو ملت میں مزید انتشار پیدا کرنے والا فتنہ قرار دے دیا گیا۔ بھر حال اس کے متعلق جو کچھ کہا گیا ھے اس کا ملخص (مختصر الفاظ میں) یہ ھے کہ:

۱۔ حدیث، اسلامی قوانین شریعت میں ایک مستقل حیثیت رکھتی ھے۔ اس کا مطلب یہ ھے کہ جو فیصلے احادیث میں آ چکے ھیں وہ ھمیشہ کے لئے غیر متبدّل ھیں۔ ان میں کسی قسم کا رد و بدل نہیں کیا جاسکتا۔

۲۔ بعض حضرات حدیث کے ساتھ سنت کا لفظ بھی استعمال کرتے ھیں۔ اس سے یہ سوال پیدا ھوا کہ سنت کا مفہوم کیا ھے اور اس میں اور حدیث میں کچھ فرق ھے یا دونوں کا مفہوم ایک ھی ھے۔ ایک گروہ یہ کہتا ھے کہ ان میں فرق ھے۔ حدیث ھر اس قول یا فعل کو کہتے ھیں جو رسول اللہؐ کی طرف منسوب ھو اور سنت حضورؐ کے ثابت شدہ طریقہ کو کہتے ھیں۔ دوسرا کہتا ھے کہ ان میں کوئی فرق نہیں۔ دونوں مرادف المعنی ھیں۔

۳۔ سنت میں صرف رسول اللہؐ کی سنت ھی داخل نہیں بلکہ سنت

خلفائے راشدینرض بھی شامل ھے۔ اس کے بعد یہ سوال پیدا ھوا کہ خلفائے راشدینرض میں کون کون شامل ھیں۔ ایک گروہ کا کہنا ھے کہ ان سے صرف اولین چار خلفائے رسول اللہص مراد ھیں۔ دوسرے گروہ نے لکھا ھے کہ نہیں! ان میں تمام وہ حکمران شامل ھیں جنہوں نے اُمت کو اسلامی طریقہ پر چلایا یا جو آئندہ اسے اسلامی طرق پر چلائیں گے۔

۴- پھر یہ سوال پیدا ھوا کہ کیا رسول اللہص کا ھر قول یا فعل شرعی حیثیت رکھتا ھے یا ان میں فرق کیا جا سکتا ھے۔ ایک گروہ کا کہنا یہ ھے کہ رسول اللہص اپنی رسالت کے پہلے دن سے زندگی کے آخری سانس تک بہر حال اور ھر حیثیت میں رسول تھے اس لئے حضورص کا ھر قول یا عمل شرعی حیثیت رکھتا ھے۔ دوسرے گروہ کا یہ عقیدہ ھے کہ نہیں! رسول اللہ ص نے جو کچھ بہ حیثیت رسولص فرمایا یا کہا تھا وھی دینی حیثیت رکھتا ھے۔ جو کچھ آپ نے اپنی بشری حیثیت یا تاریخ کے ایک خاص دور میں عرب کے باشندہ ھونے کی حیثیت سے کہا یا کیا تھا، وہ شرعی حیثیت نہیں رکھتا۔

(۵) اس سے یہ سوالات پیدا ھوئے کہ:

(الف) کیا رسول اللہص کی سنت (یعنی آپ کا ثبوت شدہ طریق) کسی کتاب میں منضبط ھے اور وہ کتاب تمام مسلمانوں کے نزدیک ایسی صحیح اور قابل اعتماد ھے کہ اس پر کسی قسم کی تنقید نہیں کی جا سکتی۔

(ب) کیا احادیث کی کوئی ایسی کتاب ھے جس کی ایک ایک حدیث بلا شک و شبہ رسول اللہص کی حدیث تسلیم کی جائے۔

(ج) کیا کسی کتاب میں یہ مذکور ھے کہ رسول اللہؐ نے فلاں بات بہ حیثیت رسول فرمائی تھی اور فلاں بات عام بشری یا تاریخی فرد ھونے کی حیثیت سے کہی تھی۔

ایک گروہ نے یہ کہا کہ ھاں ! ایسی کتاب (یا کتابیں) ھیں جن کی ایک ایک حدیث یقینی طور پر صحیح ھے اور (چونکہ رسول اللہؐ کی دو حیثیتیں تھیں ھی نہیں اس لئے) ھر حدیث، رسول ھی کی حیثیت سے ھے۔ لیکن دوسرے گروہ نے کہا کہ نہیں ! جسے تم سب سے زیادہ صحیح اور قابل اعتماد مجموعہ (یعنی بخاری شریف) بھی قرار دیتے ھو اس میں صحیح اور غلط دونوں قسم کی احادیث موجود ھیں۔ اس لئے اس کی بھی ھر حدیث کو بلا تنقید صحیح تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے یہ سوال پیدا ھوا کہ :

٦- صحیح اور غلط حدیثوں کے پرکھنے کا معیار کیا ھے ؟ ایک گروہ نے کہا کہ اسلاف ان معیاروں کو مقرر کر چکے ھیں اور اُن کے مطابق حدیثوں کی جانچ پرکھ بھی کرچکے ھیں۔ لیکن دوسرے گروہ کا کہنا ھے کہ اُن معیاروں کے علاوہ ایک معیار یہ بھی ھے کہ بعض لوگوں میں اسلام اور سیرت نبویؐ کے مطالعہ سے ایسی بصیرت پیدا ھو جاتی ھے کہ وہ رسول اللہؐ کے مزاج شناس ھو جاتے ھیں۔ ان کی نگاہ فوراً بتا دیتی ھے کہ فلاں حدیث صحیح ھے اور فلاں غلط۔ حتیٰ کہ اگر کسی معاملہ میں کوئی حدیث نہ ملے تو بھی وہ بتا سکتے ھیں کہ اگر یہ معاملہ رسول اللہؐ کے سامنے پیش ھوتا تو حضور اس کے متعلق یہ فرماتے۔

٧- اس آخری بات سے یہ سوال پیدا ھوا کہ کیا زندگی کے تمام معاملات کے متعلق احادیث میں احکام مل جاتے ھیں یا ایسے معاملات بھی ھو سکتے

ہیں جن کے متعلق احادیث میں پہلے سے احکام موجود نہیں۔ (جیسا کہ تم ''قیاس'' کے عنوان میں دیکھ چکے ہو) بعض لوگوں کا خیال ہے کہ احادیث کے ذریعے دین مکمل ہو چکا ہے۔ اب کوئی معاملہ ایسا ہو نہیں سکتا جس کے متعلق پہلے سے فیصلہ موجود نہ ہو۔ لیکن دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ ایسے معاملات ہو سکتے ہیں جن کے لئے پہلے سے فیصلہ موجود نہ ہو۔ ایسے امور کا فیصلہ اجتہاد سے کیا جائے گا۔

۸- یہ سوال بھی اٹھا کہ احادیث میں جو فیصلے مذکور ہیں (خواہ انہیں بالکل صحیح بھی کیوں نہ تسلیم کر لیا جائے) کیا وہ ہمیشہ کے لئے غیرمتبدل رہیں گے یا ان میں بہ تقضائے حالات رد و بدل کیا جا سکتا ہے۔ ایک گروہ نے یہ کہا کہ ان میں کسی قسم کا رد و بدل نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن دوسرے گروہ کا کہنا ہے کہ نہیں! ان میں ایسے فیصلے بھی ہو سکتے ہیں جن میں تغیر حالات سے رد و بدل کیا جا سکتا ہے۔

یہ ہے سلیم! مختصر طور پر خلاصہ ان مباحث کا جو حدیث کے متعلق ہمارے سامنے آ چکے ہیں۔ واضح رہے کہ یہ تمام باہمد گر مختلف خیالات، جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے، ان حضرات کے ہیں جو اپنے آپ کو حدیث کے ماننے والے کہتے ہیں۔ ان میں وہ لوگ شامل نہیں جنہیں ''منکرین حدیث'' کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب ان تمام متضاد خیالات کے ماننے والے (جن کا ذکر اوپر آچکا ہے) ''حدیث ماننے والے'' تسلیم کئے جاتے ہیں تو ''منکرین حدیث'' صرف وہ لوگ رہ جائیں گے جن کا عقیدہ یہ ہے کہ زندگی کے تمام معاملات کے متعلق تفصیلی فیصلے قرآن کریم کے اندر موجود ہیں۔ اس لئے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ فلاں معاملہ کے متعلق رسول اللہؐ نے کیا فیصلہ فرمایا تھا۔ یہ گروہ ان لوگوں پر مشتمل ہے جو اپنے آپ کو ''اہل قرآن'' کہتے ہیں

(یعنی ان اصطلاحی معنوں میں اہل قرآن ۔ ورنہ عام معنوں میں اہل قرآن تو ہر مسلمان ہے) ۔

یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ حدیث کے متعلق یہ بحثیں ہمارے زمانہ کی پیدا کردہ نہیں ، یہ بہت پہلے سے چلی آرہی ہیں ۔ حتیٰ کہ امام شافعیؒ (پیدائش ۱۵۰ھ ۔ وفات ۲۰۴ھ) نے اپنی مشہور کتاب (کتاب الام) میں ایک گروہ سے اپنے ایک مناظرے کی روئداد لکھی ہے جنہیں وہ ”منکرین حدیث“ کہتے ہیں ۔

نیز یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ گذشتہ صفحات میں جن مختلف گروہوں کا میں نے ذکر کیا ہے یہ اہل سنت والجماعت کے مختلف الخیال گروہ ہیں جو جمہور مسلمان کہلاتے ہیں ۔ (ان میں مخصوص معتقدات کے فرقے مثلاً شیعہ یا مرزائی شامل نہیں)

حدیث کے متعلق جو مباحث تمہارے سامنے آچکے ہیں ، ان سے تم نے سلیم ! اندازہ لگا لیا ہوگا کہ اس عقیدہ کو محض نظری طور پر متفقہ علیہ کہا جا سکتا ہے کہ حدیث قوانین شریعت کا مآخذ ہے ۔ ورنہ عملاً آج تک متفقہ طور پر متعین ہی نہیں ہو سکا کہ کونسی احادیث قوانین شریعت کا مآخذ ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ جب ان حضرات سے یہ سوال کیا جائے تو یہ اس کے متعین ، واضح اور قطعی جواب سے ہمیشہ پہلو تہی کرتے ہیں اور ”کتاب و سنت“ کی غیر متعین اصطلاح سے آگے نہیں بڑھتے ۔ اس لئے کہ انہیں معلوم ہے کہ جو تصریح ایک گروہ پیش کرے گا وہ دوسرے کے نزدیک قابل قبول نہیں ہوگی ۔ آج تک تو یہ معاملہ مساجد اور مدارس کی چاردیواری تک محدود تھا ۔ اس لئے کہ وہاں ہرگروہ اپنے اپنے مسلک کو حق قرار دیتا اور اس کی تبلیغ کرتا تھا ۔

لیکن اب جب یہ سوال سامنے آیا کہ ”ملک کا کوئی قانون کتاب و سنت کے خلاف نہیں ہوگا“ تو لازماً یہ سوال بھی سامنے آنا چاہئے تھا کہ سنت سے مراد کیا ہے ۔ اس کے لئے دشواری یہ تھی کہ اس کا جواب جو ایک گروہ دے وہ دوسرے گروہ کے نزدیک قابل قبول نہیں ہو سکتا تھا ۔ اس لئے مصلحت اسی میں سمجھی گئی کہ اس کا جواب ہی نہ دیا جائے ۔ لیکن سلیم ! تم سوچو کہ عملی دنیا میں کسی سوال کے جواب سے چشم پوشی کرنے سے کیسے کام چل سکتا ہے ؟ اس سوال کا تعلق مملکت کی قانون سازی سے ہے ۔ شخصی معاملات کی حد تک تو یہ کر لیا گیا ہے کہ ”کتاب و سنت“ کی وہی تعبیر صحیح تسلیم کی جائے گی جو اس فرقے کے نزدیک قابل قبول ہوگی ۔ لیکن جس معاملہ کا تعلق پورے ملک سے ہوگا ، اس میں تو ”کتاب و سنت“ کی ایک ہی تعبیر قابل عمل ہوگی ۔ سوچو سلیم کہ اس مقام پر کیا ہوگا ؟

میں نے اس تفصیلی گفتگو کی ضرورت اس لئے سمجھی ہے کہ تم نے اپنے سوال کو اسی ضمن میں پوچھا ہے ۔ بہر حال اب آگے بڑھو ۔

———— : o : ————

قوانین شریعت کا چوتھا اور آخری ماخذ قرآن کریم ہے ۔ تم یہ سمجھتے ہوگے کہ کم از کم قرآن کی حد تک تو تمام مسلمان (یعنی کم از کم سنی مسلمان) متفق ہوں گے ۔ لیکن واقعةً ایسا نہیں ۔ ہماری بدقسمتی کی حد یہ ہے کہ ہمارے ہاں کتاب اللہ بھی اختلافی عقائد سے بلند نہیں رہی ۔ یہ اختلافات مختصر الفاظ میں حسب ذیل ہیں ۔

۱۔ ایک گروہ کا کہنا ہے کہ قرآن میں بہت سی آیات ایسی ہیں جن کا حکم منسوخ ہے ۔ انہیں ثواب کی خاطر پڑھا جاتا ہے ۔ لیکن دوسرے گروہ کا

یہ عقیدہ ھے کہ اس میں کوئی آیت منسوخ نہیں ۔ ھر آیت اپنے مقام پر واجب العمل ھے ۔

۲۔ ایک گروہ کا عقیدہ ھے کہ ایسی آیات بھی ھیں جن پر عمل تو ھوتا ھے لیکن وہ قرآن کے اندر موجود نہیں ۔ دوسرا گروہ کہتا ھے کہ اس قسم کا تو تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا ۔

۳۔ ایک گروہ کا عقیدہ ھے کہ قرآن اور حدیث دونوں وحی پر مبنی ھیں ۔ حدیث قرآن کے مجمل احکام کی تفصیل بیان کرتی ھے ۔ دوسرے گروہ کا یہ کہنا ھے کہ وحی صرف قرآن کے اندر ھے ۔ احادیث ، رسول اللہؐ کی خود متعین فرمودہ تفاصیل ھیں ۔

۴۔ ایک گروہ کا عقیدہ ھے کہ احادیث، قرآنی آیات کو منسوخ کر سکتی ھیں ۔ اس لئے کہ احادیث بھی قرآن کی طرح وحی پر مبنی ھیں ۔ اسی طرح اگر کسی معاملہ میں قرآن اور حدیث میں تضاد نظر آئے تو حدیث کے فیصلہ کو ترجیح دی جائے گی ۔ لیکن دوسرا گروہ اس عقیدہ کو صحیح نہیں سمجھتا ۔

۵۔ احکام کے علاوہ قرآن کی دیگر آیات کے متعلق بھی ایک گروہ کا عقیدہ ھے کہ ان کا جو مفہوم روایات میں بیان ھوا ھے وھی مفہوم صحیح اور حرف آخر ھے ۔ اس سے کوئی الگ مفہوم لیا ھی نہیں جا سکتا ۔ لیکن دوسرا گروہ یہ کہتا ھے کہ جوں جوں زمانہ علم و انکشافات میں آگے بڑھتا جائے گا قرآن کے معانی کھلتے چلے جائیں گے ۔ اس لئے اس میں ھر زمانہ میں تفکر و تدبر کی ضرورت ھے ۔

۶۔ ایک گروہ کا یہ عقیدہ ھے کہ قرآنی احکام کی جو تفاصیل فقہ کی کتابوں میں آ چکی ھیں وھی تفاصیل قابل قبول اور قیامت تک کے لئے

واجب العمل ھیں ۔ دوسرا گروہ اس عقیدے سے اختلاف رکھتا ھے ۔

۷- چونکه ’’اھل قرآن‘‘ کا ذکر پہلے آ چکا ھے اس لئے اُن کے اس عقیدہ کا دھرا دینا بھی ضروری ھے که تمام معاملات کی جمله تفاصیل قرآن کے اندر آ چکی ھیں ۔ اس لئے قرآنی احکام کی تفاصیل کے لئے کسیٰ اور طرف رجوع کرنا صحیح نہیں ۔

ان تصریحات سے تم اندازہ کر لو سلیم ! که یه عقیده که ’’قرآن قوانین شریعت کا ماخذ ھے‘‘ ۔ جب عملی آئینه میں دیکھا جائے تو اس کی حیثیت کیا رہ جاتی ھے ؟

اس وقت تک سلیم ! میں نے یه بتایا ھے که اس مسلّمه کی حقیقت کیا ھے که قوانین شریعت کے چار ماخذ ھیں ۔ قرآن ، حدیث ، اجماع اور قیاس ۔ اور ان اربعه عناصر کا مروجه مفہوم کیا ھے ۔ اب تمہیں یه بتاؤں گا که جہاں تک میری قرآنی بصیرت میری راہ نمائی کرتی ھے ۔ اس مسلّمه کا صحیح مفہوم کیا ھے اور اس کے اجزائے ترکیبی کا ٹھیک ٹھیک مقام کیا ۔ ذرا غور سے سننا که اس کا تعلق اسلامی قوانین شریعت کے ایک ایسے بنیادی سوال سے ھے جس کے صحیح حل کے سامنے نه ھونے سے اُمت اس قدر ذھنی انتشار اور عملی خلفشار میں مبتلا رھی ھے اور اب بھی ھے ۔

الله تعالیٰ نے انسان کو عقل دی ھے جس سے وہ زندگی کے معاملات کے فیصلے کرتا ھے ، لیکن جب دو انسانوں کے مفاد میں تصادم ھوتا ھے تو ھر ایک عقل اپنے حق میں فیصله دیتی ھے ۔ یہی چیز دو افراد سے آگے بڑھ کر دو گروھوں میں ، اور پھر دو قوموں میں پیدا ھو جاتی ھے ، اور قوموں سے آگے بڑھ کر اقوام کے مخالف جتھوں میں ۔ اس قسم کے معاملات کے تصفیه

کے لئے ، اور یہ بتانے کے لئے کہ انسانی زندگی کا مقصود و منتہیٰ ، اور اس کا نصب العین کیا ہے ، اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ راہ نمائی دی ہے۔ یہ راہ نمائی اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے اور اس سے باہر اور کہیں نہیں۔ قرآن کی راہ نمائی چونکہ تمام دنیا کے انسانوں کے لئے اور تمام زمانوں کے لئے ہے ، اس لئے اس میں (چند مستثنیات کو چھوڑ کر) صرف اصول بیان کئے گئے ہیں ، تاکہ ہر دور کے انسان اپنے اپنے زمانے کی ضرورتوں کے لحاظ سے ان اصولوں کی روشنی میں اپنے مسائل کا حل خود متعین کرتے رہیں۔

ان جزئیات کے متعین کرنے کے طریق کے متعلق بھی قرآن نے راہ نمائی دے دی ہے اور وہ یہ کہ اُمت باہمی مشورے سے اس اہم فریضہ کو سرانجام دے۔ اس طریق پر سب سے پہلے رسول اللہ ص نے عمل فرمایا (واضح رہے کہ قرآن نے رسول اللہ ص کو خصوصیت سے اس کی تاکید کی تھی) حضور ص کے بعد آپ کے خلفاء (جانشینوں) نے ایسا ہی کیا۔ اس بات کو اچھی طرح سمجھ لو کہ رسول اللہ ص نے قرآن کے اصولوں کے مطابق ایک حکومت قائم کی تھی۔ اور یہی حکومت آپ کے جانشینوں کی طرف منتقل ہوئی تھی۔ اس تصوّر کے ماتحت یہ حقیقت تمہاری سمجھ میں آ جائے گی کہ کوئی حکومت ، اپنی پیشرو حکومت کی سنت (طرز عمل) سے مستغنی ہو نہیں سکتی۔ جب کوئی حکومت مسلسل قائم رہے تو سابقہ حکومتوں کے فیصلے آنے والی حکومتوں میں مسلسل نافذ العمل رہتے ہیں۔ یہ کبھی نہیں ہوتا کہ ہر نیا حاکم ، سابقہ حاکم کے فیصلوں کو منسوخ کرکے تمام احکام ازسرِ نو جاری کر دے۔ ایک نئی حکومت جو سابقہ حکومت کا تختہ اُلٹ کر قائم ہو ، اس طرح کرتی ہے ، لیکن ایک ہی انداز کی حکومت سابقہ فیصلوں کو علیٰ حالہٖ قائم رکھتی

ہے تاآنکہ آن میں کسی تبدیلی کی ضرورت پڑ جائے ۔ اس وقت وہ اس میں مناسب تبدیلی کر دیتی ہے ۔ بعینہٖ یہی انداز ہے جسے ہم رسول اللہؐ کے خلفاء رضؓ کے زمانے میں دیکھتے ہیں ۔ جب حضرت ابوبکر صدیق حضور کے جانشین (خلیفہ) مقرر ہوئے تو آپ نے اعلان کیا کہ میں قرآن کریم اور سنت رسول اللہؐ کی اتباع کروں گا ۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ میں کسی نئی حکومت کی طرح نہیں ڈال رہا ۔ میری حکومت سابقہ حکومت ہی کا تسلسل ہے ۔ اسی طرح حضرت عمر رضؓ نے فرمایا کہ میں سنت رسول اللہؐ اور سنت حضرت ابوبکر رضؓ کی اتباع کروں گا ، اس سے بھی مقصود وہی تھا ۔

اس حد تک تو بات صاف ہے ۔ اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان حضرات کو اگر کسی سابقہ فیصلے میں تبدیلی کی ضرورت محسوس ہوئی تو کیا اُنہوں نے ایسی تبدیلی کی ؟ تاریخ میں ہمیں سلیم ! متعدد واقعات ایسے ملتے ہیں ، جن میں حضرت عمر رضؓ نے عہد رسالت مآبؐ کے فیصلوں میں اور عہد صدیقی رضؓ کے فیصلوں میں ضروری تبدیلیاں کیں (ان تبدیلیوں کی کچھ مثالیں سابقہ خط میں بیان کی جا چکی ہیں) ۔ اس طرح یہ سلسلہ ماضی سے وابستہ بھی رہا اور زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ بھی دیتا چلا گیا ۔ جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے کوئی قوم جو تسلسل حیات چاہتی ہے اپنے ماضی سے اپنے آپ کو یکسر منقطع نہیں کر سکتی ۔ لیکن ماضی سے وابستہ رہنا اور بات ہے اور ماضی کی زنجیروں میں جکڑے رہنا اور بات ۔ ماضی سے وابستہ رہنے کا مفہوم یہ ہے کہ ہم اپنے سابقہ ادوار کے تجربوں سے مستفید ہوتے رہیں ۔ اس سے یہ مطلب نہیں کہ جہاں زمانے کے تقاضے کسی تبدیلی کے متقاضی ہوں وہ تبدیلی بھی روا نہ رکھی جائے ۔ یاد رکھو سلیم ! غیر متبدل

صرف وہ راہ نمائی ہے جسے خدا نے ہمیشہ کے لئے اور تمام نوعِ انسان کے لئے شمع راہ بنایا ہے ۔ اس راہ نمائی کا مقصود یہ ہے کہ انسانی صلاحیتوں کی نشو و نما کرکے انہیں تکمیل تک پہنچایا جائے ۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ انہیں مواقع بہم پہنچائے جائیں تاکہ وہ علم و بصیرت اور غور و تدبّر سے زمانہ کے بڑھتے اور بدلتے ہوئے تقاضوں کا حل تلاش کریں ۔ اگر انہیں زندگی کے ہر مسئلہ کے متعلق بنے بنائے قوانین دے دئے جائیں اور انہیں قیامت تک کے لئے غیر متبدل قرار دے دیا جائے تو انہیں اپنی فکری صلاحیتوں کی نشو و نما کا موقع کہاں ملے گا ؟ نبوّت کا دروازہ بند کرنے سے مقصد ہی یہ تھا کہ ذہنِ انسانی کی کھڑکیاں کھول دی جائیں ۔

ان تصریحات کی روشنی میں سلیم ! ایک مرتبہ پھر اس نقشے کو سامنے لاؤ جس کے مطابق عہد رسالتمآبص اور عہد خلفاء راشدین میں معاملات زندگی کے متعلق فیصلے مرتّب اور صادر ہوتے تھے ۔ اس نقشہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ :

۱۔ رسول اللہص کے زمانے میں جب کوئی معاملہ پیش ہوتا تو یہ دیکھا جاتا کہ قرآن کریم نے اس کے متعلق کیا ہدایت دی ہے ۔ اس ہدایت کی روشنی میں حضورص اپنے صحابہ رض کے مشورے سے معاملہ کی جزئیات طے فرماتے ۔

۲۔ حضرت ابوبکر صدیق رض کے زمانہ میں جب کوئی معاملہ پیش ہوتا تو دیکھا جاتا کہ حضورص کے زمانہ میں اس کے متعلق کوئی فیصلہ ہوا تھا ؟ اگر کوئی فیصلہ موجود ہوتا تو اسے اختیار کر لیا جاتا ، ورنہ طریق بالا کے مطابق اس کی جزئیات خود طے کر لی

جاتیں ، اس کا نام اتباعِ کتاب و سنت تھا ۔

۳- یہی انداز حضرت عمر رض کے زمانہ میں رہا ۔ اس میں رسول اللہ ص اور حضرت ابوبکر رض کے زمانے کے فیصلوں کی طرف رجوع کیا جاتا ۔ حضرت عمر رض کے زمانہ میں اسلامی فتوحات کا سلسلہ بڑھا ، دوسری قوموں سے ربط و ضبط پیدا ہوا ، معاملات کی نوعیت بدل گئی ، بعض حالات میں تغیر واقع ہوگیا ۔ اس لئے آپ کو بکثرت نئے فیصلے بھی کرنے پڑے اور کئی ایک سابقہ فیصلوں میں ترمیمات بھی کرنی پڑیں ۔

تم نے دیکھا سلیم ! کہ اس اندازِ حکومت میں کس طرح قرآن ، سنت ، اجماع اور قیاس چاروں اپنے اپنے مقام پر آجاتے ہیں ۔ کتاب اللہ کی اصولی راہ نمائی ۔ سابقہ حکومت کے فیصلے (سنت) ، ان کی روشنی میں نئے معاملات کے لئے از روئے قیاس نئے فیصلے ، یا سابقہ فیصلوں میں تبدیلی ، اور مشاورتی نظام کے ماتحت ان فیصلوں کا اجراء (اجماع) ۔ یہ تھا اس وقت صحیح مفہوم کتاب و سنت ، اجماع اور قیاس کا ۔

جیسا کہ میں سلیم ! پہلے بھی لکھ چکا ہوں جب ایک انداز کی حکومت مسلسل آگے چلتی جائے تو اس میں سابقہ فیصلوں سے مستغنی ہوا ہی نہیں جا سکتا ۔ اس میں سابقہ فیصلے بھی ساتھ ساتھ چلتے ہیں ۔ ان میں نئے فیصلوں کا اضافہ بھی ہوتا جاتا ہے اور عندالضرورت سابقہ فیصلوں میں تبدیلیاں بھی ہوتی رہتی ہیں ۔ اگر خلافت علیٰ منہاج رسالت کا سلسلہ بدستور جاری رہتا تو حکومت کا یہی نقشہ آگے بڑھتا چلا جاتا ۔ لیکن بدقسمتی سے ایسا نہ ہوا ۔ اس کے بعد مسلمانوں کی حکومت آگے چلی لیکن اس کا انداز مختلف ہو گیا ۔ یہی انداز

مختلف اسلامی ممالک میں اس وقت تک چلا جا رہا ہے ۔ اب اگر کسی خطۂ زمین کے مسلمان چاہیں کہ اپنے ہاں اسی پہلے انداز کی حکومت (خلافت علیٰ منہاج رسالت) قائم کریں تو ان کے ہاں قانون سازی کی وہی صورت پیدا ہو جائے گی جو اس زمانہ میں تھی ۔ اس میں کتاب اللہ کی راہ نمائی کو مستقلاً سامنے رکھا جائے گا ۔ پھر یہ دیکھا جائے گا کہ معاملہٗ پیش نظر کے لئے سابقہ دور کے تاریخی نوشتوں میں کوئی نظائر (Precedents) ملتے ہیں یا نہیں ۔ اگر ملتے ہوں اور زمانہ کے اتنے بُعد کے باوجود ان میں کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس نہ ہو تو انہیں علیٰ حالہٖ اختیار (Adopt) کر لیا جائے گا ۔ اگر ان میں کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس ہوگی تو تغیر حالات پر قیاس کرکے ، مناسب تبدیلی سے اسے (Adopt) کر لیا جائے گا ۔ یا عندالضرورت کوئی نیا فیصلہ کر لیا جائے گا ۔ اور جب اس فیصلہ کو مرکز ملّت (نظام یا حکومت) کی طرف سے نافذ کیا جائے گا تو اس پر سب کا اجماع بھی ہوگا ۔ یہ عملی مفہوم ہوگا سلیم ! کتاب ۔ سنت ۔ اجماع اور قیاس کا ۔ اس میں تم دیکھو گے کہ نہ کسی قسم کی کوئی الجھن پیش آتی ہے نہ سلوٹ ، نہ فرقہ بندی کی گنجائش رہتی ہے نہ مختلف فقہی مذاہب کی ضرورت ۔ سب کی راہ نمائی کے لئے ایک کتاب ۔ نمائندگان ملّت پر مشتمل ایک پارلیان جو قیاس اور اجتہاد کے فرائض سر انجام دے ۔ اس نظام کے مرکز کی طرف سے جاری شدہ فیصلے سب کے لئے واجب التسلیم ! اور ثبات و تغیر کے اس حسین امتزاج کو لئے ہوئے اسلامی نظامِ اُمت کا ، رواں دواں آگے بڑھتے جانا ۔

تصریحاتِ بالا سے تم نے دیکھ لیا ہوگا سلیم ! کہ جہاں تک قانونِ شریعت کے مآخذ کا تعلق ہے اس کا درحقیقت مآخذ ایک ہی ہے ۔ یعنی کتاب اللہ ۔ باقی تینوں شقیں دراصل قانون کی تدوین یا تنفیذ کے طریقے ہیں ۔ کتاب اللہ کی روشنی میں کئے ہوئے سابقہ فیصلوں کو علیٰ حالہٖ نافذ کر دینا ، اتباع

سنت کہلائے گا۔ نئے معاملات پر غور و خوض کرنا اجتہاد یا قیاس ہوگا۔ اور اُمت کے مشورے سے فیصلوں تک پہنچنا اور اُنہیں نافذ کرنا اجماع کہلائے گا۔ لہٰذا اسلامی قانونِ شریعت کا ماخذ صرف قرآن ہے اور یہی مفہوم ہے حسبنا کتاب اللہ کا۔

والسلام

پرویز

جون ۱۹۵۶ء

چھبیسواں خط

(پاکستان میں قانون سازی کا اصول)

سلیم ! مجھے پہلے ہی اس کا احساس تھا کہ تم اس ضمن میں مزید استفسارات کرو گے - اس لئے کہ ایک تو اسلامی مملکت میں قانون سازی کے اصول کا مسئلہ ویسے ہی بڑا اہم ہے ، دوسرے پاکستان میں یہ سوال نظری حیثیت سے آگے بڑھ کر عملی شکل اختیار کر چکا ہے - لہٰذا تمہارے جیسے متجسّس قلوب کا اضطراب قابل فہم ہے - اس سلسلہ میں جو کچھ گذشتہ دو خطوط میں لکھا جا چکا ہے اسے بھی سامنے رکھنا ضروری ہے - ان میں سے کئی ایک باتیں اس خط میں دوبارہ آ جائیں گی - کیونکہ ان کے دہرائے بغیر بات سمجھ میں نہیں آئے گی - اب تم غور سے سنو کہ اسلامی مملکت میں قوانین کس اصول کے مطابق وضع ہوں گے -

:o:

تم خارجی کائنات پر غور کرو - اس میں ، ہر چیز میں ، ہر آن کوئی نہ کوئی تغیّر واقع ہوتا رہتا ہے - یَسْـَٔلُهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ

وَالْاَرْضِ کُلَّ یَوْمٍ ھُوَ فِیْ شَاْنٍ (۵۵/۲۹)۔ کائنات کی ہر شے اپنی زیست اور نشو و نما کے لئے ربوبیّت خداوندی کی محتاج ہے۔ لیکن ان کی نشو و نما کے تقاضے ہر آن بدلتے رہتے ہیں۔ یہی وہ ہر آن کا تغیر (Change) ہے جس کے متعلق اقبال نے کہا تھا کہ ع

ثبات ایک تغیّر کو ہے زمانے میں

مادّی تصوّرِ حیات (یعنی Materialistic Concept of Life۔ جس کی مظہر مغرب کی تہذیب ہے) کی رو سے انسان بھی دیگر اشیائے کائنات کی طرح ایک مادّی تخلیق ہے۔ اور اس کے تقاضے، اس کے جسم کے تقاضے ہیں۔ انسانی جسم کچھ عرصہ کے بعد مضمحل ہو کر بے جان لاش بن جاتا ہے اور اس کے ساتھ انسان کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔ انسانی جسم، یعنی طبیعی زندگی (Physical Life) کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے انسان کے پاس عقل موجود ہے۔ عقل کی رُو سے ایسے قوانین مرتّب کئے جا سکتے ہیں، جو انسانی معاشرے میں نظم و ضبط قائم رکھیں اور عقل ہی کی رُو سے ان میں تبدیلیاں بھی کی جا سکتی ہیں۔ یعنی جس طرح انسان میں کوئی شے غیر متبدّل نہیں اسی طرح اُن قوانین میں بھی کوئی عنصر غیر متبدّل نہیں جو انسانی زندگی کو (Regulate) کرنے کے لئے بنائے جائیں۔ (جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے) اس تصوّر کو مادّی تصوّرِ حیات کہتے ہیں اور اس اندازِ تقنین (قانون سازی) کو سیکولر (Secular)۔

اس کے برعکس اسلام کا تصوّرِ حیات یہ ہے کہ انسان عبارت ہے جسم اور ذات (Personality) سے۔ اس کا جسم دیگر اشیائے کائنات

کی طرح قوانین طبیعی کے مطابق نشو و نما پاتا اور زندہ رہتا ہے۔ اس میں ہر آن تغیر ہوتا رہتا ہے۔ ایسا تغیر کہ سائنسدانوں کا کہنا ہے کہ ہر سات سال کے بعد، انسان کا سابقہ جسم، کلیۃً ایک نئے جسم میں تبدیل ہو جاتا ہے لیکن انسانی ذات، کہ جسے قرآن روحِ خداوندی (Divine Energy) کہہ کر پکارتا ہے، غیر متبدّل ہے۔ وہ شروع سے آخر تک ایک ہی رہتی ہے۔ اس میں کوئی تغیّر نہیں ہوتا۔ حتّٰی کہ جسم کی طبیعی موت بھی اس میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کر سکتی۔ یہ اس کے بعد بھی زندہ رہتی اور آگے بڑھتی ہے*۔ انسان کی طبیعی زندگی سے مقصود اس ذات کی نشو و نما ہے۔ کامیاب زندگی وہی کہلا سکتی ہے جس میں انسانی ذات کی نمود اور بالیدگی ہو جائے ؎

زندگانی ہے صدف قطرۂ نیساں ہے خودی
وہ صدف کیا کہ جو قطرے کو گہر کر نہ سکے
ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی
یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

لہٰذا، انسان عبارت ہے ثبات و تغیّر سے۔ یہ (Permanence and Change) دونوں کا مظہر ہے۔ علامہ اقبال رح اسی حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

اسلام کا پیش کردہ تصوّر یہ ہے کہ حیاتِ کلی کی

---

* انسانی ذات کے متعلق تفصیلی گفتکو جلد اول میں کی جا چکی ہے۔

> روحانی اساس ازلی و ابدی ہے ۔ لیکن اس کی نمود تغیّر و تنوّع کے پیکروں میں ہوتی ہے ۔ جو معاشرہ حقیقتِ مطلقہ کے متعلق اس قسم کے تصوّر پر متشکّل ہو اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی زندگی میں مستقل اور تغیر پذیر عناصر میں تطابق و توافق پیدا کرے ۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لئے مستقل اور ابدی اصول ہوں . . . . لیکن اگر ان ابدی اصولوں کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرے کے اندر تغیّر کا امکان ہی نہیں . . . . تو اس سے زندگی، جو اپنی فطرت میں متحرّک واقع ہوئی ہے، یکسر جامد و متصلب بن کر رہ جائے گی* ۔

جہاں تک تغیّر کا تعلق ہے، اس سے متعلق قوانین عقل کی رُو سے مرتّب کئے جا سکتے ہیں ۔ لیکن ثبات (Permanence) سے متعلق قوانین عقل کی رُو سے نہیں مل سکتے ۔ یہ عقل کے بس کی بات نہیں ۔ یہ قوانین وحی کی رو سے ملتے ہیں، انہیں مستقل اقدار (Permanent Values) یا کلمت اللہ یا سنّت اللہ کہا جاتا ہے ۔ عقل کی رُو سے مرتّب کردہ ضوابط میں تبدیلی ہو سکتی ہے لیکن مستقل اقدار میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی ۔ لَا تَبْدِیْلَ لِکَلِمٰتِ اللّٰہِ (۱۰/۶۴) ۔ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّۃِ اللّٰہِ تَبْدِیْلًا (۳۳/۶۲) ۔

لیکن انسانی جسم اور اس کی ذات کو الگ الگ شعبوں (Compartments)

---

* تشکیل الٰہیات جدید، خطبہ ششم ۔

میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا ۔ اس لئے ثبات اور تغیّر سے متعلق قوانین و ضوابط بھی ایک دوسرے سے غیر متعلق اور الگ تھلگ نہیں رہ سکتے ۔ انسانی عقل اگر وحی (کلمٰت اللہ) کی راہ نمائی میں کام کرے تو اس طریق سے وہ قوانین مرتب کئے جا سکتے ہیں جن کا اطلاق انسان پر تماماً (Man as a whole) کیا جا سکتا ہے اور جن کے مطابق زندگی بسر کرنے سے اس کے جسم اور ذات کے تقاضے پورے ہوتے چلے جاتے ہیں ۔ جس وقت سے انسان نے تمدّنی زندگی بسر کرنی شروع کی ہے، اسے وحی کی راہ نمائی ملتی چلی آ رہی ہے ۔ یہ ظاہر ہے کہ ابتدائی دور میں انسان میں علم و تجربہ کی کمی تھی، اس لئے اس کی عقل نے پختگی اختیار نہیں کی تھی ۔ اس زمانے میں وحی کا انداز یہ تھا کہ مستقل اقدار کے ساتھ ساتھ وہ تغیّر پذیر قوانین بھی وحی ہی کی رو سے دے دئے جاتے تھے جنہیں سن شعور میں پہنچنے کے بعد عقل خود وضع کر سکتی تھی ۔ مثلاً جب انسان کو پہلے پہل کشتی بنانے کی ضرورت لاحق ہوئی تو اس کا طریق بھی وحی ہی کو بتانا پڑا ۔ چنانچہ قصّۂ حضرت نوح علیہ السلام کے ضمن میں قرآن میں ہے کہ فَاَوْحَیْنَا اِلَیْهِ اَنْ صْنَعِ الْفُلْکَ بِاَعْیُنِنَا وَ وَحْیِنَا (۲۳/۲۶) ہم نے اس کی (نوح کی) طرف وحی بھیجی کہ وہ ہماری زیر نگرانی ہماری وحی کے مطابق کشتی بنائے ۔ جوں جوں عقلِ انسانی میں پختگی آتی گئی ان تغیر آشنا تفاصیل میں کمی ہوتی گئی ۔ لیکن مستقل اقدار بدستور اپنی جگہ قائم رہیں ۔ یہ اقدار یا کلمٰت اللہ آخری مرتبہ قرآن کے اندر محفوظ کر کے دے دئے گئے اور ان کی روشنی میں جزئی قوانین کے متعلق کہہ دیا گیا کہ وہ باہمی مشاورت سے مرتّب کئے جایا کریں ۔ چنانچہ نبی اکرم ص سے ارشاد ہوا کہ شَاوِرْھُمْ فِی الْاَمْرِ (۳/۱۵۸) اور حضور کے بعد جس منہاج پر

امت نے چلنا تھا ۔ اس کے متعلق کہا گیا کہ وَأَمْرُهُمْ شُورٰى بَيْنَهُمْ (۴۲/۳۸) ۔ اس اجمال کی تفصیل ذرا آگے چل کر آئے گی ۔

———— : o : ————

تصریحات بالا سے یہ حقیقت تمہارے سامنے آ گئی ہوگی کہ اسلام کی رو سے ، انسانی زندگی عبارت ہے ثبات اور تغیر سے ، اس لئے جن قوانین کے تابع انسان کو (اسلامی انداز کی) زندگی بسر کرنی ہوگی ، وہ بھی ثبات اور تغیّر کے مظہر ہوں گے ۔ سوال یہ ہے کہ ان قوانین میں کونسا عنصر غیر متبدّل رہے گا اور کونسے اجزاء ایسے ہوں گے جن میں حالات کے تقاضے سے تبدیلی کی جا سکے گی ۔ یہی ہے وہ اصل سوال جو اس ضمن میں ساری بحث کا نقطۂ ماسکہ ہے ، اور جس کے صحیح حل پر اسلامی قوانین کی تدوین کا دار و مدار ہے ۔ لہٰذا اس سوال کی اہمیت ظاہر ہے ۔ لیکن تم اس سوال کو اچھی طرح سمجھ نہیں سکو گے ، جب تک تمہیں یہ نہ بتا دیا جائے کہ اس وقت پاکستان میں جو مختلف گروہ (یا مکاتبِ فکر) ہیں ، ان کا اس باب میں کیا عقیدہ اور خیال ہے ۔ (واضح رہے کہ میں اس وقت ان مختلف مکاتب فکر کے عقائد یا خیالات پر کسی قسم کی تنقید نہیں کرنا چاہتا ، میں صرف انہیں علیٰ حالہٖ پیش کر دینا چاہتا ہوں تاکہ ان کے خیالات تمہارے سامنے آ جائیں) ۔

جیسا کہ میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں ، پاکستان میں ایک گروہ وہ ہے جس کا عقیدہ یہ ہے کہ ایک اسلامی مملکت کو جس قدر قوانین کی ضرورت ہے وہ سب کے سب ہماری فقہ کے اندر آ چکے ہیں اور ان میں کسی قسم کا رد و بدل نہیں کیا جا سکتا ۔ مملکت کا فریضہ قانون سازی نہیں ۔ اس کا کام

یہ ہے کہ جو سوال سامنے آئے اس کے متعلق علمائے فقہ سے پوچھ لے کہ اس کی بابت فیصلہ کیا ہے اور اس کے بعد اس فیصلہ کو ملک میں نافذ کر دے۔ چنانچہ (فسادات پنجاب کے سلسلہ میں) جسٹس منیر کی عدالت میں، اسی مکتبِ فکر کے ایک نمایندے نے اس مسلک کو پیش کیا تھا جس پر جسٹس موصوف نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا کہ اگر صورتِ حال یہ ہے تو پھر مملکتِ پاکستان کو کسی لیجسلیٹو اسمبلی کی ضرورت ہی نہیں۔ اسے صرف ہیئت مجریہ (Executive Machinery) کی ضرورت ہے۔

ان کے برعکس ایک گروہ ایسا ہے جو اس مسلک کو "بے روح مذہبیت" قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اس میں:

> اسلامی شریعت کو ایک منجمد شاستر بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ اس میں صدیوں سے اجتہاد کا دروازہ بند ہے، جس کی وجہ سے اسلام ایک زندہ تحریک کے بجائے محض عہدِ گذشتہ کی ایک تاریخی تحریک بن کر رہ گیا ہے *۔

اس گروہ کا کہنا یہ ہے کہ:

> مجتہد خواہ کتنا ہی باکمال ہو، زمان اور مکان کے تعیّنات سے بالکل آزاد نہیں ہو سکتا، نہ اُس کی نظر تمام ازمنہ و احوال پر وسیع ہو سکتی ہے۔ لہٰذا اس کے تمام اجتہادات کا تمام حالات کے مطابق ہونا غیر ممکن ہے †۔

---

* سیاسی کشمکش، حصہ سوم، (ابوالاعلیٰ مودودی)، رسالہ ترجمان القرآن، محرم ۱۳۶۰ھ، صفحہ ۳۶۔

† تفہیمات، حصہ دوم، صفحہ ۳۲۶، ابوالاعلیٰ مودودی۔

اس مکتبِ فکر (یعنی فقہی فیصلوں کو ناقابلِ تغیر سمجھنے والوں) کے متعلق علامہ اقبال رح نے اپنے خطبہ میں (جس کا حوالہ اوپر دیا جا چکا ہے)، بڑی تفصیل سے بحث کی ہے، وہ اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> سُنّی حضرات نظری طور پر تو اس کے قائل ہیں کہ اس قسم کا اجتہاد (یعنی اجتہادِ مطلق) ممکن ہے۔ لیکن ائمۂ فقہ کے مذاہب کے قیام کے بعد عملاً اس کا دروازہ بند ہے، اس لئے کہ اس قسم کے اجتہاد کے لئے جن شرائط کو ضروری قرار دیا جاتا ہے، اُن کا پورا کرنا کسی ایک فرد کے لئے قریب قریب ناممکن ہے۔ ایک ایسے نظامِ شریعت میں جس کی بنیاد قرآن پر ہو، جو زندگی کے متعلق حرکیاتی اور ارتقائی تصوّر کا علمبردار ہے، اس قسم کی ذہنیّت کچھ عجیب سی دکھائی دیتی ہے۔

آگے چل کر لکھتے ہیں:

> آئیے! اب ایک نظر ان اصولوں پر ڈالیں، جو قرآن نے قانون سازی کے سلسلے میں دئے ہیں۔ ان پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ان اصولوں کی رُو سے یہ قطعاً نہیں ہوتا کہ انسانی فکر سلب ہو جائے اور قانون سازی کے لئے کوئی میدان ہی نہ رہے۔ اس کے برعکس ان اصولوں میں جس قدر وسعت رکھی گئی ہے اس سے انسانی فکر بیدار ہوتی ہے۔ یہی وہ اصول تھے جن کی راہ نمائی میں ہمارے فقہاء نے، قانونِ شرعی کے متعدد نظام (سسٹم) مرتب کئے اور تاریخِ اسلام کا طالب علم اس حقیقت سے

واقف ہے کہ سیاسی اور معاشرتی نظام زندگی کی حیثیت سے اسلام کو جو اس قدر کامیابی حاصل ہوئی تو اس کا کم از کم آدھا حصہ ان ہی فقہا کی بالغ نظری کا رہینِ منت تھا . . . . . لیکن اس تمام ہمہ گیری کے باوجود یہ قانونی ضوابط بالآخر انفرادی تعبیرات کا مجموعہ ہیں۔ اس لئے انہیں حتمی اور قطعی سمجھ لینا غلط ہے۔ مجھے اس کا علم ہے کہ علمائے اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ ہمارے مشہور مذاہب اپنی اپنی جگہ مکمل اور مختتم ہیں۔ لیکن نظری طور پر اجتہادِ مطلق کے امکان سے انہیں کبھی بھی انکار نہیں ہوا۔ میں نے پچھلے صفحات میں ان اسباب و علل سے بحث کی ہے جو علماء کی اس ذہنیّت کا موجب بنے۔ لیکن چونکہ اب حالات بدل چکے ہیں اور دنیائے اسلام ان تمام نئی نئی قوتوں سے دوچار اور متاثر ہے جو زندگی کے مختلف گوشوں میں فکرِ انسانی کی نشو و ارتقاء سے وجود میں آ گئی ہیں، اس لئے مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اس قدامت پرستانہ ذہنیّت کو باقی رکھا جائے۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا ان مذاہبِ فقہ کے بانیوں میں سے کسی نے بھی اپنی تعبیرات و تاویلات کو کبھی قطعی، کامل اور سہو و خطا سے مبرا سمجھا؟ کبھی نہیں۔ اس لئے اگر دورِ حاضر کے اعتدال پسند مسلمان زمانے کے بدلے ہوئے حالات اور اپنے تجربہ کی روشنی میں فقہ کے اصولِ اساسی کی نئی تعبیرات کرنا چاہتے ہیں تو ان کا یہ طرزِ عمل میرے خیال میں بالکل بجا اور درست ہے۔ خود قرآن کی یہ تعلیم کہ حیات ایک ترقی پذیر عملِ ارتقاء ہے، اس کی مقتضی ہے

> کہ ہر نئی نسل کو اس کا حق ہونا چاہئے کہ وہ اپنی مشکلات کا حل تلاش کرے ۔ وہ ایسا کرنے میں سلف کے علمی سرمایہ سے راہ نمائی لے سکتے ہیں ، لیکن اسلاف کے فیصلے ان کے راستہ میں روک نہیں بن سکتے ۔

:o:

اب آگے بڑھو !

ایک اور مکتب ہے جس کا کہنا ہے کہ فقہ نہیں ، بلکہ احادیث نبوی ص میں جو کچھ آ گیا ہے وہ غیر متبدّل ہے ۔ اسے جوں کا توں نافذ کیا جانا چاہئے ۔ ان کا عقیدہ ہے کہ :

> تحقیق و تثبیت کے بعد حدیث کا ٹھیک وہی مقام ہے جو قرآنِ عزیز کا ہے اور فی الحقیقت اس کے انکار کا ایمان و دیانت پر بالکل وہی اثر پڑتا ہے جو قرآنِ عزیز کے انکار کا . . . . قرآن اختلافِ تاویل کے باوجود خدا کا کلام ہے اور شرعاً حجت ۔ اسی طرح حدیث ، تحقیق و تثبیت کے باوجود خدا کی طرف سے وحی ہے اور دین میں قرآن کے بعد حجت *۔

اس اقتباس میں کہا گیا ہے کہ حدیث ، قرآن کے بعد حجت ہے ۔ لیکن اس کی وضاحت میں وہ کہتے ہیں کہ یہ بات کہ حدیث کا درجہ قرآن کے بعد ہے ، اصولی حد تک تو درست ہے ۔ جہاں تک استدلال اور اخذِ مسائل

---

* جماعت اسلامی کا نظریۂ حدیث ، مولانہ محمد اسمٰعیل السلفی ، صفحہ ۳۸ ۔

کا تعلق ہے :

> ہمارے نزدیک حدیث وحی ہے اور اسی طرح آنحضرت ص کو اس کا علم دیا گیا ہے جیسے قرآن کا .... جبریل قرآن اور سنّت ، دونوں کو لے کر نازل ہوتے اور آنحضرت ص کو سنت بھی قرآن کی طرح سکھاتے ۔ اس لحاظ سے ہم وحی میں تفریق کے قائل نہیں ۔ قرآن اور حدیث دونوں ماخذ ہیں اور بیک وقت ماخذ ہیں * ۔

احادیث کے مجموعوں میں سے صحیحین (یعنی بخاری اور مسلم) کے متعلق ان کا عقیدہ ہے کہ

> امت نے صحیحین کی متفقہ روایات کو اجماعاً قبول فرمایا ۔ ان احادیث کی صحت قطعی ہے † ۔

لیکن اس کے برعکس دوسرا مکتب خیال ہے جس کا عقیدہ یہ ہے کہ :

> احادیث چند انسانوں سے چند انسانوں تک پہنچتی ہوئی آئی ہیں جن سے حد سے حد اگر کوئی چیز حاصل ہوتی ہے تو وہ گمانِ حجت ہے نہ کہ علمِ یقین ۔ اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اس خطرہ میں ڈالنا ہرگز پسند نہیں کرتا کہ جو امور اس کے دین میں اتنے اہم ہوں کہ ان

* جماعت اسلامی کا نظریۂ حدیث ، مولانا محمد اسمٰعیل السلفی ، صفحہ ۶۰ ۔

† ایضاً ، صفحہ ۵۵ ۔

> سے کفر و ایمان کا فرق واقع ہوتا ہو اُنہیں صرف چند آدمیوں کی روایت پر منحصر کر دیا جائے * ۔

اسی بناء پر وہ کہتے ہیں کہ :

> یہ مواد اس حد تک قابلِ اعتماد ضرور ہے کہ سنتِ نبوی ص اور آثارِ صحابہ رض کی تحقیق میں اس سے مدد لی جائے اور اس کا مناسب خیال کیا جائے ۔ مگر اس قابل نہیں کہ بالکل اسی پر اعتبار کر لیا جائے † ۔

امام بخاری کے مجموعۂ احادیث کے متعلق ان کا کہنا یہ ہے کہ :

> یہ دعویٰ کرنا صحیح نہیں ہے کہ بخاری میں جتنی احادیث درج ہیں اُن کے مضامین کو بھی جوں کا توں بلا تنقید قبول کر لینا چاہئے ‡ ۔

جن احادیث کو یہ حضرات صحیح مانتے ہیں اُنہیں بھی دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں : ایک وہ جن کے احکام میں رد و بدل نہیں ہو سکتا ، اور دوسری وہ جن میں اجتہاد کیا جا سکتا ہے ۔ اُن کے اپنے الفاظ میں :

> اب رہ گئے احکام ، تو قرآن مجید میں ان کے متعلق زیادہ تر کلی قوانین بیان کئے گئے ہیں اور بیشتر امور میں تفصیلات

---

* رسائل و مسائل ، ابوالاعلیٰ مودودی ، صفحہ ٦٧ ۔

تفہیمات ، حصہ ول ، صفحہ ۳۲۲ ، ابوالاعلیٰ مودودی ۔

‡ ترجمان القرآن ، بابت اکتوبر ۔ نومبر ۱۹۵۲ ، صفحہ ۱۱۷ ۔

> کو چھوڑا گیا ہے۔ نبی ص نے عملاً ان احکام کو زندگی کے معاملات میں جاری فرمایا اور اپنے عمل اور قول سے ان کی تفصیلات ظاہر فرمائیں۔ ان تفصیلات میں سے بعض ایسی ہیں جن میں ہمارے اجتہاد کو کوئی دخل نہیں۔ ہم پر لازم ہے کہ جیسا عمل حضور ص سے ثابت ہے، اس کی پیروی کریں۔ مثلاً عبادات کے احکام۔ اور بعض تفاصیل ایسی ہیں کہ ان سے ہم اصول اخذ کرکے اپنے اجتہاد سے فروع مستنبط کر سکتے ہیں۔ مثلاً عہدِ نبوی ص کے قوانینِ مدنی *۔

چونکہ اس وقت زیر غور مسئلے کا تعلق قوانینِ مدنی سے ہے، اس لئے (مندرجہ بالا اقتباس کی رو سے) اس بارے میں ان حضرات کا مسلک یہ ہے کہ جو مدنی قوانین رسول اللہ ص نے مرتّب فرمائے تھے، اُن سے اصول اخذ کرکے ہم اپنے اجتہاد سے فروع مستنبط کر سکتے ہیں۔

اسی عقیدہ کی وضاحت دوسرے مقام پر ان الفاظ میں کی گئی ہے:

> یہ حقیقت ناقابل انکار ہے کہ شارع نے غائت درجہ کی حکمت اور کمال درجہ کے علم سے کام لے کر اپنے احکام کی بجا آوری کے لئے زیادہ تر ایسی ہی صورتیں تجویز کی ہیں جو تمام زمانوں اور تمام حالات میں اس کے مقصد کو پورا کرتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود بکثرت جزئیات ایسے بھی ہیں جن میں تغیّرِ حالات کے لحاظ سے احکام میں تغیّر ہونا ضروری ہے۔ جو حالات عہدِ رسالت ص اور عہدِ صحابہ رض

---

* تفہیمات، حصہ اول، ابوالاعلیٰ مودودی، صفحہ ۳۳۲ - ۳۳۳۔

> میں عرب اور دنیائے اسلام کے تھے ، لازم نہیں کہ بعینہٖ وہی حالات ہر زمانے اور ہر ملک کے ہوں ۔ لہٰذا احکامِ اسلامی پر عمل کرنے کی جو صورتیں ان حالات میں اختیار کی گئی تھیں ، ان کو ، ہو بہو ، تمام زمانوں میں ، تمام حالات میں قائم رکھنا اور مصالح و حِکَم کے لحاظ سے ان کی جزئیات میں کسی قسم کا رد و بدل نہ کرنا ، ایک طرح کی رسم پرستی ہے جس کو روحِ اسلامی سے کوئی علاقہ نہیں .... پس معلوم ہوا کہ جزئیات میں دلالۃ النص اور اشارۃ النص تو ایک طرف ، صراحۃ النص کی پیروی بھی تفقہ کے بغیر درست نہیں ہوتی ۔ اور تفقہ کا اقتضا یہ ہے کہ انسان ہر مسئلہ میں شارع کے مقاصد و مصالح پر نظر رکھے اور انہی کے لحاظ سے جزئیات میں تغیّرِ احوال کے ساتھ ایسا تغیر کرتا رہے جو شارع کے اصولِ تشریع پر مبنی اور اس کے طرزِ عمل سے اقرب ہو* ۔

یہ مسلک یا عقیدہ نیا نہیں ، بلکہ قدیم سے چلا آ رہا ہے ۔ چنانچہ علامہ اقبال رح نے خطبۂ ششم میں کہا ہے کہ امام ابوحنیفہ رح اور شاہ ولی اللہ رح محدث دہلوی کا یہی مسلک تھا اور اسی کے مؤید خود علامہ اقبال رح تھے ۔ وہ اس باب میں لکھتے ہیں کہ :

> احادیث کی دو قسمیں ہیں : ایک وہ جن کی حیثیت قانونی ہے ، اور دوسری وہ جو قانونی حیثیت نہیں رکھتیں ۔ اوّل الذکر کے بارے میں ایک بڑا اہم سوال یہ پیدا ہوتا

---

* تفہیمات حصہ دوم ، ابوالاعلیٰ مودودی ، صفحہ ۳۲۷ - ۳۲۸ ۔

ہے کہ وہ کس حد تک ان رسوم و رواج پر مشتمل ہیں جو اسلام سے پہلے عرب میں رائج تھے اور جن میں سے بعض کو رسول اللہ ص نے علیٰ حالہ رکھا اور بعض میں ترمیم فرما دی ۔ آج یہ مشکل ہے کہ ان چیزوں کو پورے طور پر معلوم کیا جا سکے کیونکہ ہمارے متقدمین نے اپنی تصانیف میں زمانۂ قبل از اسلام کے رسوم و رواج کا زیادہ ذکر نہیں کیا ، نہ ہی یہ معلوم کرنا ممکن ہے کہ جن رسوم و رواج کو رسول اللہ ص نے علیٰ حالہ رکھا (خواہ آن کے لئے واضح طور پر حکم دیا ہو یا ویسے ہی آن کا استصواب فرما دیا ہو) ، آنہیں ہمیشہ کے لئے نافذ العمل رکھنا مقصود تھا ۔ اس موضوع پر شاہ ولی اللہ رح نے بڑی عمدہ بحث کی ہے جس کا خلاصہ میں یہاں بیان کرتا ہوں ۔ شاہ صاحب رح نے کہا ہے کہ پیغمبرانہ طریقِ تعلیم یہ ہوتا ہے کہ رسول کے احکام ان لوگوں کے عادات و اطوار اور رسوم و رواج کو خاص طور پر ملحوظ رکھتے ہیں جو اس کے اوّلین مخاطب ہوتے ہیں ۔ پیغمبر کی تعلیم کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ وہ عالمگیر اصول عطا کر دے ۔ لیکن نہ تو مختلف قوموں کے لئے مختلف اصول دئے جا سکتے ہیں اور نہ ہی انہیں بغیر کسی اصول کے چھوڑا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے مسلکِ زندگی کے لئے جس قسم کے اصول چاہیں ، وضع کر لیں ۔ لہٰذا پیغمبر کا طریق یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص قوم کو تیار کرتا ہے اور آنہیں ایک عالمگیر شریعت کے لئے بطور خمیر استعمال کرتا ہے ۔ اس مقصد کے لئے وہ ان اصولوں پر زور دیتا ہے جو تمام

نوعِ انسان کی معاشرتی زندگی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ لیکن ان اصولوں کا نفاذ اس قوم کے عادات و خصائل کی روشنی میں کرتا ہے جو اُس وقت اُس کے سامنے ہوتی ہے۔ اس طریق کار کی رو سے رسول کے احکام اُس قوم کے لئے خاص ہوتے ہیں اور چونکہ ان احکام کی ادائیگی بجائے خویش مقصود بالذات نہیں ہوتی ، انہیں آنے والی نسلوں پر من و عن نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ امامِ اعظم ابو حنیفہ رح نے (جو اسلام کی عالمگیریت کی خاص بصیرت رکھتے تھے) اپنے فقہ کی تدوین میں حدیثوں سے کام نہیں لیا۔ اُنہوں نے تدوینِ فقہ میں استحسان کا اصول وضع کیا ، جس کا مفہوم یہ ہے کہ قانون وضع کرتے وقت اپنے زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھنا چاہئے۔ اس سے احادیث کے متعلق ان کے نقطۂ نظر کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ امام ابو حنیفہ رح نے تدوینِ فقہ میں احادیث سے اس لئے کام نہیں لیا کہ اُن کے زمانے میں احادیث کے کوئی باضابطہ مجموعے مرتّب نہیں ہوئے تھے۔ اول تو یہ کہنا ہی درست نہیں کہ اُن کے زمانے میں احادیث کے مجموعے موجود نہیں تھے۔ امام مالک رح اور زہری رح کے مجموعے اُن کی وفات سے قریب تیس سال پہلے مرتّب ہو چکے تھے۔ لیکن اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ یہ مجموعے امام صاحب تک پہنچ نہیں پائے تھے یا اُن میں قانونی حیثیت کی احادیث موجود نہیں تھیں تو اگر امام صاحب اس کی ضرورت سمجھتے تو وہ احادیث کا اپنا مجموعہ مرتّب فرما سکتے تھے۔

> جیسا کہ امام مالک رح اور اُن کے بعد امام احمد بن حنبل رح نے کیا تھا ۔ ان حالات کی روشنی میں میں بھی یہ سمجھتا ہوں کہ ان احادیث کے متعلق ، جن کی حیثیت قانونی ہے ، امام ابو حنیفہ رح کا یہ طرزِ عمل بالکل معقول اور مناسب تھا ۔ اور اگر آج کوئی وسیع النظر مقنن یہ کہتا ہے کہ احادیث ہمارے لئے من و عن شریعت کے احکام نہیں بن سکتیں تو اس کا یہ طرزِ عمل امام ابو حنیفہ رح کے طرزِ عمل کے ہم آہنگ ہوگا جن کا شمار فقہ اسلامی کے بلند ترین مقننین میں ہوتا ہے * ۔

اپنے اس مسلک کی تائید میں ان حضرات کے پاس قرآنی دلائل و بیّنات ہیں (ان کی تفصیل چوبیسویں خط میں دی جا چکی ہے) جن کا ملخص (Summary) حسب ذیل ہے :

۱- اسلام میں اصلاً و اساساً اطاعت صرف قوانین خداوندی کی ہے جو کتاب اللہ کے اندر مذکور ہیں ۔ سورۂ انعام میں ہے :

اَفَغَیْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِیْ حَکَمًا وَّ هُوَ الَّذِیْ اَنْزَلَ
اِلَیْکُمُ الْکِتَابَ مُفَصَّلاً (٦/١١٥)

کیا میں (یعنی رسول اللہ ص) خدا کے سوا کسی اور کو حاکم بنا لوں ؟ حالانکہ اُس نے تمہاری طرف وہ کتاب نازل کر دی ہے جو ہر بات کو نکھار کر بیان کر دیتی ہے ۔

۲- جو اس کے مطابق فیصلے نہیں کرتا وہ مسلمان نہیں ہے ۔

---

* خطبات اقبال ، صفحہ ۱۶۳ - ۱۶۴ ۔

سورۂ مائدہ میں ہے ۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۴)

جو اس کے مطابق فیصلے نہیں کرتا جو خدا نے نازل کیا ہے ،
تو یہی لوگ کافر ہیں ۔

۳۔ لیکن خدا کی یہ اطاعت انفرادی طور پر نہیں ہو سکتی ۔ یہ نہیں کہ ہر شخص اپنے سامنے قرآن رکھ لے اور جس طرح اس کا جی چاہے اس کی اطاعت کرتا رہے ۔ یہ اطاعت اجتماعی حیثیت سے ایک نظام کے تابع ہوگی جس کا مرکز اول رسول‌ص کی ذات تھی ۔ لہٰذا اللہ کی اطاعت بواسطہ رسول‌ص کے ہونی تھی ۔ سورۂ نسا میں ہے ۔

وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (۴/۸۰)

جس نے رسول‌ص کی اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی ۔

رسول‌ص کے لئے ضروری تھا کہ وہ ہر معاملہ کا فیصلہ قرآن کی رو سے کرتا ۔ سورۂ مائدہ میں ہے ۔

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (۵/۴۸)

۴۔ لیکن کتاب اللہ کی صورت یہ ہے کہ اس میں (بجز چند مستثنیات) عام طور پر اصولی قوانین دئے گئے ہیں ۔ ان قوانین کی جزئیات متعین نہیں کی گئیں ۔ یہ اصولی احکام مکمل اور غیر متبدّل ہیں ۔ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ (۶/۱۱۶) ”تیرے رب کے قوانین صدق

و عدل کے ساتھ مکمل ہوگئے ۔ ان میں تبدیلی کرنے والا کوئی نہیں ۔

۵۔ ان جزئیات کو غیر متعین اس لئے چھوڑا گیا ہے کہ اگر انہیں بھی وحی کی رو سے متعین کر دیا جاتا تو یہ بھی ہمیشہ کے لئے غیر متبدل ہو جاتیں۔ ان کا غیر متبدل رکھنا منشائے خداوندی نہیں تھا ۔ چنانچہ سورۂ مائدہ میں ہے :

> يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَسْأَلُوا عَنْ أَشْيَاءَ
> إِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ ۔ وَإِنْ تَسْأَلُوا عَنْهَا حِينَ
> يُنَزَّلُ الْقُرْآنُ تُبْدَ لَكُمْ عَفَا اللَّهُ عَنْهَا وَاللَّهُ
> غَفُورٌ حَلِيمٌ (٥/١٠١)

> اے ایمان والو ! تم ایسی باتیں نہ پوچھا کرو کہ اگر وہ تم پر ظاہر کر دی جائیں تو تمہیں ناگوار گذریں ۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جب تم ان کے متعلق ایسے وقت میں پوچھو گے جب قرآن نازل ہو رہا ہے تو وہ تم پر ظاہر کر دی جائیں گی ۔ (بہر حال ، اب تک جو کچھ تم کر چکے ہو) اللہ اس سے در گزر کرتا ہے ، اللہ غفور و حلیم ہے ۔

اس سے آگے ہے :

> قَدْ سَأَلَهَا قَوْمٌ مِنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ أَصْبَحُوا بِهَا كَافِرِينَ (٥/١٠٢)

> تم سے پہلے ایک قوم (بنی اسرائیل) نے اس قسم کی باتیں (کرید کرید کر) پوچھی تھیں ۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ

> انہوں نے (کچھ وقت کے بعد) اُن سے صاف انکار کر دیا (اور سرکشی برتنے لگے) :

اس آیت کی تفسیر میں نبی اکرمؐ کی ایک حدیث نقل کی جاتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ۔

> إِنَّ اللهَ فَرَضَ فَرَائِضَ فَلَا تُضَيِّعُوْهَا وَحَرَّمَ حُرُمَاتٍ فَلَا تَنْتَهِكُوْهَا وَحَدَّ حُدُوْدًا فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۔ وَسَكَتَ عَنْ أَشْيَاءَ مِنْ غَيْرِ نِسْيَانٍ فَلَا تَبْحَثُوْا عَنْهَا ۔

> اللہ نے کچھ باتوں کو فرض قرار دیا ہے انہیں ضائع مت کرو ۔ کچھ چیزوں کو حرام قرار دیا ہے اُن کے پاس تک نہ پھٹکو ۔ کچھ حدود متعین کی ہیں اُن سے تجاوز مت کرو ۔ اور باقی چیزوں کے متعلق خاموشی اختیار کی ہے اُن کے متعلق کرید مت کرو ۔ یاد رکھو جن چیزوں کے متعلق اللہ نے خاموشی اختیار کی ہے اُس نے دانستہ ایسا کیا ہے ۔ یہ نہیں ہوا کہ اُس سے (معاذ اللہ) بھول ہوگئی ہے ۔

۶۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن میں بیان کردہ غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں اُن جزئیات کو کس طرح مرتب کیا جائے جنہیں قرآن نے دانستہ غیر متعین چھوڑ دیا ہے ۔ ان کے متعلق نبی اکرمؐ کو حکم دیا گیا تھا کہ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (۳/۱۵۸) تم معاملات میں اُن (جماعتِ مومنین) سے مشورہ کیا کرو ۔ اس حکم کے ماتحت یہ غیر متعین جزئیات باہمی

مشاورت سے طے پاتی تھیں ۔ کتب روایات و سیر میں کئی واقعات مذکور ہیں جن سے ظاہر ہے کہ حضورص صحابہ رض سے مشورہ کیا کرتے تھے ۔

اس کی مثالیں چوبیسویں خط میں دی جا چکی ہیں ۔

۷۔ یہ سلسلہ نبی اکرمص کی زندگی میں اسی طرح قائم رہا ۔ اب سوال یہ سامنے آتا ہے کہ حضورص کی وفات کے بعد اطاعتِ خداوندی کی کونسی صورت مقصود تھی ۔ اس سلسلہ میں قرآن نے واضح طور پر بتا دیا کہ :

> وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۔ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۔
> اَفَاِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰى اَعْقَابِكُمْ (۳/۱۴۳)
>
> محمدص بجز ایں نیست کہ اللہ کا ایک رسول ہے ۔ اس سے پہلے
> بہت سے رسول گذرے ہیں ۔ سو اگر یہ وفات پا جائے یا قتل
> کر دیا جائے تو کیا تم اس کے بعد پھر الٹے پاؤں پھر جاؤ گے ؟

یعنی حضورص کے بعد اطاعت خداوندی کے اسی سلسلہ کو بدستور قائم رکھنا مقصود تھا ۔ یہی وجہ تھی کہ حضورص کی وفات کے بعد صحابہ رض نے سب سے پہلے یہ کام کیا کہ اپنے میں سے ایک (حضرت ابوبکر صدیق رض) کو حضورص کا جانشین (خلیفہ) منتخب کر لیا ۔ جس طرح رسول اللہص (اس سے پہلے اللہ کی اطاعت کراتے تھے) ، اب خلیفۃ الرسولص نے اسی طرح خدا کی اطاعت کرانا شروع کر دی ۔ جس طرح اس سے پہلے ، رسول کی اطاعت سے عملاً خدا کی اطاعت ہوتی تھی ، اسی طرح اب خلیفۃ الرسولص کے فیصلوں کی اطاعت ، خدا اور رسولص کی اطاعت تھی ۔ اسی کے لئے رسول اللہص نے فرمایا تھا کہ عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ (مشکوٰۃ باب

الاعتصام بالکتاب و السنۃ) تم پر میرے طریقے اور میرے خلفاء راشدین المہدین کے طریقے کی پیروی لازمی ہے - جس طرح رسول اللہ ص کو حکم دیا گیا تھا کہ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (٣/١٥٨) ان (مومنین) سے معاملات میں مشورہ کیا کرو - اسی طرح خلافت کے متعلق تھا کہ أَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ (٤٢/٣٨) ان کے معاملات باہمی مشوروں سے طے پائیں گے - اسی کو قرآن نے وہ سبیل المومنین قرار دیا ہے (٤/١١٥) جسے چھوڑ کر کوئی دوسرا راستہ اختیار کرنے کی اجازت نہیں ہے -

۸- اب سوال یہ سامنے آتا ہے کہ خلافت راشدہ یا خلافت علی منہاج رسالت) میں جزئیات کا تعین کس طرح سے ہوتا تھا اس کے متعلق کتب روایات و آثار میں ایسی شہادات موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی شکل یہ تھی کہ :

۱- جن امور کی جزئیات پہلے متعین نہیں ہوئی تھیں ان کی جزئیات متعین کی جاتی تھیں - مثلاً شراب کی سزا نبی اکرم ص کے زمانے میں مقرر نہیں ہوئی تھی (ایسا کوئی واقعہ ہی سامنے نہیں آیا ہوگا) حضرت ابوبکر صدیق رض نے اس کی سزا چالیس کوڑے مقرر فرمائی (حضرت عمر رض نے اسے اسّی کوڑے کر دیا تھا) -

۲- جو جزئیات پہلے متعین ہو چکی تھیں اور ان میں کسی تغیر و تبدل کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی - انہیں علیٰ حالہ رہنے دیا جاتا تھا - ایک آئینی حکومت کا یہی انداز ہوتا ہے - اس میں سابقہ حکومت کے فیصلے بدستور نافذ العمل رہتے ہیں تا آنکہ تغیر حالات

سے ان میں تبدیلی نہ کر دی جائے۔

۳۔ جن جزئیات میں اقتضائے حالات کے مطابق ، کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس ہوتی تھی ان میں تبدیلی کر دی جاتی تھی۔ اس لئے کہ یہ جزئیات ابتداء میں بھی وحی کی رو سے متعین نہیں ہوئی تھیں کہ ان میں وحی ہی کوئی تبدیلی کر سکتی۔ اس کی چند ایک مثالیں چوبیسویں خط میں لکھی جا چکی ہیں۔

ان پر ایک نظر پھر ڈال لو۔

بہر حال ، یہ ہیں وہ قرآنی دلائل اور کتبِ روایات و تاریخ کے شواهد ، جنہیں یہ گروہ اپنے مسلک کی تائید میں پیش کرتا ہے۔ یعنی اس مسلک کی تائید میں کہ غیر متبدّل صرف قرآن کے قوانین ہیں اور ان کی روشنی میں مرتب کردہ جزئیات میں ”خلافت علیٰ منہاج رسالت“ زمانے کے تقاضوں کے مطابق تبدیلی کر سکتی ہے۔ علامہ اقبال رح کے خطبات کا جو اقتباس اوپر درج کیا جا چکا ہے ، اس میں اُنہوں نے اس ضمن میں امام ابو حنیفہ رح اور شاہ ولی اللہ رح محدث دهلوی کا نام خاص طور پر لیا ہے۔ امام اعظم رح کے متعلق ، خطیب بغدادی ، اپنی تاریخ (جلد ۱۳ ، صفحہ ۳۹۰) میں یوسف بن اسباط کے حوالے سے لکھتا ہے کہ :

> ابو حنیفہ رح فرمایا کرتے تھے کہ نبی صلعم مجھے پاتے اور میں آپ کو پاتا (یعنی دونوں ایک زمانہ میں ہوتے) تو آپ میرے بہت سے اقوال اختیار فرما لیتے۔ دین اس کے سوا اور کیا ہے کہ وہ اچھی اور عمدہ رائے کا نام ہے۔

اس کے بعد خطیب نے لکھا ہے کہ ابو عوانہ نے بیان کیا کہ ” میں ایک روز ابو حنیفہ رح کے پاس بیٹھا تھا کہ سلطان کی طرف سے ایک ایلچی آیا۔

اُس نے کہا کہ امیر نے پوچھا ہے کہ ایک آدمی نے شہد کا چھتہ چرا لیا ہے ، اس کے بارے میں کیا حکم ہے ۔ ابو حنیفہ رح نے بلا کسی ھچکچاھٹ کے جواب دیا کہ اس کی قیمت اگر دس درھم ھو تو اُس کا ھاتھ کاٹ دو ۔ ایلچی چلا گیا تو میں نے ابو حنیفہ رح سے کہا کہ تم خدا سے نہیں ڈرتے ۔ مجھ سے یحیٰی بن سعید نے بیان کیا ، اُنھوں نے محمد بن حبان سے ، اُنھوں نے رافع بن خدیج سے کہ رسول اللہ ص نے ارشاد فرمایا کہ پھل پھلواری کی چوری میں ھاتھ نہیں کاٹا جا سکتا ۔ فوراً اُس آدمی کی مدد کو پہنچو ورنہ اس کا ھاتھ کٹ جائے گا ۔ اس پر ابو حنیفہ رح نے پھر بلا تامل کہا کہ وہ حکم گذر چکا اور ختم ھو چکا ۔ چنانچہ اس چور کا ھاتھ کاٹ دیا گیا “ ۔

یہ تھی امام اعظم رح کے مسلک کی مثال ۔ شاہ ولی اللہ رح نے ، حجۃ اللہ البالغہ میں ایک باب باندھا ہے جس کا عنوان ہے ” علوم نبوی ص کے اقسام “ ۔ اس میں اُنھوں نے لکھا ہے کہ حضور ص نے فرمایا ہے کہ ” میں ایک انسان ھوں جب تم سے کوئی دین کی بات بیان کروں تو اسے اختیار کرو اور جو بات اپنی رائے سے بیان کروں تو میں ایک انسان ھوں “ ۔ اس پر شاہ صاحب نے کہا ہے کہ ان امور کا تعلق تبلیغ رسالت سے نہیں تھا ۔ اس کے بعد وہ لکھتے ھیں کہ ایسے ھی وہ امور ھیں جن میں آنحضرت ص کے عہد میں ایک جزئی مصلحت تھی لیکن وہ تمام اُمت کے لئے لازمی اور حتمی نہ تھے ۔ اسی حصہ میں آپ کے احکام اور فیصلے بھی شامل ھیں ۔ یا وہ امور جو تدبیر خانہ داری اور آداب معاش اور سیاست مدن سے تعلق رکھتے ھیں ، شارع نے ان امور کے لئے کوئی مقدار معین نہیں کی ہے ۔

شاہ صاحب کے اس مسلک کی وضاحت کرتے ھوئے مولانا عبید اللہ سندھی (جو حکمت ولی اللھی کے بہترین شارع اور مبلغ تصور کئے جاتے ھیں)

لکھتے ہیں۔

> واضح رہے کہ جب اساسی قانون پر عملدرآمد شروع ہوتا ہے تو مخاطبین کی حالت کے مطابق چند تمہیدی قوانین بنائے جاتے ہیں۔ فرق یہ ہوتا ہے کہ قانونِ اساسی غیر متبدل ہوتا ہے اور تمہیدی قوانین ضرورت کے وقت بدل سکتے ہیں۔ ہم ''سنت'' ان تمہیدی قوانین کو کہتے ہیں جو رسول اللہ ص اور آپ کے بعد خلفائے ثلاثہ نے مسلمانوں کی مرکزی جماعت کے مشورے سے تجویز کئے۔ خلافت عثمانی رض کے بعد یہ نظام ٹوٹ گیا کہ تمام کام مشورے سے کئے جائیں۔ سنت کو ہمارے فقہائے حنفیہ رسول اللہ ص اور خلفائے راشدین میں مشترک مانتے ہیں اور یہی ہماری رائے ہے۔ یہ سنت قرآن ہی سے پیدا ہوگی۔ آج کل کی اصطلاح میں اس کو بائیلاز کہا جاتا ہے.... اصل قانونِ اساسی متعین ہے۔ '' بائیلاز '' اُس وقت اور تھے اس وقت اور ہوں گے جن میں زمانہ کے اقتضاآت کے مطابق فروعی تبدیلیاں ہوں گی۔ نئی نئی پیش آمدہ صورتوں کے متعلق تفصیلی احکام کا استخراج ہوگا اور اس کا نام فقہ ہے*۔

فقہ اور حدیث سے متعلق دونوں مکاتب فکر کا یک جا ذکر کرتے ہوئے علامہ اقبال رح کہتے ہیں:

> جائے حیرت ہے کہ موجودہ حنفی علماء نے خود اپنے مکتب فقہ کی روح کے خلاف امام ابو حنیفہ رح اور ان کے رفقاء کے

---

*الفرقان ۔ ولی اللہ نمبر صفحہ ۲٦۳ ۔

> فیصلوں کو ابدی اور غیر متبدل قرار دے رکھا ہے۔ بعینہٖ اسی طرح جس طرح امام ابو حنیفہرح کے ناقدین نے ان فیصلوں کو ابدی قرار دے لیا تھا جو عہد رسالت مآبص اور صحابہرض میں پیش آمدہ مقدمات کے سلسلہ میں نافذ ہوئے۔

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، ہمارے ہاں ایسے لوگ موجود ہیں جن کا مسلک، اس مسلک سے مختلف ہے۔ ان حضرات کی طرف سے اس مسلک کی مخالفت ضروری ہے۔ چنانچہ اس مخالفت کو خود علامہ اقبال رح نے محسوس (بلکہ Anticipate) کیا تھا۔ وہ اپنے خطبات میں لکھتے ہیں:

> مجھے اس میں ذرا سا بھی شبہ نہیں کہ اگر اسلامی قانون سے متعلق ضخیم لٹریچر کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو اس سے دورِ حاضر کے ناقدین کے اس سطحی خیال کی تردید ہو جائے گی کہ اسلامی قانون جامد اور ناقابلِ ترقی ہے۔ بد قسمتی سے ہمارے ہاں کا قدامت پرست طبقہ ابھی اس کے لئے تیار نہیں کہ قانون سازی کے مسئلہ کے متعلق تنقیدی نقطۂ نگاہ سے گفتگو کی جائے۔ اگر کسی نے اس بات کو اٹھایا تو یہ اقدام بہت سے لوگوں کے لئے وجۂ ناراضگی ہو جائے گا اور مخالفت کا دروازہ کھول دے گا۔ بایں ہمہ میں، اس باب میں کچھ عرض کرنے کی جرآت کروں گا*۔

لہٰذا اس باب میں قدامت پرست طبقہ کی طرف سے مخالفت قابلِ فہم ہے۔ لیکن ہمارے ہاں مصیبت یہ ہے کہ خیالات کے اختلاف کی بنا پر مخالفت میں اس حد

---

* خطبات صفحہ ۱۵۶ -

تک تشدّد برتا جاتا ہے کہ فریقِ مخالف میں کفر اور بے دینی کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ چنانچہ اس اختلاف کی وجہ سے (اور تو اور) خود امام اعظم رح کے متعلق جو کچھ کہا گیا وہ اس تشدّد کی بیّن مثال ہے۔ خطیب بغدادی لکھتا ہے کہ:

> امام مالک بن انس رح کہتے ہیں کہ ابو حنیفہ رح کا فتنہ اس اُمت کے لئے (معاذ اللہ) ابلیس کے فتنے سے کم نہیں۔ عقیدۂ ارجا میں بھی اور احادیث کو رد کرنے میں بھی۔ عبدالرحمان بن مہدی کہتے ہیں کہ دجال کے فتنہ کے بعد اسلام میں کسی فتنہ کو ابوحنیفہ رح کے فتنہ سے بڑا نہیں دیکھا۔ سلمان بن حسان حلبی کہتے ہیں کہ میں نے بے شمار مرتبہ امام اوزاعی رح کو کہتے سنا ہے کہ ابوحنیفہ رح نے اسلام کے ایک ایک دستے کو گن گن کر توڑا ہے۔ فزاری کہتے ہیں کہ میں نے سفیان اور اوزاعی دونوں کو یہ کہتے سنا ہے کہ اسلام میں (معاذ اللہ) ابوحنیفہ رح سے زیادہ بد بخت ترین پیدا نہیں ہوا۔ امام شافعی رح نے بد ترین کا لفظ کہا ہے۔ ابوعبید کہتے ہیں کہ میں اَسود بن سالم کے ساتھ رُصافہ کی جامع مسجد میں بیٹھا تھا۔ وہاں کسی مسئلہ کا تذکرہ آ گیا۔ میرے منہ سے نکل گیا کہ ابوحنیفہ رح ایسا کہتے ہیں تو اسود نے مجھے ڈانٹ کر کہا کہ تو مسجد میں ابوحنیفہ رح کا تذکرہ کرتا ہے؟ مسجد میں ابوحنیفہ رح کا نام لینے کے جرم میں وہ مجھ سے اس قدر ناراض ہوئے کہ مرتے دم تک پھر مجھ سے کلام نہیں کیا*۔

---

*یہ تمام تفاصیل خطیب بغدادی کی تاریخ کی جلد نمبر ۱۳ میں موجود ہیں۔

مخالفت میں شدّت کا یہ مسلک ہمارے ہاں بد قسمتی سے آج تک چلا آ رہا ہے ۔

بہر حال یہ تو جملہ معترضہ تھا ۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ خلافتِ راشدہ میں قانون سازی کی صورت یہ تھی کہ اگر زمانے کے تقاضے کسی سابقہ فیصلہ میں تبدیلی کے متقاضی ہوتے ، تو باہمی مشاورت سے ایسی تبدیلی کر لی جاتی ۔ اگر خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کا یہ سلسلہ قائم رہتا تو ظاہر ہے کہ قانونی تبدیلیوں کی یہ شکل بھی ساتھ کے ساتھ آگے بڑھتی رہتی اور اس طرح ثبات و تغیّر کے اِمتزاج سے ، ہمارا قانونِ شریعت اپنی ارتقائی منازل طے کئے چلا جاتا ۔ لیکن افسوس کہ وہ سلسلہ منقطع ہوگیا ۔ اور اس کے بعد قانون میں جانچ پڑتال کا سلسلہ بھی ختم ہوگیا ۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہمارے فقہی مکاتب نے اس سلسلہ کو کچھ وقت تک جاری رکھا لیکن ایک تو وہ انفرادی کوششیں تھیں اور دوسرے ان پر بھی ایک وقت کے بعد جمود و تعطّل چھا گیا ۔ میں اس وقت سلیم ! اس تاریخی بحث میں نہیں پڑنا چاھتا کہ یہ کیسے ہوا اور کیوں ہوا ۔ ہمارے پیشِ نظر موضوع کے ضمن میں جو اہم سوال سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ اب جبکہ خلافت علیٰ منہاج رسالت کا نظام مدت ہوئی ختم ہو چکا ہے ، تو ایک اسلامی مملکت کے لئے قانون سازی کے سلسلہ میں کیا صورت اختیار کی جائے ؟ اس کا جواب صاف اور سیدھا ہے اور وہ یہ کہ وہی شکل اختیار کی جائے جو عہد رسول اللہؐ والذین معہ، میں اختیار کی گئی تھی ۔ یعنی خلافت علیٰ منہاج رسالت کو دوبارہ قائم کیا جائے ۔ اس ضمن میں بعض حضرات کو کہتے سنا گیا ہے کہ صاحب ! یہ تو وہ شکل ہے جس کا اب کوئی امکان ہی نہیں ۔ اب ہم " ابوبکر صدیق رضؓ اور عمر رضؓ " کو کہاں سے لائیں جو ایسی خلافت قائم کریں ۔ یہ مایوسی ایک غلط فہمی کی پیدا کردہ ہے ۔ اگر اس تصوّر کو صحیح

مان لیا جائے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ قرآن، تاریخ کے ایک خاص دور کے لئے ضابطۂ حیات بن سکتا تھا، اس کے بعد نہیں۔ یہ تصوّر غلط ہے۔ قرآن کو محفوظ رکھنے سے مقصد ہی یہ تھا کہ یہ ہر زمانے میں ہر مقام کے انسانوں کے لئے ان کی عملی زندگی کا ضابطہ بن سکے۔ لہٰذا قرآن کی روشنی میں جو نظام ایک بار متشکل کیا گیا تھا وہ اب بھی قائم کیا جا سکتا ہے۔ اس نظام کے قیام کی شکل یہ ہے کہ ایک مملکت اس امر کا فیصلہ کرے کہ اس نے اپنے معاشرے کو ان غیر متبدّل خطوط پر متشکل کرنا ہے جو قرآن میں محفوظ ہیں۔ پھر یہ مملکت اسلامی قانون سے متعلق اپنے لٹریچر پر نگاہ ڈالے۔ اس میں جو کچھ ایسا ملے جو قرآنی اصولوں کی روشنی میں ہمارے زمانے کے تقاضوں کو پورا کر سکے۔ اسے علیٰ حالہ اختیار (Adopt) کر لے۔ جس میں کسی تبدیلی کی ضرورت ہو، وہ تبدیلی کر لی جائے، اور نئی نئی پیش آمدہ صورتوں کے لئے نئی نئی جزئیات متعین کر لی جائیں۔ یہ سب کچھ نمائندگانِ اُمت کے باہمی مشورے سے ہو۔ اس طرح پھر سے اس نظام کی طرح پڑ جائے گی جو قرآن کی بنیادوں پر استوار ہوگا۔ یہ نظام بتدریج اپنی خامیوں کو دور کرتا ہوا، ترقی کرتا اپنے منتہٰی کی طرف بڑھتا چلا جائے گا۔ یہی وہ سبیل المؤمنین ہے جس پر چلنے کی قرآن نے تاکید کی ہے۔ جب تک ایسا نظام قائم نہیں ہوتا اس وقت تک اُمت جس طریق پر چلتی آ رہی ہے اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کرنی چاہئے۔ اس لئے کہ تبدیلی کا حق صرف نظام کو حاصل ہے۔ کسی فرد کو نہیں خواہ اس کی فکر و بصیرت کتنی ہی بلند کیوں نہ ہو۔

یہ ہے عزیزم! میرے نزدیک اسلامی مملکت میں قانون سازی کا اصول اور طریق جس کی نشان دہی علامہ اقبال رح نے اپنے خطبات میں کی تھی۔ اُنہوں نے یہ بات (۱۹۲۸ء میں) اُس زمانے میں کہی تھی جب پاکستان کا

تصوّر ہنوز ان کے ضمیر میں پہلو بدل رہا تھا ۔ اُن کے نزدیک اس کی اھمیت اس قدر تھی کہ اُنھوں نے (اس سے بھی بہت پہلے) اپنے ایک خط میں لکھا تھا کہ :

> میرا عقیدہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطۂ نگاہ سے زمانہ کے جورس پروڈنس (Jurisprudence) پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکام قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کر دے گا وھی اسلام میں مجدد ھوگا اور بنی نوع انسان کا سب سے بڑا محسن بھی وھی ھوگا۔۔۔۔ افسوس ہے کہ زمانۂ حال کے اسلامی فقہاء یا تو زمانہ کے میلان طبیعت سے بالکل بے خبر ھیں یا قدامت پرستی میں مبتلا۔۔۔۔ میری ناقص رائے میں اسلام اس وقت گویا زمانے کی کسوٹی پر پرکھا جا رہا ہے اور شاید اسلام کی تاریخ میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا* ۔

علامہ اقبال رح نے ”شاید“ کا لفظ اس وقت استعمال کیا تھا جب پاکستان وجود میں نہیں آیا تھا ۔ تشکیل پاکستان کے بعد، یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ :

تاریخ اسلام میں ایسا وقت پہلے کبھی نہیں آیا

یہ وہ وقت ہے جس کے متعلق اُنھوں نے (اپنے خطبات میں) کہا تھا کہ :

> یہ سوال زود یا بدیر مسلم اقوام کے سامنے آنے والا ہے کہ

---

* اقبال نامہ ۔ جلد اول صفحہ ۵۰ ۔

> اسلامی قوانینِ شریعت میں ارتقاء کی گنجائش ہے یا نہیں۔ یہ سوال بڑا اہم ہے اور بہت بڑی ذہنی جد و جہد کا متقاضی اس سوال کا جواب یقیناً اثبات میں ہونا چاہئے بشرطیکہ اسلامی دنیا اس کی طرف عمرؓ کی روح کو لے کر آگے بڑھے۔ وہ عمرؓ جو اسلام کا سب سے پہلا اور حریت پسند قلب ہے۔ وہ جسے رسول اللہؐ کی حیات طیبہ کے آخری لمحات میں یہ کہنے کی جرأت نصیب ہوئی کہ ـــــ حسبنا کتاب اللہ۔

وہ اپنے اس اہم خطبہ کا خاتمہ ان الفاظ پر کرتے ہیں:

> اسلام کا بنیادی تخیّل یہ ہے کہ اب وحی کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ اس بنا پر ہمیں دنیا کی سب سے زیادہ آزاد قوم ہونا چاہئے۔ پہلے زمانے کے مسلمان جو ایشیائے قبل از اسلام کی روحانی غلامی سے (نئے نئے) آزاد ہوئے تھے، اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ وہ (ختمِ نبوّت کے) بنیادی تخیّل کی اہمیّت کا صحیح صحیح اندازہ کر سکتے۔ لیکن دورِ حضر کے مسلمان کو چاہئے کہ وہ اپنی پوزیشن کو اچھی طرح سے سمجھے۔ (قرآن کے) غیر متبدّل اصولوں کی روشنی میں اپنے معاشرے کی تشکیل جدید کرے اور وہ عالم‌گیر جمہوریت قائم کرکے دکھا دے جو اسلام کی اصل و غایت ہے، لیکن جو ابھی تک پورے طور پر بے نقاب ہو کر دنیا کے سامنے نہیں آئی۔

اگر سلیم! ملّت پاکستانیہ نے قرآنی اصولوں کے مطابق فقۂ اسلامی کی تشکیلِ جدید کی رُو سے اسلام کی عالمگیر جمہوریت قائم کرکے دکھا دی تو

اس کے حصہ میں عالم اسلامی کی امامت اور اقوام عالم کی فکری قیادت آسکے گی۔ لیکن اگر یہ اپنے اس اہم اور نازک فریضہ میں ناکام رہ گئی تو دنیا اس کی ناکامی کو خود اسلام کی ناکامی تصوّر کرے گی اور اس تجربہ کو بطور شہادت پیش کرکے کہہ دے گی کہ اسلام، تاریخ کے ایک خاص دور میں کامیاب ہو تھا، اس کے بعد یہ اپنی توانائیوں کو کھو بیٹھا ہے اور اب یہ زمانے کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دینے کے قابل نہیں رہا۔

ذرا سوچو سلیم! کہ اس سے ہم انسانیت کی عدالت میں کتنے عظیم اور شدید جرم کے مرتکب ہوں گے۔ وَيٰلَيْتَنِىْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا۔

والسلام

پرویز

اکتوبر ۱۹۵۷ء

ستائیسواں خط

(جشن نزول قرآن)

ھاں سلیم ! جیسا کہ میں پہلے بھی کہ چکا ھوں ، عید میلاد النبیؐ ، اور جشن نزول قرآن ایک ھی حقیقت کے دو پہلو اور ایک ھی سکہ کے دو رخ ھیں ۔ عید میلاد النبیؐ کے سلسلہ میں تمھیں اس سے پہلے بہت کچھ لکھ چکا ھوں ۔ اب جشن نزول قرآن کے ضمن میں مختصراً بتانا چاھتا ھوں ۔ اس کی تمہید میں کچھ ایسے نکات بھی مل جائیں گے جو عید میلاد کے سنسلہ میں (یا مقام محمدیؐ کے ضمن میں) پہلے لکھے جا چکے ھیں ۔ انھیں قند مکرر سمجھو ۔ لو اب غور سے سنو کہ قرآن کے متعلق ، خود قرآن بھیجنے والا کیا کہتا ہے ۔ قرآن ، خدا کی کتاب ہے اور کتاب بھی ایسی جس کے متعلق بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ۔ ترا کشید و دست از قلم کشید خدا ۔ یہی وہ آخری کتاب ہے جس کے مطابق عدالت خداوندی سے کائنات انفس و آفاق کے تمام معاملات کے فیصلے ھوتے اور جس کی رو سے قوموں کو آن کی موت و حیات کے پروانے ملتے ھیں ۔ قرآنی تعلیم کا نقطۂ ماسکہ یہ ہے کہ کائنات میں ھر شے خدا کے متعین کردہ قانون کے مطابق سرگرم عمل ہے ۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ محیرالعقول کارگۂ ھستی ، جس کے تصور سے ذھن انسانی ورطۂ حیرت میں ڈوب

کر رہ جاتا ہے اس حسن و خوبی اور ربط و ضبط سے چل رہا ہے کہ اس میں نہ کہیں کوئی سقم ہے نہ خلل ، نہ فساد ہے نہ انتشار ، نہ تزاحم ہے نہ تصادم ۔ ہر شے اپنے اپنے فریضہ کی ادائیگی میں انتہائی جذب و انہاک سے سرگرداں ہے ۔ اور اس سعی و عمل کا مجموعی نتیجہ ، تعمیر و ارتقاء (Construction and Progress) کی شکل میں ہر آن سامنے آ جاتا ہے ۔ قرآن کا کہنا یہ ہے کہ اسی قسم کے غیر متبدل قوانین ۔ جنہیں عام طور پر مستقل اقدار (Permanent Values) کہا جاتا ہے ۔ انسانی زندگی کے لئے بھی مقرر ہیں ۔ اگر انسانی معاشرہ ان قوانین کے مطابق چلے تو اس کا نتیجہ خارجی کائنات کی طرح ہمیشہ تعمیری اور ارتقائی ہوگا ۔ اگر وہ اس کے خلاف چلے تو تخریب اور فساد کے جہنم میں جا گرے گا ۔ چونکہ انسانی معاشرے کے متعلق قوانین ، مجرد اور غیر محسوس شکل (Abstract Form) میں ہیں ، اور خارجی کائنات کا نظم و نسق انسان محسوس طور پر اپنے سامنے دیکھ سکتا ہے ، اس لئے قرآن انسانی زندگی سے متعلق مجرد قوانین کو کائنات کے محسوس شواہد کی مثالوں سے سمجھاتا ہے ۔ یہی طریق اللہ تعالیٰ نے خود قرآن کے تعارف کے لئے اختیار کیا ہے ۔ مثلاً سورۂ واقعہ میں ہے ، فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ ۔ ان سے کہو کہ نہیں ! بات یہ نہیں کہ میں ان حقائق کو یونہی نظری طور پر بیان کرکے آگے بڑھ جاؤں گا ۔ میں انہیں کائنات کے محسوس نظام کی مرئی مثالوں سے سمجھاؤں گا ۔ اس ضمن میں ، میں سب سے پہلے ستاروں کی گذر گاہوں کو بطور شہادت پیش کرتا ہوں ۔ وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ ۔ اور اگر تم علم و بصیرت کی بارگاہ سے دریافت کرو تو تمہیں معلوم ہو جائے کہ یہ شہادت کتنی عظیم شہادت ہے ۔

میں ستاروں کی گذر گاہوں — ان کے طلوع و غروب کے مواقع — کو اس حقیقت

کبریٰ کے اثبات کے لئے بطور شہادت پیش کرتا ہوں کہ :

اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ($\frac{٥٦}{٧٥-٧٧}$)

یہ قرآن بڑے شرف و مجد کا حامل اور نوع انسانی کے لئے بے حد نفع رساں اور عزت بخش ہے ۔ خود واجب التکریم اور جو اسے راہ نما بنا لے اسے واجب التکریم بنا دینے کا ضامن اور کفیل ۔

سورۂ تکویر میں اسی اجمال کو ذرا تفصیل سے بیان کیا گیا ہے جہاں فرمایا کہ فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ الْجَوَارِ الْكُنَّسِ ۔ نہیں ! میں شہادت میں پیش کرتا ہوں ان سیاروں کو جو پچھلے پاؤں لوٹ جاتے ہیں اور انہیں جو ایک برق یا غزالہ کی طرح تیزی سے آگے بڑھ کر چھپ جاتے ہیں ۔ وَالَّيْلِ اِذَا عَسْعَسَ وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ ۔ اور شہادت میں پیش کرتا ہوں رات کو جب وہ آہستہ سے دبے پاؤں آتی ہے اور اسی طرح خاموشی سے دبے پاؤں لوٹ جاتی ہے ۔ اور صبح کو جب وہ اپنی مسیحا نفسی سے ، ساری دنیا کو حیات نو کا پیام دینے کے لئے مشرق کے جھروکے سے نمودار ہوتی ہے ۔

میں شہادت میں پیش کرتا ہوں ان تمام کائناتی شواہد کو اس حقیقت کبریٰ کی تبئین کے لئے کہ :

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ($\frac{٨١}{١٩}$)

جس شخص کی زبان سے تم اس قرآن کو سن رہے ہو وہ ہمارا بھیجا ہوا قاصد ہے اور نہایت معزز اور واجب التکریم قاصد ۔ یعنی یہ پیغام (قرآن) بھی

اَلْکَرِیْمٌ (٥٦/٧٧) اور اس کا لانے والا بھی اَلْکَرِیْمٌ (٨١/١٩) اور جس (خدا) نے اسے بھیجا ہے وہ بھی اَلْکَرِیْمٌ (٢٣/١١٦) ۔ سورۂ الطارق میں ہے وَ السَّمَاءِ ذَاتِ الرَّجْعِ ۔ یہ فضائی کرے جو اس قدر عظیم الجثہ ہونے کے باوجود اس حسن و خوبی سے اپنے اپنے افلاک میں تیرتے پھرتے ہیں (٣٦/٤٠) ۔ اور اپنی گردش سے زندگی کے نئے نئے پہلو سامنے لاتے ہیں وہ اس حقیقت پر شاہد ہیں ۔

اور یہ زمین ، جو بیج کو پھاڑ کر اس میں سے کونپل کی شکل میں ایک نئی زندگی کی نمود کرتی ہے (وَ الْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ) ۔ یہ بھی اس حقیقت پر گواہ ہے کہ :

اِنَّہٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ

قرآن ایک فیصلہ کن حقیقت ہے ۔ اس میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ (Decisive) ہے ۔ وَ مَا ھُوَ بِالْھَزْلِ (٨٦/١١-١٤) ۔ یونہی مذاق نہیں ۔ تم سمجھتے ہو کہ یہ محض شاعری ہے جسے زمانے کی گردشیں خود بخود مٹا دیں گی ۔ (اَمْ یَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِہٖ رَیْبَ الْمَنُوْنِ (٥٢/٣٠) ۔ یہ غلط ہے فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ وَ مَا لَا تُبْصِرُوْنَ ۔ وہ تمام حقائق جو تمہاری آنکھوں کے سامنے آ چکے ہیں ۔ جن کا احاطہ تمہاری بصیرت کر سکتی ہے اور وہ حقائق جو تمہاری نگاہوں سے مستور ہیں ، وہ سب اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ :

اِنَّہٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ کَرِیْمٍ ۔ وَّ مَا ھُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ (٦٩/٣٩-٤٠)

یہ (قرآن) ایک واجب التکریم پیمبر کی وساطت سے پہنچنے والے ابدی حقائق کا مجموعہ ہے، محض شاعرانہ تخیلات کا نگاہ فریب مرقع نہیں۔ وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ (٦٩/٤٢)۔ نہ ہی یہ کسی اٹکل پچو باتیں بنانے والے نجومی کی قیاس آرائیاں ہیں، بلکہ تَنْزِيلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعَالَمِيْنَ (٦٩/٤٣)۔ یہ اُس خدا کی طرف سے نازل کردہ قوانین کا ضابطہ ہے جو تمام کائنات کا نشو و نما دینے والا ہے۔ ہر شے کو آہستہ آہستہ، بتدریج اُس کے نقطۂ آغاز سے، معراج تکمیل تک پہنچانے والا۔ اس قسم کے حقائق نہ کوئی شاعر دے سکتا ہے نہ سر پھرا دیوانہ۔ وَيَقُوْلُوْنَ اَئِنَّا لَتَارِكُوْا آلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُوْنٍ (٣٧/٣٦)۔ بَلْ جَاءَ بِالْحَقِّ (٣٧/٣٧)۔ یہ وہی دے سکتا ہے جو خدا کی طرف سے تعمیری نتائج پیدا کرنے والی مثبت حقیقت لایا ہو۔ وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْبَغِيْ لَهٗ، ہم نے اپنے رسول کو شاعری نہیں سکھائی، نہ ہی شاعری اسے زیب دیتی ہے۔ جو زندگی بخش، حیات آور، پیغام انقلاب کا حامل ہو اسے شاعری سے کیا واسطہ؟ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْآنٌ مُّبِيْنٌ، یہ ان ابدی حقیقتوں کی یاد دہانی ہے جنہیں تم نے فراموش کر رکھا ہے۔ یہ ایک ضابطۂ زندگی ہے جو اپنی بات کو نہایت ابھرے اور نکھرے ہوئے انداز سے تمہارے سامنے پیش کرتا ہے۔ لِيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا وَّيَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكَافِرِيْنَ (٣٦/٦٩-٧٠)۔ تاکہ ہر اُس شخص کو جس میں زندگی کی رمق باقی ہے، غلط روش پر چلنے کے ہلاکت انگیز عواقب سے آگاہ کر دے۔ اور جو لوگ اس کے باوجود اسی (غلط) روش پر چلتے جائیں وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ جو

کچھ اس نے کہا تھا وہ کس طرح حقیقت پر مبنی تھا۔ اس لئے کہ:

إِنَّهُ لَقَوْلٌ فَصْلٌ وَمَا هُوَ بِالْهَزْلِ (۸۶ / ۱۳-۱۴)

یہ فیصلہ کن بات کرتا ہے۔ یونہی مذاق نہیں کرتا۔ چونکہ تم غور و فکر سے کام نہیں لیتے اس لئے اس کی عظمت کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ اس کی عظمت اور اثر انگیزی کا تو یہ عالم ہے کہ لَوْ أَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْآنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَأَيْتَهُ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ (۵۹ / ۲۱)۔ اگر (مثال کے طور پر) ہم اسے قلب کوہ کے اندر رکھ دیتے اور (اسے احساس عطا کر دیتے) تو تُو دیکھتا کہ اس کی خلاف ورزی کے ہلاکت آفریں نتائج کے احساس سے اس کی سختی کس طرح نرم پڑ جاتی۔ اور کس طرح اس کا جگر شق ہو جاتا۔ اس لئے کہ إِنَّهُ لَقَوْلٌ فَصْلٌ وَمَا هُوَ بِالْهَزْلِ۔

”فصل“ کے معنی ہوتے ہیں الگ الگ کر دینا، متمیز کر دینا، حق کو باطل سے جدا کرکے دکھا دینا، غلط کو صحیح سے الگ کرکے بتا دینا۔ اسی کے لئے دوسری جگہ کہا۔ حٰمٓ۔ وَالْكِتَابِ الْمُبِينِ۔ یہ ایک ایسا ضابطۂ قوانین ہے جو خود بھی واضح اور صاف ہے۔ اور جو ہر بات کو نہایت وضاحت اور صراحت سے ابھار کر اور نکھار کر بیان کر دیتا ہے۔ إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةٍ مُّبَارَكَةٍ إِنَّا كُنَّا مُنْذِرِينَ ہم نے اس کا آغاز نزول (رمضان کے مہینے کی ایک) ایسی شب میں کیا جو تمام نوع انسان کے لئے نہایت برکت و سعادت کا موجب بن گئی ہے۔ یہ کتاب ہمارے اس قانون (سنت اللہ) کے مطابق نازل ہوئی جس کی رو سے ہم شروع سے انسان کو اس کی غلط روش کے

تباہ کن نتائج سے آگاہ کرتے چلے آرہے ہیں فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ (۴۴/۴) ۔ اس میں ان تمام امور کو جو حکمت پر مبنی ہیں ، (غلط امور سے) الگ کرکے رکھ دیا گیا ہے ۔

یہاں اسے لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ کہا ہے ۔ دوسری جگہ ہے اِنَّا اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۔ ہم نے اسے لیلۃ القدر میں نازل کیا ۔ اگرچہ (لیل) کے معنی رات کے ہیں ، لیکن اس سے مراد وہ تمام زمانہ بھی ہو سکتا ہے جس میں قرآن نازل ہوتا رہا ۔ اسے (لیل) سے اس لئے تعبیر کیا گیا کہ جس زمانے میں انسانوں کے پاس خدا کی وحی کی روشنی نہ رہے وہ اندھیری رات کی طرح تاریک ہوتا ہے ۔ وحی کی روشنی آتی ہی تاریکیوں کے بعد ہے ۔ اس کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ نوع انسان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آئے (يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (۵/۱۶) ۔ نیز اس سے مراد وہ دور بھی ہو سکتا ہے جس میں قرآن تو کسی قوم کے پاس موجود ہو ، لیکن اس پر عمل نہ ہو رہا ہو (جیسا ہمارا دور ہے) بہر حال ، قرآن کا نزول ، تاریکی کے دور میں ہوا تاکہ آن انسانوں کے لئے ، جو دیکھ بھال کر راستہ چلنا چاہیں ، روشنی مہیا کر دے ۔

دوسرا لفظ قدر ہے جس کے معنی ہیں پیمانہ ۔ یعنی قرآن نے نوع انسان کو حق و باطل کے ماپنے کے صحیح صحیح پیمانے عطا کئے ہیں ۔ اس نے وہ مستقل اقدار (Permanent Values) دی ہیں جن کے مطابق زندگی بسر کرنا مقصود انسانیت ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ مستقل اقدار ہی وہ لنگر ہیں جن کے سہارے انسانی زندگی کی کشتی، حوادث زمانہ کی طوفان انگیزیوں سے محفوظ رہ سکتی ہے یہ

بات بادنیٰ تعمق سمجھ میں آ جائے گی کہ خارجی کائنات کی ہر شے وہ کچھ بن جاتی ہے جس نگاہ سے ہم اسے دیکھیں ۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

اے کہ منزل را نمی دانی ز راہ   قیمتِ ہر شے ز اندازِ نگاہ
نوعِ دیگر بیں جہاں دیگر شود   این زمین و آسماں دیگر شود

اگر ہم آزردہ دل ہیں تو لوگوں کی ہنسی اور خوشی سے ہمیں غصہ آئے گا ۔ (غالباً) فانی نے کہا ہے کہ ؎

عالم کی فضا پوچھو محرومِ تمنّا سے
بیٹھا ہوا دنیا میں اٹھ جائے جو دنیا سے

اس کے برعکس، اگر ہم خوش ہیں تو ساری دنیا جھومتی اور ناچتی دکھائی دے گی ۔ بقول اختر شیرانی ؎

یہ کس کو دیکھ کر، دیکھا ہے میں نے بزمِ ہستی کو
کہ جو شے ہے نگاہوں میں حسیں معلوم ہوتی ہے

مختصراً یوں کہ :

میں اب سمجھا کہ دنیا کچھ نہیں، دنیا مرا دل ہے
بدل جانے سے اس کے، رنگ ہر اک چیز کا بدلا

یا یوں کہ ؎

نہ کلی ہے وجۂ نظر کشی، نہ کنول کے پھول میں تازگی
فقط ایک دل کی شگفتگی سببِ نشاطِ بہار ہے

لیکن اگر ہم دنیا کے معاملات کے فیصلے اسی معیار کے مطابق کرنے لگ جائیں تو مصیبت ہو جائے۔ جس دن ہم خوش ہوں، اس دن مجرم بھی ہماری عدالت سے صاف بری ہو جائیں، اور جس دن ہم بیگم صاحبہ سے لڑ کر آئے ہوں، اس دن بے گناہ بھی پھانسی پا جائیں۔ تمہیں شاید یاد ہو کہ مشہور روسی لیڈر لینن (روس کی تحریک سے پہلے) جرمنی میں گرفتار ہو گیا تھا۔ جج نے فیصلہ یہ کرنا تھا کہ اسے موت کی سزا دی جائے یا ملک بدر کر دیا جائے۔ اس نے اسے ملک بدر کر دیا اور وہ سیدھا روس پہنچ گیا۔ اس پر لارڈ رسل نے لکھا ہے کہ اگر اس دن اس جج کو سوء ہضم (Dyspepsia) کی شکایت ہوتی تو آج دنیا کی تاریخ بالکل مختلف ہوتی۔ لہٰذا یہ اصول غلط ہے کہ فیصلے ایک فرد کی افتاد طبع کے مطابق ہوں۔ معاملات کے فیصلوں کے لئے کوئی مستقل پیمانہ ہونا چاہئے، جو افراد کے مزاج اور طبائع سے قطعاً متأثر نہ ہو۔ ان پیمانوں کو ”مستقل اقدار“ کہتے ہیں جو وحی کی رو سے ملتی ہیں اور جن میں (اور تو اور) خود نبی کے ذاتی خیالات و جذبات کا بھی کوئی دخل نہیں ہوتا (وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى)۔ ان مستقل اقدار کو میزانِ زندگی بنانے والوں کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ ؎

وہ تری گلی کی قیامتیں کہ لحد کے مردے اکھڑ گئے
یہ مری جبینِ نیاز ہے کہ جہاں دھری تھی، دھری رہی

ان پر خارجی حوادث کی تلاطم خیزیوں اور طوفان انگیزیوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔

یہ ہے وہ لیلۃ القدر (مستقل اقدار والی ”رات“) جس میں قرآن نازل ہوا۔ وَمَا اَدْرَاكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ۔ لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ

شہرٍ۔ اس حقیقت کو خدا کے سوا اور کون بیان کر سکتا ہے کہ وہ رات، جس میں نزول قرآن کا آغاز ہو، اس دور کی ہزار راتوں سے بہتر ہے جس میں انسان وحی کی روشنی سے محروم ہو۔ وہ دور، جو قرآن کی روشنی سے منور ہو، انسانی جہالت اور ظلمت کے ہزار زمانوں سے افضل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نزول قرآن سے انسانی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا ہے۔ بعثت محمدیہ صلعم زمانۂ قبل از قرآن اور بعد از نزول قرآن میں ایک حد فاصل ہے جس سے دونوں دور نمایاں طور پر الگ الگ دکھائی دیتے ہیں۔ نزول قرآن کے بعد کے زمانے کی خصوصیت یہ ہے کہ تَنَزَّلُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِمْ۔ اس میں آہستہ آہستہ، قانون خداوندی کے مطابق، ملائکہ اور الرُّوح کا نزول ہوتا ہے۔

یہ تمہیں معلوم ہی ہے کہ ملائکہ سے مفہوم وہ کائناتی قوتیں ہیں جو خدائی پروگرام کو تکمیل تک پہنچانے میں سرگرم عمل رہتی ہیں۔ تم دیکھو! کہ کائناتی قوتوں کی کارفرمائیاں، جس سرعت اور وضاحت سے، زمانۂ بعد از نزول قرآن میں بے نقاب ہوئی ہیں، زمانۂ قبل از قرآن کے ہزار ہا سال میں اس کا عشر عشیر بھی انسانوں کے سامنے نہیں آ سکا تھا۔

باقی رہا الرُّوح، سو اس سے مراد خود وحی کی قوت ہے۔ اس ضمن میں بھی غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ جس تیزی سے (زمانۂ بعد از نزول قرآن میں) اقوام عالم، غیر شعوری طور پر (یعنی عقل کے تجرباتی طریق سے) وحیٔ خداوندی (قرآن) کے قریب آتی جا رہی ہیں، اس سے پہلے دور میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ تم دیکھو کہ زمانۂ قبل از قرآن میں (مثلاً) ملوکیت، شخصیت پرستی، نسل پرستی، اسلاف پرستی، قومیت پرستی، ذات پات کی تمیز، پیشوائیت، سرمایہ داری جیسے عناصر، انسانی زندگی کے

مسلّمات میں شمار ہوتے تھے۔ لیکن (زمانہ نزول قرآن کے بعد دیکھو کہ) اقوام عالم کس طرح ان ”مسلمات“ کو آہستہ آہستہ چھوڑ چکی ہیں یا چھوڑتی چلی جا رہی ہیں۔

اس کے بعد قرآن یہ بتاتا ہے کہ کائناتی قوتوں کے عمل اور طریق کار کے بے نقاب ہونے اور وحیٔ خداوندی کے مطابق نظام زندگی کی تشکیل کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ اس کا نتیجہ ہوتا ہے مِنْ كُلِّ اَمْرٍ سَلَامٌ۔ سَلَامٌ ایک جامع لفظ ہے جس کے معنی امن و سلامتی بھی ہیں اور تکمیل ذات بھی۔ ضبط خویش بھی ہیں اور احترام آئین و قوانین بھی۔ قرآن کہتا ہے کہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کائنات کے ہر گوشے، اور زندگی کے ہر شعبے میں، سلام کی کیفیت پیدا ہو جائے گی۔ هِیَ حَتّٰی مَطْلَعِ الْفَجْرِ (۹۷/۱-۵)۔ تا آنکہ رات کی تاریکیاں چھٹ کر ساری فضا صبح کی روشنی سے معمور ہوجائے۔ یہ نورانیت سب سے پہلے عہد محمد رسول اللہ ص وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ میں وجۂ تابانیٔ عالم ہوئی تھی، جس سے زندگی کے تاریک گوشے بھی چمک اٹھے تھے۔ وہ انقلاب نبی اکرم ص کی بے مثال قوت عمل اور بے نظیر سیرت و کردار سے ہنگامی طور پر (By Revolution) ظہور میں آ گیا تھا۔ لیکن اس کے بعد، یہ انقلاب (بار دیگر) آہستہ آہستہ ارتقائی طور پر (By Evolution) رونما ہوگا، جب انسان، اپنے غلط تجارب کے تباہ کن نتائج سے متاثر ہو کر، وحی کے بتائے ہوئے راستے پر آئے گا۔ قرآن کا کہنا ہے کہ ایسا ہوکر رہے گا۔ اس دور میں ؎

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائیگی

اس قدر ہوگی ترنّم آفریں بادِ بہار
نکہت خوابیدہ غنچے کی نوا ہو جائیگی
شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ جہاں معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

وَأَشْرَقَتِ الْأَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا (۳۹/۶۹) ۔ اس وقت زمین اپنے پروردگار کے نور سے جگمگا اٹھے گی ۔

——:o:——

یہاں قرآن نے مِنْ كُلِّ أَمْرٍ سَلَامٌ کہا ہے ۔ سورۂ مائدہ میں ہے قَدْ جَاءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُورٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۔ تمہاری طرف اللہ کی جانب سے ایک روشنی آ گئی ہے ۔ یعنی واضح کتاب ۔ روشنی ، خود روشن ہوتی ہے ۔ یعنی اسے تلاش کرنے اور دیکھنے کے لئے کسی دوسری روشنی کی ضرورت نہیں ہوتی ۔ اگر کسی کمرے میں جلتا ہوا چراغ رکھا ہو تو آپ یہ دیکھنے کے لئے ، کہ وہ چراغ کہاں رکھا ہے اور کیسا ہے ، لالٹین لے کر نہیں جاتے ۔ وہ چراغ اپنی روشنی سے اپنے متعلق سب کچھ بتا دیتا ہے ۔ اس کے لئے صرف دیکھنے والی آنکھ کی ضرورت ہوتی ہے ۔ اسی طرح قرآن کو سمجھنے کے لئے کسی خارجی ذریعے کی ضرورت نہیں ، صرف عقل و فکر انسانی کی ضرورت ہے ۔ وہ کتاب مبین (واضح کتاب) ہے ۔ يَهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ ۔ اس کے ذریعے اللہ ، ہر اس قوم کو جو اس کے قوانین کا اتباع کرے ، سلامتی (سلام) کے راستوں کی طرف راہ نمائی کرتا ہے ۔ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ ۔ اور اپنے قانون کی رو سے انہیں

تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آتا ہے۔ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ($\frac{۵}{۱۵-۱۶}$)۔ اور زندگی کے توازن بدوش راستے کی طرف ان کی راہ نمائی کر دیتا ہے۔ یہاں صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ کہا ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں ہے اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ ($\frac{۱۷}{۹}$)۔ یقیناً یہ قرآن (کاروانِ انسانیت کی) اس راہ کی طرف راہ نمائی کرتا ہے جو اَقْوَمُ ہے۔ قَامَ (وہ کھڑا ہوا) قیام، قیامت، تقویم (ساخت، ہیئت کذائی) قوام وغیرہ الفاظ کی بنیاد میں توازن کا مفہوم مضمر ہوتا ہے۔ کھڑا وہی رہ سکتا ہے جس کا توازن درست ہو۔ قوام میں بھی اعتدال کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ اَقْوَمُ کے معنی ہیں جس میں سب سے زیادہ تقویمی کیفیت ہو، جو توازن و تناسب کے اعتبار سے سب سے بہتر ہو، جو بہترین اعتدال کی حامل ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ کائنات کا سارا سلسلہ توازن (Proportion) اور تناسب (Ratio) پر چل رہا ہے۔ اگر کسی شے کے اجزاء کے توازن و تناسب میں ذرا سا بھی فرق آ جائے تو اس میں فساد ہی فساد رو نما ہو جاتا ہے۔ یہی تناسب و توازن انسانی معاشرے کا بھی اصل الاصول ہے۔ نیز، جس کی (Ratio) درست ہو، وہی معقول (Rational) ہے۔ لہٰذا قرآن اس راستے کی طرف راہ نمائی کرتا ہے جو خود قائم ہے اور دوسروں کے قیام کا ذریعہ۔ جس کا توازن و تناسب بہترین ہے اور اس لئے وہ سر تا سر (Rational) ہے۔ اسی لئے اس کی اپیل بھی انسانی عقل و فکر سے ہے۔ اسی سے انسان کو حقیقی زندگی ملتی ہے اور ایسی مشعل ہدایت، جسے ہاتھ میں لے کر وہ ساری دنیا میں سیدھے راستوں پر جا سکتا ہے۔ سورۂ انعام میں ہے اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ۔ ذرا سوچو کہ ایک وہ شخص ہے جسے ہم نے موت کے بعد حیاتِ نَو عطا کی۔ وَجَعَلْنَا

لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ۔ اور ایسی قندیل ہدایت دی جس کی روشنی میں وہ دنیا کے تاریک ترین گوشوں میں نہایت امن و اطمینان سے چل پھر سکتا ہے۔ دوسرا شخص وہ ہے کَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا (٦/١٢٣)۔ جس کے متعلق یوں سمجھو کہ وہ ایسی تاریکی میں ہے جس سے وہ نکل ہی نہیں سکتا۔ کیا یہ دونوں شخص برابر ہو سکتے ہیں ؟

یہ ہے وہ قرآن ، جس کے متعلق سورۂ یونس میں ہے کہ يَا اَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ۔ اے نوع انسانی! تمہاری طرف تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک ایسا ضابطۂ ہدایت آگیا جو ، غلط روش زندگی کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کر کے ، تمہیں اس سے روکتا ہے (”وعظ“ کے یہی معنی ہیں) اور ان تمام بیماریوں کا علاج ہے جن سے انسان کی سیرت میں ضعف اور کردار میں پستی آجاتی ہے۔ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ۔ اور جو لوگ اس کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں انہیں سیدھی راہ کی طرف راہ نمائی کرتا اور سامان نشو و نما بہم پہنچاتا ہے۔ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ۔ اے رسول ! ان سے کہ دو کہ اس قسم کا ضابطۂ حیات محض خدا کے فضل و کرم سے تمہیں مل گیا۔ ورنہ انسان کے بس کی بات ہی نہ تھی کہ اپنے کسب و ہنر اور عقل و خرد سے وہ ان حقائق کو معلوم کر لیتا۔ اس کے بعد ہے :

فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا

بس تمہیں چاہئے کہ اس گراں قدر نعمت اور بیش بہا عطیہ کے ملنے پر

خوشیاں مناؤ۔ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ (۱۰/۵۷-۵۹)۔ حقیقت یہ ہے کہ، یہ نعمت، دنیا بھر کی نعمتوں کے مقابل میں جنہیں انسان جمع کرتا رہتا ہے، گراں قدر ہے۔ یہ اس تمام علمی سرمایہ سے بہتر ہے جسے نوع انسان آج تک جمع کر سکی ہے اور جو وراثتاً اس تک منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے۔ اس کی مثل و نظیر دنیائے فکر و عمل میں کہیں نہیں مل سکتی۔

لہٰذا تم اس قرآن کے ملنے پر خوشیاں مناؤ۔ اس سے واضح ہے سلیم! کہ رمضان اور اس کی عید درحقیقت نزول قرآن کا جشن ہے۔ یہ وہ تقریب ہے جو تمام نوع انسان کے لئے یکساں اور مشترک طور پر جشن مسرت ہے۔ اس لئے کہ یہ نعمت کسی خاص قوم یا خاص ملک کی ملکیت نہیں۔ یہ تمام نوع انسان کے لئے حیات با شرف کا موجب اور امن و عافیت کا ضامن ہے۔ اصل یہ ہے کہ اقوام عالم نے ابھی سمجھا ہی نہیں کہ قرآن کیا ہے؟ جس دن ان کی سمجھ میں یہ بات آ گئی ان کے نزدیک، نزول قرآن کی تقریب سے بڑھ کر، اور کوئی تقریب جشن و مسرت کا موجب نہیں سمجھی جائے گی۔ اس وقت ساری دنیا میں یہی ایک تقریب مشترک قرار پا جائے گی۔ نزول قرآن کی تقریب اور عید میلادالنبی ص کی تقریب، جو درحقیقت ایک ہی حقیقت کے دو گوشے ہیں۔

———:o:———

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کے مطابق زندگی بسر کرنے سے، عملی نقطۂ نگاہ سے، انسان کو ملتا کیا ہے؟ مختصر الفاظ میں اس کا جواب یہ ہے کہ انسان کو وہ سب کچھ مل جاتا ہے جو اس کی موجودہ زندگی کو خوشگوار بنانے کے لئے ضروری ہے اور جس سے اس کے مرنے کے بعد کی زندگی

انسانیت کی ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل بن جاتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ انسان کی موجودہ زندگی کو خوشگوار بنانے کا پہلا قدم یہ ہے کہ اس کی بنیادی ضروریات زندگی (Basic Necessities of Life) پوری ہوں۔ یہ زندگی کا کم از کم اور لاینفک مطالبہ ہے۔ جس فرد یا قوم کی طبیعی ضروریات زندگی پوری نہ ہوں وہ دیگر مسائل حیات کے متعلق کچھ سوچ ہی نہیں سکتی۔ دیکھو! قرآن اس باب میں کیا کہتا ہے۔

سورۂ طٰہٰ کی ابتداءً اس سے ہوتی ہے۔

مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓی (۲۰/۲)۔

ہم نے تجھ پر قرآن اس لئے نازل نہیں کیا کہ تو "شقاوت" کی زندگی بسر کرے۔ شقاء کے معنی ہیں محرومی، بدنصیبی۔ یعنی قرآن اس لئے نازل کیا گیا ہے کہ تم محرومی اور بدنصیبی کی زندگی بسر نہ کرو۔ تمہیں جگر پاش مشقتیں نہ اٹھانی پڑیں۔

یہ ہے نزول قرآن کا اصلی مقصد۔ اب اس اصول کی عملی تشریح دیکھو! اسے قرآن نے (اسی سورہ میں) قصۂ آدم کے تمثیلی انداز میں بیان کیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ آدم ایک جنتی زندگی میں تھا۔ ہم نے اس سے کہا کہ دیکھنا! تم کہیں شیطان کے فریب میں نہ آ جانا*۔ اگر تم اس کے فریب میں آ گئے تو یہ تمہیں جنت سے نکلوا دے گا اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا فَتَشْقٰی (۲۰/۱۱۷)۔ تم محروم اور بدنصیب رہ جاؤ گے۔ کن چیزوں سے محروم رہ جاؤ گے؟ ان چیزوں سے جو تمہیں اس وقت نہایت فراوانی سے حاصل ہیں۔ وہ چیزیں کیا ہیں؟ سنو! اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰی۔ اس

---

*آدم، ابلیس، آدم کی جنتی زندگی وغیرہ کے مفہوم کے لئے میری کتاب "ابلیس و آدم" دیکھئے۔

جنت میں تجھے اس بات کی ضمانت حاصل ہے کہ تو نہ بھوکا رہے گا نہ ننگا۔ وَاَنَّکَ لَا تَظْمَؤُا فِیْهَا وَلَا تَضْحٰی (۲۰/۱۱۸)۔ تجھے نہ یہاں پیاس کا خوف ہے، نہ موسم کی گرمی سے بچنے کی فکر۔ اس میں تمہارے کھانے پینے کے لئے رزق، پہننے کے لئے کپڑا، رہنے کے لئے مکان۔ غرضیکہ تمام بیادی ضروریات زندگی اس طرح حاصل ھیں کہ ان کے لئے تمہیں مشقتیں نہیں ٹھانی پڑتیں۔ اگر تم نے اس روش زندگی کو چھوڑ دیا تو ان تمام چیزود سے محروم رہ جاؤ گے۔

اس کے بعد ہے کہ آدم شیطان کے فریب میں آ گیا اور ن چیزوں سے محروم ھو گیا۔ جب اسے اپنی غلطی کا احساس ھوا تو اس نےخدا سے عرض کیا کہ کیا یہ محرومی ابدی ہے یا اس سے بچ نکلنے کی بھی کوئ صورت ہے؟ جواب ملا کہ مایوس ھونے کی کوئی بات نہیں۔ اس محرومی سے نجات مل سکتی ہے۔ اس کی شکل یہ ہے کہ فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ هُدًی فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَایَ فَلَا یَضِلُّ وَلَا یَشْقٰی (۲۰/۱۲۳)۔ تمہارے پاس میری طرف سے راہ نمائی آئے گی۔ سو تم میں سے جو بھی اس راہ نمائی کے پیچھے پیچھے چلے گا تو نہ اس کی کوششیں رائگاں جائیں گی اور نہ ھی وہ محروم رہے گا۔ (لَا یَشْقٰی)۔

اس کے برعکس وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِکْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِیْشَةً ضَنْکًا۔ جو ھمارے قانون سے اعراض برتے گا تو اس کی معیشت تنگ ھو جائیگی۔ (اتنا ھی نہیں بلکہ) وَنَحْشُرُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَعْمٰی (۲۰/۱۱۴)۔ اور اسے ھم قیامت کے دن اندھا اٹھائیں گے۔

یعنی سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ، جو قوم قرآن کے قوانین کی اتباع

کرے گی، وہ بنیادی ضروریات زندگی سے کبھی محروم نہیں رہے گی اور جو اس سے اعراض برتے گی اس کی معیشت تنگ ہو جائے گی۔ اس لئے کہ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى (۲۰/۲) ۔ قرآن اس لئے نازل نہیں کیا گیا کہ اس کا اتباع کرنے والے بنیادی ضروریات زندگی سے محروم رہ جائیں ۔

لیکن اس میں صرف طبیعی ضروریات زندگی کے بافراط مہیا ہو جانے کے متعلق ہی ہدایات نہیں ، یہ ایک مکمل ضابطۂ ہدایت ہے جس میں انسانی زندگی کے ہرگوشے اور نظام حیات کے ہر شعبے کے متعلق راہ نمائی موجود ہے ۔ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۔ (اس میں) تیرے پروردگار کا قانون ، صدق و عدل کے ساتھ مکمل ہو گیا اور اس طرح مکمل ہو گیا کہ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۔ اس میں کوئی شخص کسی قسم کا رد و بدل نہیں کر سکتا ۔ اس لئے کہ ، یہ (معاذ اللہ) کسی ”اندھی گونگی فطرت“ کا مدوّن کردہ ضابطۂ زندگی نہیں ۔ یہ اس خدا کا عطا کردہ قانون حیات ہے جو سب کچھ سنتا اور جانتا ہے ۔ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (٦/٦١١) ۔

اس کے مکمل ہونے کی کیفیت یہ ہے کہ خدا کی طرف سے جس قدر قوانین زندگی مختلف زمانوں میں نازل ہوتے رہے وہ سب کے سب اس کے اندر آ چکے ہیں ۔ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ (۵/۴۸) ۔ یہ ان تمام صداقتوں کو سچ کر کے دکھانے والا اور ان کا محافظ و نگہبان ہے ۔ فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ (۹۸/۳) ۔ اس میں تمام محکم اور متوازن قوانین جمع ہو گئے ہیں ۔

پھر ، جس خدا نے اسے مکمل کیا ہے ، اس نے اس کی حفاظت کا

بھی ذمہ لیا ہے ۔

> اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ (۱۵/۹) ۔
> یقیناً ہم نے اس قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں ۔

اس طرح محافظ کہ لَا یَاْتِیْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ (۴۱/۴۲) ۔ باطل نہ اس کے آگے سے آسکتا ہے نہ پیچھے سے ۔ جس راہ نمائی کو تمام نوع انسان کے لئے ، ہمیشہ کے لئے ، ضابطۂ حیات بننا ہو ، اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ محفوظ رہے ۔ محفوظ رہے انسانی خیالات و تصورات کی اثر اندازی سے ۔ اور اُس کی یہی صورت ہے کہ اس کے الفاظ میں نہ کسی قسم کا تغیر و تبدل ہو ، نہ کوئی حک و اضافہ ۔ قرآن کا ایک ایک لفظ وہی ہے جو نبی اکرمؐ نے خدا سے پا کر اُمت کو دیا تھا ۔ اس میں نہ ایک لفظ زائد ہے نہ منسوخ ۔ نہ بدلا ہوا ہے ، نہ بگڑا ہوا ۔

اس قسم کے ضابطۂ حیات کی بنیادی خصوصیت یہ بھی ہونی چاہئے کہ اس میں نہ کوئی اختلاف ہو نہ تضاد ۔ قرآن نے اپنے منجانب اللہ ہونے کی دلیل ہی یہ بیان کی ہے کہ اس میں کہیں اختلاف نہیں ۔ اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ کیا یہ لوگ قرآن میں غور و تدبر نہیں کرتے ؟ اگر یہ لوگ غور و فکر سے کام لیں تو یہ حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آجائے کہ وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِیْهِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا (۴/۸۲) ۔ اگر یہ خدا کے علاوہ کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اُس میں بہت سے اختلافات ملتے ۔ یعنی ، اس میں کسی اختلاف کا نہ ہونا ، اس امر کی دلیل ہے کہ یہ خدا کی کتاب ہے ۔

تم نے سلیم! اکثر لوگوں کو یہ کہتے سنا ہوگا کہ، مسلمانوں میں جس قدر فرقے ہیں ان میں سے ہر ایک فرقہ اپنے اپنے مسلک و مشرب کی تائید قرآن سے لاتا ہے۔ اگر صورت حال فی الواقع ایسی ہو۔ یعنی قرآن کریم اس قدر باہمدگر متخالف فرقوں میں سے ہر ایک کی تائید بہم پہنچا دیتا ہو تو لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا (قرآن میں بے شمار اختلافات ہونے) کی، اس سے بڑھ کر اور دلیل کونسی ہو سکتی ہے؟ لہٰذا یہ غلط ہے کہ قرآن سے مختلف فرقوں کے باہمدگر متضاد عقائد و مسالک کی تائید مل سکتی ہے۔ قرآن تو مختلف فرقوں کے وجود کو شرک قرار دیتا ہے ($\frac{۳۰}{۳۱-۳۲}$)۔ اس لئے اس سے ان کی تائید کیسے مل سکتی ہے؟ قرآن، خدا کا دین پیش کرتا ہے جو ایک غیر منقسم وحدت (Indivisible Unit) ہے اور اس میں کسی قسم کا کوئی اختلاف نہیں۔ لیکن یہ حقیقت (جیسا کہ قرآن نے خود کہا ہے) تدبر فی القرآن سے سامنے آ سکتی ہے، اندھی تقلید سے نہیں۔

لیکن تدبر فی القرآن کا طریقہ وہی ہونا چاہئے جسے قرآن نے خود تجویز کیا ہے۔ سورۂ یونس میں ہے بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا يَأْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ ($\frac{۱۰}{۳۹}$)۔ ان لوگوں کو دیکھو یہ قرآن کی تکذیب کرتے ہیں، بغیر اس کے کہ اس کے حقائق کو اپنے علم کے احاطہ میں لیں۔ لہٰذا قرآن کے سمجھنے کا پہلا طریقہ یہ ہے کہ انسانی علم جس سطح تک پہنچ چکا ہو، انسان اس کی روشنی میں قرآنی حقائق کا مطالعہ کرے۔ جس شخص کے سامنے اس کے اپنے زمانے تک کا تمام علم نہ ہو، وہ قرآنی حقائق کو سمجھ ہی نہیں سکتا۔ جو علم و عقل سے کام نہ لے،

قرآن کی بارگاہ سے اس پر پھٹکار پڑتی ہے۔ وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ (۱۰/۱۰۰)۔

دوسرا طریقہ (جو در حقیقت پہلے ہی کا جزو لازم ہے) یہ ہے کہ (فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ) انسان، اقوام گذشتہ کی تاریخ سے دیکھے کہ کس قوم نے کونسا راستہ اختیار کیا اور اس کا انجام کیا ہوا۔ گویا جس انسان کے سامنے اقوام سابقہ سے متعلق تاریخی شواہد، اور اپنے زمانے کے تقاضے نہ ہوں وہ قرآنی حقائق کا ادراک نہیں کر سکتا۔

اور تیسرا طریق، عمل سے متعلق ہے۔ یعنی قرآنی نظام کو عملاً متشکل کر دیا جائے۔ اس کے بعد اس کے نتائج (تَاوِيْلُهٗ) سے اس کے دعاوی کی صداقت خود بخود سمجھ میں آ جائے گی۔ لیکن جو شخص نہ ماضی (تاریخ) اور حال (عصرِ حاضر) سے متعلق علم رکھتا ہو اور نہ ہی قرآنی نظام کو متشکل ہونے دے، نہ اس کا انتظار کرے، وہ قرآن کو سمجھ نہیں سکتا۔

اوپر کہا گیا ہے کہ جس سطح تک انسانی علم پہنچ چکا ہو، وہ انسان کے سامنے ہونا چاہئے۔ اس کے بغیر قرآن سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ اس حقیقت کو قرآن نے دوسری جگہ اس طرح بیان کیا ہے سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ (۴۱/۵۳)۔ ہم ان لوگوں کو عالم انفس و آفاق میں اپنی نشانیاں دکھاتے جائیں گے تاکہ یہ بات نکھر کر ان کے سامنے آ جائے کہ قرآن فی الواقعہ ایک حقیقت ثابتہ ہے۔ یعنی قرآنی حقائق، زمانہ کی لہروں میں، کائنات کے پیچ و خم میں، لپٹے ہوئے ہیں۔ جب انسانی علم و تحقیق کا کوئی گوشہ اتنا بلند ہو جائے کہ کسی لہر کو جا کر چھو لے تو اس میں چھپی ہوئی حقیقت، عروس نو

کی طرح مسکراتی ہوئی، بے نقاب ہو جاتی ہے۔ اس طرح قرآن کے حقائق آہستہ آہستہ مشہود ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اقبال کے الفاظ میں؂

چون مسلمانان اگر داری جگر   در ضمیرِ خویش و در قرآن نگر
صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست   عصر ہا پیچیدہ در آنات اوست
یک جہانش عصرِ حاضر را بس است   گیر اگر در سینہ دل معنی رَس است
بندۂ مومن ز آیاتِ خداست   ہر جہان اندر برِ او چو قباست
چون کہن گردد جہانے در برش
می دہد قرآن جہانے دیگرش

اس سے ظاہر ہے کہ، جو حقائق اس طرح زمانے کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ بارز اور مشہود ہوتے ہوں، ان کے متعلق یہ سمجھنا صحیح نہیں کہ، کسی ایک زمانے میں ان سب کا احاطہ کیا جا سکتا ہے۔ ہم قرآنی حقائق کو اپنے زمانے کے علم کی روشنی میں ہی سمجھ سکتے ہیں۔ ہمارے بعد، جب علم انسانی کی سطح اور اونچی ہو جائے گی تو قرآن کی کئی ایسی حقیقتیں جو ہمارے زمانے میں ہنوز بے نقاب نہیں ہوئیں، منکشف ہو کر سامنے آ جائیں گی۔ یہ سلسلہ جاری رہے گا حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ۔ یہ اس لئے کہ قرآن اس خدا کا کلام ہے جس کی نگاہوں سے کوئی حقیقت پوشیدہ نہیں۔ اَوَلَمْ یَکْفِ بِرَبِّکَ اَنَّهٗ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدٌ (۴۱/۵۳)۔ واضح رہے کہ یہ چیز قرآن کے مجرد حقائق (Abstract Truths) کے متعلق ہے جن کے اسرار و غوامض زمانہ کی سطح کے ساتھ ساتھ کھلتے جاتے ہیں۔ جہاں تک قرآن کے احکام کا تعلق ہے وہ اپنی جگہ متعین ہیں اور محکم۔ البتہ ان کی حکمت اور غایت کے سمجھنے میں زمانے کی علمی ترقی کے ساتھ وسعت پیدا ہوتی جاتی ہے۔

قرآن فہمی کے ضمن میں اس نکتہ کو ہمیشہ سامنے رکھنا چاہئے۔

* * *

اگر کوئی پوچھے کہ وہ سب سے بڑی چیز جو قرآن نے انسان کو دی ہے (اور جو انسان کو کہیں اور نہیں مل سکتی تھی) کیا ہے؟ تو ایک مختصر سے فقرہ میں اس کا جواب یہ ہوگا کہ قرآن نے انسان کو اس کے صحیح مقام سے آگاہ کیا ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ جہاں تک خارجی کائنات کا تعلق ہے، ہر شے اس کے لئے تابع تسخیر کر دی گئی ہے۔ سَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (۳۸/۱۳)۔ آدم کے مسجود ملائکہ ہونے کا یہی مطلب ہے۔ باقی رہے خود انسان۔ تو یہ سب پیدائش کے اعتبار سے یکساں طور پر واجب التکریم ہیں۔ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (۱۷/۷۰)۔ اس لئے کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے انسان کو اپنا محکوم اور تابع فرمان بنا لے (۳/۷۸)۔ اس کے لئے صرف ان قوانین کے اتباع کی ضرورت ہے جو اس کی ذات کی نشو و نما کے لئے خدا کی طرف سے عطا ہوئے ہیں۔ ان قوانین کے علاوہ، یہ اور کسی ضابطہ یا آئین کا پابند نہیں۔ قرآن نے واضح الفاظ میں کہ دیا کہ اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ (۷/۲)۔ تم صرف ان قوانین کا اتباع کرو جو تمہارے نشو و نما دینے والے کی طرف سے تمہاری جانب بھیجے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ اور کسی کارساز و کارفرما کا اتباع نہ کرو۔ غور کرو سلیم! کہ یہ کتنی بڑی آزادی ہے جو انسان کو عطا کی گئی ہے۔ دنیا میں انسان کی

انتہائی آرزو یہ ہے کہ وہ آزاد ہو۔ آزادی کی خاطر وہ اپنی جان تک بھی دے دیتا ہے۔ اس کی ساری تاریخ، حصول آزادی کی کشمکش کی داستان ہے۔ لیکن اس تمام سعی و کاوش، تگ و تاز اور تپش و گداز کے باوجود یہ آج تک متعین نہیں کر سکا کہ آزادی کہتے کسے ہیں۔ اسے یہ چیز قرآن ہی نے بتائی ہے کہ آزادی کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محکوم نہ ہو۔ کوئی فرد کسی دوسرے فرد کا محتاج نہ ہو ؎

کس نبا شد در جہاں محتاجِ کس
نکتۂ شرع مبین این است و بس

قرآن نے بعثت محمدیہ ص کا مقصد ہی یہ بتایا ہے کہ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ (۷/۱۵۷)۔ وہ نوع انسانی کو ان زنجیروں سے آزاد کرا دے گا جن میں وہ جکڑی چلی آ رہی تھی اور وہ بوجھ اس کے سر سے اتار دے گا جس کے نیچے وہ دب رہی تھی۔ قرآن نے ان تمام اطواق و سلاسل کو توڑ کر رکھ دیا جو صدیوں سے انسان کی آزادی کو سلب کئے ہوئے تھے۔ خواہ یہ سلاسل، ملوکیت کے استبداد کی شکل میں تھے، یا پیشوائیت کے تقدس کے رنگ میں۔ خواہ یہ حسب و نسب اور رنگ و نسل کی تفریق کی صورت میں تھے یا اقتصادی طور پر طبقاتی تقسیم کے پیکر میں۔ قرآن نے ان تمام زنجیروں کو توڑ کر، انسان کو اس قابل بنا دیا کہ وہ آزادی کی فضائے بسیط میں کھلا سانس لے سکے اور اس طرح کائنات میں اپنے صحیح مقام سے آگاہ ہو جائے۔

یہ تھا وہ پیغام جو قرآن نے دیا۔ لیکن اس کی حامل اُمت نے جو کچھ (اس کے باوجود) اپنے ساتھ کیا اُس کے تصور سے روح کانپ اُٹھتی ہے۔ اس نے ان زنجیروں کے ایک ایک ٹکڑے کو، جنہیں قرآن نے اس طرح توڑا تھا، تلاش

کرکے اپنی مژگان عقیدت سے اٹھایا اور نہایت تعظیم و احترام سے انہیں پھر سے اپنے گلے میں ڈال لیا۔ اقبال کے الفاظ میں؎

خود طلسمِ قیصر و کسریٰ شکست   خود سرِ تختِ ملوکیت نشست
تا نہالِ سلطنت قوت گرفت   دینِ او نقش از ملوکیت گرفت

چنانچہ آج حالت یہ ہے کہ؎

منزل و مقصودِ قرآں دیگر است   رسم و آئینِ مسلماں دیگر است
در دلِ او آتشِ سوزندہ نیست   مصطفےٰ در سینۂ او زندہ نیست

اس کی یہ حالت کیوں ہوئی؟ اس کے متعلق زبان وحی نے خود بتایا کہ يَا رَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا (۲۵/۳۰)۔ اس قوم نے نہ صرف اپنے آپ کو اپنی خود ساختہ زنجیروں میں جکڑ لیا بلکہ قرآن کو بھی، غیروں سے مستعار نظریات و تصورات کی رسیوں سے اس طرح باندھ دیا کہ وہ آزادانہ ایک قدم چلنے کے قابل نہ رہا۔ جانے والوں نے قرآن کے ساتھ یہ کچھ کیا اور آنے والوں کے نزدیک ان جانے والوں کی یہی روش دین میں سند قرار پا گئی۔ چنانچہ اب حالت یہ ہے کہ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ خدا نے نازل کیا ہے اس کی اتباع کرو تو یہ کہتے ہیں کہ نہیں! ہم تو اس مسلک کی اتباع کریں گے جس پر ہم نے اپنے اسلاف کو چلتے دیکھا ہے۔ اس کے جواب میں قرآن کہتا ہے کہ اَوَلَوْ كَانَ الشَّيْطٰنُ يَدْعُوْهُمْ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ (۳۱/۲۱)۔ خواہ اس طرح شیطان انہیں جہنم کے عذاب کی طرف دعوت کیوں نہ دے رہا ہو،

یہ اسی راستے پر چلیں گے۔ اس کے بعد قرآن کہتا ہے کہ ان سے کہو کہ دین کی راہ اندھی تقلید نہیں۔ اس کی راہ یہ ہے کہ مَنْ يُّسْلِمْ وَجْهَهٗٓ اِلَى اللّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ جو شخص اپنے آپ کو خدا کے قوانین کے سامنے جھکا دے اور اس طرح حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرے فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى (٣١/٢٢)۔ اس نے ایک ایسا سہارا تھام لیا جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔

لیکن اسلاف پرستی کی جذباتی شدت انسان کے دل میں اس حد تک مخاصمت پیدا کر دیتی ہے کہ وہ قرآن کی آواز کو سننا تک گوارا نہیں کرتا۔ یہی نہیں، کہ وہ خود اس کی آواز کو سننا نہیں چاہتا، بلکہ اپنے متبعین کو بھی تاکید کرتا ہے کہ لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ (٤١/٢٦)۔ اس قرآن کی آواز کو قطعاً اپنے کانوں میں نہ پڑنے دو اور نہ ہی اسے کسی اور کو سننے دو۔ جہاں اس کی آواز اٹھے تم کائیں کائیں کرنے لگ جاؤ، خوب شور مچاؤ، نعرے بلند کرو، فتوے لگانا شروع کر دو۔ ہو سکتا ہے کہ تم اس طرح ان لوگوں پر غالب آ جاؤ جو قرآن کی طرف دعوت دیتے ہیں۔

آج ہماری یہ حالت ہو چکی ہے اس قرآن کے متعلق، جس پر ایمان لانے سے ہم مسلمان کہلاتے ہیں، اور اس کا نتیجہ بھی ظاہر ہے! وہی قوم جسے اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ کہا گیا تھا (یعنی دنیا میں سب پر غالب) وہ آج دنیا میں سب سے ذلیل ہے اور در بدر دھکے کھا رہی ہے مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا (١٧/١٨) اور مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا (١٧/٢٩)۔ دھتکاری اور پھٹکاری ہوئی۔ درماندہ اور

واماندہ ۔ جنت سے نکلے ہوئے آدم کی طرح حیران اور پریشان ، مایوس اور محروم ۔

لیکن یہ مایوسی اور محرومی پھر سے شادکامی اور سر فرازی میں بدل سکتی ہے بشرطیکہ ہم پھر اسی قرآن کی طرف آ جائیں جس نے ہمیں ایک بار وہ سر بلندی و کامرانی عطا فرمائی تھی ، جس کی مثال انسانیت کی تاریخ میں کہیں نہیں مل سکتی ۔ اس نے جنت سے نکلے ہوئے آدم سے کہا تھا کہ فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ هُدًی فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ (۲/۳) ۔ جو قوم بھی خدا کی طرف سے ملی ہوئی راہ نمائی کا اتباع کرے گی اسے نہ کسی قسم کا خوف ہوگا، نہ حزن ۔ نہ سرگردانی ہوگی ، نہ پریشانی ۔

یہ ہے عزیزم ! اس قرآن کا اجمالی سا تعارف جس کے متعلق خود خدا نے کہا ہے کہ اس کے ملنے پر جشن مسرت مناؤ کہ یہ دنیا کی ہر نعمت سے گراں بہا اور ہر دولت سے زیادہ بیش قیمت ہے ۔ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِکَ فَلْیَفْرَحُوْا ۔ هُوَ خَیْرٌ مِّمَّا یَجْمَعُوْنَ (۱۰/۵۸) ؎

آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم حکمتِ او لایزال است و قدیم
پختہ تر سودائے خام از زور او درفتد با سنگ جام از زور او
می برد پابند و آزاد آورد صید بنداں را بفریاد آورد
ارج می گیرد ازو نا ارجمند بندہ را از سجدہ سازد سر بلند
نوعِ انساں را پیامِ آخریں
حاملِ او رَحْمَةً لِّلْعَالَمِیْن ؏

رشک صد عید ہے وہ ساعت جس میں دنیا کو ایسا پیام حیات ملا اور در خور ہزار تہنیت ہے وہ امت جسے اس پیام کی وراثت کے لئے منتخب کیا گیا (۳۵/۳۲) ـــہ

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است   ایں کتابے نیست، چیزے دیگر است
چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود   جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود

یہ ہے سلیم! قرآن کا وہ تعارف جسے خود قرآن نازل کرنے والے (خدا) نے کرایا ہے۔

والسلام

پرویز

مئی ۱۹۵۷ء

اٹھائیسواں خط

(اندھے کی لکڑی)

نہیں سلیم ! یہ جو تم نے اندھوں کی قطار دیکھی ہے ، یہ کوئی نئی چیز نہیں ۔ ہم اپنے بچپن سے انہیں اسی طرح دیکھتے چلے آ رہے ہیں ۔ اور اسی طرح ہمارے بڑے بوڑھوں نے انہیں دیکھا ہے ۔ بس فرق اتنا ہے کہ اُس زمانے میں ان کی تعداد کم تھی ، اب زیادہ ہو گئی ہے ۔ نیز اس وقت سب سے آگے چلنے والے کو کچھ کچھ نظر آیا کرتا تھا ، اب وہ بھی بالکل اندھا ہو چکا ہے اور محض قیاس اور مدت کی مشق کے زور پر اپنے جیسے اندھوں کی راہ نمائی کرتا ہے ۔ جب میں نے انہیں دیکھا تھا تو سب سے آگے ایک اور اندھا ہوا کرتا تھا ۔ اس کے مرنے پر ، اُس سے پچھلے اندھے کو ترقی (Promotion) مل گئی اور وہ ان کا راہ نما بن گیا اور لائن کے آخر میں دو چار اندھوں کا اور اضافہ ہو گیا ۔ اگلے کی لکڑی پچھلے کے لئے ” دلیل راہ “ یا ” مشعل ھدایت “ بن گئی ۔ جس طرف اگلا مڑا ، پچھلے بھی مڑ گئے ۔ جہاں وہ ٹھہرا ، یہ بھی ٹھہر گئے ۔ جس قسم کی آواز اس نے نکالی ، اُنہوں نے بھی اس کی نقل اتار دی ۔ یہ ٹھیک ایک وقت پر بھیک مانگنے نکلتے ہیں اور دن بھر متعین راستوں پر چلتے ، شام کو واپس چلے جاتے ہیں ۔ یہی ان کی مقررہ روش ہے جس پر یہ

عمر بھر چلتے رہتے ہیں، اور چلتے چلتے بالآخر قبر تک پہنچ جاتے ہیں۔ اور چونکہ ساتھ کے ساتھ لائن میں اضافہ ہوتا رہتا ہے، اس لئے ان کا یہ سلسلۂ دراز کبھی ختم نہیں ہوتا۔

پہلے دن سے ایسا ہی ہوتا چلا آ رہا ہے اور آج بھی وہی کچھ ہو رہا ہے۔ اندھے بدلتے جاتے ہیں لیکن ان کی لائن بدستور قائم رہتی ہے۔ نہ ان کی روش میں فرق آتا ہے، نہ راستوں میں تبدیلی۔ نہ ان کی آواز بدلتی ہے، نہ رفتار۔ جب کسی پچھلے سے پوچھئے کہ تم اس راستے پر کیوں جا رہے ہو، تو وہ اطمینان سے کہہ دیتا ہے کہ، اس لئے کہ مجھ سے آگے چلنے والا اسی راستے پر جا رہا ہے، اور جب سب سے آگے چلنے والے سے پوچھئے تو وہ کہہ دیتا ہے کہ میں نے جس کی جگہ لی ہے وہ اسی راستے پر چلا کرتا تھا۔ اور چونکہ وہ پیشرو مر چکا ہوتا ہے، اس لئے آپ کسی سے پوچھ ہی نہیں سکتے کہ وہ اس راستے پر کیوں چلا کرتا تھا۔

غور کرو پر تمہیں نظر آ جائے گا سلیم! کہ اندھوں کی ایک قطار ہے جو شاہراہ انسانیت پر، روز ازل سے آج تک مسلسل و متواتر چلی آ رہی ہے۔ جب کوئی آنکھوں والا ان سے کہتا ہے کہ تم جس راستے پر جا رہے ہو وہ غلط ہے تو وہ یہ کہہ کر آگے بڑھ جاتے ہیں کہ ہم نے اپنے بڑوں کو اسی راستے پر چلتے دیکھا ہے اس لئے ہم اسی راستے پر چلتے جائیں گے۔ ان آنکھوں والوں میں سب سے پہلے ہمارے سامنے حضرت نوحؑ آتے ہیں۔ انہوں نے ان اندھوں سے کہا کہ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ (۲۳/۲۳)۔ تم صرف قوانین خداوندی کی اطاعت اور محکومی اختیار کرو۔ اس کے سوا کوئی صاحب اقتدار ہستی ایسی نہیں جس کی تم اطاعت کرو۔

بات کس قدر صاف اور واضح تھی لیکن انہوں نے نہ تو اسے قبول کیا اور نہ ھی اس کی تردید میں کوئی دلیل پیش کی۔ کہا تو صرف اتنا کہ مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِیْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِیْنَ (۲۳/۲۴)۔ ہم نے اپنے آباء و اجداد میں سے کسی سے یہ بات نہیں سنی۔ اس لئے ہم اسے سننے کے لئے تیار نہیں۔ یعنی یہ نہیں کہ جو بات تم کہتے ہو اس میں ہمارے نزدیک یہ غلطی اور یہ سقم ہے بلکہ یہ کہ، جس راستے کی طرف تم بلاتے ہو، چونکہ ہم سے پہلے اندھے اس راستے پر نہیں چلا کرتے تھے، اس لئے ہم بھی اسے اختیار نہیں کر سکتے۔ ہم اسی روش پر چلتے جائیں گے جس روش پر وہ چلا کرتے تھے۔

حضرت نوحؑ کے بعد ہم حضرت صالحؑ کو دیکھتے ہیں کہ وہ بھی اپنی قوم سے یہی کہتے ہیں کہ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ (۱۱/۶۱)۔ اس کے جواب میں بھی وہ یہی کہتے ہیں کہ اَتَنْهٰنَآ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا (۱۱/۶۲)۔ جن معبودوں کی پرستش ہمارے آباء و اجداد کیا کرتے تھے، تو ہمیں ان کی پرستش سے روکتا ہے؟ یعنی وہی آباء جنھوں نے حضرت نوحؑ اور حضرت ہودؑ کے زمانے میں صحیح روش اختیار کرنے سے انکار کر دیا تھا، اب ان کے لئے دلیل اور سند بن گئے! اس کا مطلب یہ ہے کہ جو اندھا پہلے مر جائے، وہ بعد میں آنے والوں کے لئے آنکھوں والا بن جاتا ہے۔

اس کے بعد ہمارے سامنے حضرت ابراہیمؑ آتے ہیں۔ وہ اپنے باپ اور قوم سے کہتے ہیں کہ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ (۲۱/۵۲)۔ ان مورتیوں کی حیثیت کیا ہے جن سے تم یوں چمٹے بیٹھے ہو؟ تم

انہیں اپنے ھاتوں سے تراشتے ھو اور پھر ان کے حضور سجدہ ریز ھو جاتے ھو؟ سوچو که اس روش میں عقل اور انسانیت کی کوئی رمق تک بھی ھے ؟ اس کے جواب میں ان اندھوں نے وھی کچھ کہا که جو ان سے پہلے اندھے کہتے تھے قَالُوْا وَجَدْنَا اٰبَآءَنَا لَهَا عَابِدِیْنَ (۲۱/۵۳) ۔ انہوں نے کہا که ہم نے اپنے آباء و اجداد کو انہی کی پرستش کرتے دیکھا ھے ۔ اس لئے ہم بھی ان کی پرستش کرتے ھیں ۔ ہم اپنے اسلاف کے راستے کو چھوڑ کر کوئی اور راسته اختیار کرنے کے لئے تیار نہیں ۔ اس جواب پر حضرت ابراھیمؑ کو غصه تو بہت آیا (اور ھر سمجھ دار کو غصه آئے گا) لیکن ان عقل کے اندھوں سے اس سے زیادہ اور کیا کہا جا سکتا تھا که لَقَدْ كُنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ (۲۱/۵۴) ۔ تم اور تمہارے اسلاف کس قدر کھلی ھوئی گمراھی میں تھے ! لیکن ”کھلی ھوئی گمراھی“ تو اسے ھی نظر آ سکتی ھے جو اپنی آنکھوں سے کام لے ۔ جو آنکھیں بند کئے اگلے اندھے کی لکڑی کے سہارے چلا جا رھا ھو ، اسے غلط اور صحیح راستے میں تمیز کس طرح ھو سکتی ھے ؟

اور وہ دیکھو سلیم ! قوم مدین سے حضرت شعیبؑ کیا که رہے ھیں ؟ وہ بھی یہی که رہے ھیں که یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ (۱۱/۴۸) ۔ اطاعت اور محکومی صرف ایک خدا کے قانون کی ھو سکتی ھے ۔ اس کے سوا کائنات میں کوئی اور صاحب اقتدار و اختیار نہیں ۔ اس کے جواب میں ان کی قوم کیا کہتی ھے ؟ وھی جو ان سے پہلے کے اندھے کہتے تھے ۔ قَالُوْا یٰشُعَیْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا (۱۱/۸۷) ۔ اے شعیب ! کیا تمہاری صلوٰۃ تمہیں اس کا حکم دیتی ھے که ہم ان کی پرستش چھوڑ دیں جن کی پرستش

ھمارے آباء و اجداد کرتے تھے ۔

وھی اندھے کی لکڑی !

دعوت حق و صداقت کے جواب میں بھی کچھ حضرت موسیٰؑ کے مخالفین نے کہا ۔ ان کا جواب یہ تھا کہ اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا (۱۰/۷۸) ۔ کیا تو ھمارے پاس اس لئے آیا ہے کہ ھمیں اس راہ سے پھیر دے جس راہ پر ھم نے اپنے آباء و اجداد کو پایا ہے ؟

تم نے دیکھا سلیم ! کہ شروع سے آخر تک کس طرح ان اندھوں کی طرف سے ایک ھی جواب ملتا چلا آ رھا ہے ۔ اندھے ، اس کے سوا ، کوئی اور جواب دے ھی نہیں سکتے تھے ۔ اُن کے پاس اپنی روش کے جواز میں کوئی دلیل اور برھان نہیں ھوتی ۔ اس لئے کہ دلیل اور برھان اس کے پاس ھوتی ہے جس نے کسی راستے کو دیکھ بھال کر ، اپنے انتخاب سے اختیار کیا ھو ۔ لیکن جو شخص کسی راستے پر اس لئے چل رھا ھو کہ اس کے آباء و اجداد اُسی راستے پر چلا کرتے تھے ، اُس کے لئے دلیل و برھان کا سوال ھی پیدا نہیں ھوتا ۔ وہ اگر مسلمانوں کے گھر میں پیدا ھو گیا تو اس نے مسلمانوں کا راستہ اختیار کر لیا ۔ اگر ھندوؤں کے گھر پیدا ھو جاتا تو انھی کے راستے پر چلنے لگتا ۔

یہ تو انبیائے سابقہ کا تذکرہ تھا ۔ جب نبی اکرمؐ نے اپنی دعوت پیش کی ہے تو آپ کو بھی اس کا وھی جواب ملا جو پہلے انبیاء کرامؑ کو ملا کرتا تھا ۔ یعنی حضورؐ کی دعوت پر اگلے اندھے نے پچھلے اندھوں سے کہا کہ مَا هٰذَا اِلَّا رَجُلٌ يُّرِيْدُ اَنْ يَّصُدَّكُمْ عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُكُمْ (۳۴/۴۳) ۔ یہ شخص چاھتا ہے کہ جن چیزوں کی پرستش تمھارے آباء و اجداد کیا

کرتے تھے تمہیں اس راستے سے روک دے۔ مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِي الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ (۳۸/۷)۔ جو کچھ یہ کہتا ہے ہم نے اسے اپنے پچھلے مسلک و مذہب میں کہیں نہیں سنا۔ اس لئے اس کی بات سچی نہیں ہو سکتی۔ اِنْ هٰذَا اِلَّا اخْتِلَاقٌ (۳۸/۷)۔ یہ محض بناوٹ ہے۔ اس کا خود ساختہ دعویٰ ہے۔ حق و صداقت کا راستہ وہی ہے جس پر ہم اپنے اسلاف کی تقلید میں چلتے آ رہے ہیں۔

غرضیکہ حضرت نوحؑ ہوں یا ہودؑ۔ حضرت صالحؑ ہوں یا شعیبؑ۔ حضرت موسیٰؑ ہوں یا نبی آخرالزماںؐ۔ ہر آنکھوں والے کو اندھوں کی قطار کی طرف سے یہی جواب ملتا رہا کہ اِنَّا وَجَدْنَا اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ (۴۳/۲۲)۔ ہم نے اپنے اسلاف کو ایک طریق پر چلتے دیکھا ہے اور ہم انہی کے نقش قدم پر چلتے جائیں گے۔ قٰلَ اَوَلَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰى مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ اٰبَآءَكُمْ (۴۳/۲۴)۔ ان کے رسول ان سے کہتے رہے کہ جس راستے کی طرف ہم دعوت دیتے ہیں اگر وہ راستہ تمہارے اسلاف کے راستے سے زیادہ واضح، صحیح، روشن اور یقینی طور پر منزل کی طرف لے جانے والا ہو، تو کیا تم پھر بھی اسلاف ہی کے راستے کو ترجیح دو گے؟ وہ کہتے کہ ہمارے لئے مقابلہ اور انتخاب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور ہم کوئی اور بات سننا ہی نہیں چاہتے اِنَّا وَجَدْنَا اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ (۴۳/۲۳)۔ ہم نے اپنے اسلاف کو ایک راستے پر چلتے پایا ہے اور ہم انہی کے نقوش قدم پر آنکھیں بند کئے چلتے جائیں گے۔ ان سے کہا جاتا کہ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْئًا وَّلَا

یَهْتَدُوْنَ (۵/۱۰۴)۔ اگر صورت یہ ہو کہ تمہارے آباء و اجداد کو حقیقت کا کچھ علم نہ ہو اور وہ ساری عمر غلط راستے پر چلتے رہے ہوں، تو کیا تم پھر بھی انہی کے نقش قدم پر چلتے رہو گے؟ جواب ملتا کہ بے شک! ہم اسی راستے پر چلتے رہیں گے۔ اس لئے کہ حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا (۵/۱۰۴)۔ ہمارے اطمینان کے لئے یہ کافی ہے کہ ہم اپنے آباء کے راستے پر چل رہے ہیں۔ ہمیں اس سے زیادہ اور کسی چیز کی ضرورت ہی نہیں۔

تم نے دیکھا سلیم! کہ شاہراہ انسانیت پر کس طرح اندھوں کی ایک قطار ہے جو مسلسل و متواتر ایک ہی ڈگر پر چلے جا رہی ہے۔ ہر پچھلا اندھا اپنے اگلے اندھے کو اپنا ہادی اور راہ نما سمجھتا ہے اور اس کی لکڑی کو اپنی روش کے بر سر حق ہونے کی دلیل و حجت قرار دیتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ لوگ، آنکھیں رکھنے کے باوجود، اس قسم کی اندھی روش کو پسند کیوں کرتے ہیں؟ قرآن نے اس کا جواب ایک لفظ میں دے دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ (۴۳/۲۳)۔ اسی طرح، ہم نے جس قوم کی طرف بھی کوئی رسول بھیجا، تو اس قوم کے مترفین نے یہی کہا کہ ہم نے اپنے آباء و اجداد کو ایک روش پر چلتے پایا ہے اور ہم انہی کے نقش قدم پر چلتے جائیں گے۔ مُتْرَفِیْنَ کے معنی ہیں، وہ لوگ جو خود کچھ کام کرنا نہ چاہیں اور دوسروں کی کمائی پر عیش اڑائیں — سہل انگار، محنت سے جی چرانے والے۔ اس میں دونوں باتیں آ گئیں۔ پہلی بات تو یہ کہ اندھی تقلید میں انسان

کے ذھن کو ذرا بھی محنت نہیں کرنی پڑتی ۔ سوچ سمجھ کر راستہ اختیار کرنے کے لئے انسان کو بڑی ذھنی کاوش اور فکری جد و جہد کرنی پڑتی ھے ۔ یہ کچھ آسان کام نہیں ۔ اس کے برعکس، اسلاف کی پامال راھوں اور آباء و اجداد سے وراثتاً منتقل ھو کر آنے والے مسلک پر چلنے کے لئے کسی سعی و کاوش اور تگ و تاز کی ضرورت ھی نہیں ھوتی ۔ کوئی سوال سامنے آئے، اس کے متعلق بس اتنا بتانے کی ضرورت ھوتی ھے کہ اس باب میں فلاں امام نے یہ کہا ھے اور فلاں بزرگ کا یہ ارشاد ھے ۔ اور یہ ظاھر ھے کہ اس کے لئے کوئی فکری کاوش درکار نہیں ھوتی ۔ یہی وجہ ھے کہ ایسی قوموں میں سب سے بڑا عالم وہ ھوتا ھے جسے سب سے زیادہ حوالے (References) یاد ھوں ۔ یعنی جو سب سے بڑا (Cataloguer) ھو وہ سب سے بڑا عالم ھوتا ھے ۔ اس کے لئے صرف حافظہ (Memory) کی ضرورت ھوتی ھے، فکر (Intellect) کی ضرورت قطعاً نہیں ھوتی ۔

دوسرے یہ کہ اس روش سے، روٹی بڑی آسانی سے مل جاتی ھے ۔ عوام جس راستے پر چل رھے ھوں، آپ اس کی تائید کرتے جائیے ۔ پھر دیکھئے کہ کس طرح آپ کی پرستش ھوتی ھے ۔ یہ جو تم بڑی بڑی مقدس دکانیں دیکھ رھے ھو اور ان کی بکری پر اس قدر متعجب ھوتے ھو، تو ان کی تجارت کا راز (Trade Secret) ھی یہ ھے کہ عوام کو مطمئن اور خوش رکھا جائے اور عوام کے خوش رکھنے کا طریقہ یہ ھے کہ ان سے کہا جائے کہ جس راستے پر تم اور تمہارے آباء و اجداد چلتے آ رھے ھیں وہ راستہ سیدھا جنت میں لے جانے کا ھے ۔

تجارت کا دوسرا راز یہ ھے کہ ھم پیشہ لوگ آپس میں کتنا ھی سر پھٹول

کیوں نہ کریں ، جونہی کوئی باہر کا آدمی اس پیشہ کے خلاف کچھ کہے ، سب اس کی مخالفت میں متحدہ محاذ بنا لیں ۔ یہ جو تم مختلف پیشوں (Professions) والوں کی (Unions) دیکھتے ہو تو ان کی وجۂ جامعیت اپنے پیشے کے مفاد کا تحفظ ہوتا ہے اور بس ۔ یہی وہ چیز ہے جو مذہبی مترفین کو باہمدگر مربوط رکھتی ہے ۔ اس حقیقت کو حضرت ابراہیمؑ نے بڑے لطیف انداز میں بیان کیا تھا ، جب اُنہوں نے بت خانہ کے منتریوں (مذہبی پیشواؤں) سے کہا ، کہ تم میں سے اکثر ایسے ہیں جو جانتے ہیں کہ بتوں کی حقیقت کیا ہے ۔ لیکن اس کے باوجود اس کے خلاف لب کشائی نہیں کرتے کیونکہ ان بتوں کی وجہ سے اُن کا مذہبی جتھ بنا ہوا ہے ۔ اگر اس جتھ میں کمزوری آ جائے تو یہ جو اس وقت عیش کی زندگی گذر رہی ہے ، وہ باقی نہ رہے گی ۔ وَقَالَ اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (۲۹/۲۵) ۔ ابراہیمؑ نے کہا کہ تم نے خدا کو چھوڑ کر بت پرستی اس لئے اختیار کر رکھی ہے کہ اس کی رو سے دنیاوی زندگی میں تم میں باہمی ربط اور پیوستگی قائم رہتی ہے ۔ اس سے تمہارا جتھ بنا ہوا ہے اور جتھے میں رہتے ہوئے تمہیں بہت سے مفاد حاصل ہیں ۔

اس جتھے کو مضبوط رکھنے کے لئے ان کی ٹکنیک یہ ہوتی ہے کہ جونہی انہیں کسی طرف سے کوئی خطرہ محسوس ہوا ، انہوں نے یہ کہ کر عوام کو بھڑکانا شروع کر دیا کہ دیکھنا یہ شخص تمہارے دین میں فتنہ پیدا کرتا ہے ۔ یہ تمہیں اس روش سے ہٹانا چاہتا ہے جس پر تمہارے آبا و اجداد چلتے تھے ۔ یہ کہتا ہے کہ تمہارے اسلاف گمراہ تھے ۔ اگر تم نے اس فتنہ کا سر نہ کچلا تو یہ تمہارے معبودوں کو تباہ کرکے رکھ دے گا ۔

اٹھو۔ قَالُوْا اقْتُلُوْهُ (۲۹/۲۴)۔ اسے قتل کر دو۔ حَرِّقُوْهُ۔ اسے زندہ جلا دو۔ وَانْصُرُوْا اٰلِهَتَكُمْ (۲۱/۶۸)۔ اور اس طرح اپنے معبودوں کا بول بالا کر دو۔ یہی وہ حربہ ہے جسے فرعون نے حضرت موسیٰؑ کے خلاف استعمال کرنا چاہا تھا۔ حضرت موسیٰ نے اس سے کہا کہ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْ اِسْرَآئِيْلَ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ (۲۰/۴۷)۔ تم بنی اسرائیل پر ظلم و ستم سے باز آ جاؤ اور انہیں ہمارے ساتھ جانے دو تاکہ یہ آزادی کی فضاؤں میں سانس لے سکیں۔ بجائے اس کے کہ فرعون اس نقطہ پر بات کرتا، اس نے بات کا رخ بدل کر چاہا کہ حضرت موسیٰؑ کو خار دار جھاڑیوں میں الجھا دیا جائے۔ فرعون کے دربار میں اس کے امراء و وزراء بیٹھے تھے۔ یہ ظاہر ہے کہ وہ خود بھی باطل پرست تھے اور ان کے آباء و اجداد بھی گمراہ۔ فرعون نے حضرت موسیٰؑ سے کہا کہ یہ بتاؤ کہ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى (۲۰/۵۱)۔ جو لوگ پہلے گذر چکے ہیں (یعنی ان امراء و وزراء کے اسلاف) وہ کس حال میں ہیں؟ ان کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے کہ وہ جنت میں ہیں یا جہنم میں؟ صاف ظاہر ہے کہ اس سوال سے فرعون کے پیش نظر کیا شرارت تھی؟ لیکن اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کے سامنے کون ہے؟ اس کے سامنے تھا خدا کا رسول جو ایسے مقامات کی نزاکتوں سے خوب واقف ہوتا ہے۔ حضرت موسیٰ نے اس کے جواب میں کہا کہ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى (۲۰/۵۲)۔ ان کا علم میرے رب کے ہاں مکافاتِ عمل کے رجسٹر میں درج ہے۔ وہ اس باب میں نہ بھولتا ہے، نہ غلطی کرتا ہے۔ ان کا معاملہ اُس کے ساتھ ہے۔ تم مجھے بتاؤ کہ بنی اسرائیل کو میرے ساتھ جانے دیتے ہو یا نہیں؟

یہی کچھ مترفین کا طبقہ پہلے کرتا تھا۔ یہی کچھ وہ آج کرتا ہے۔ جونہی کسی نے ان سے کہا کہ جس روش پر تم چل رہے ہو اور عوام کو چلا رہے ہو، اس کے متعلق اتنا تو دیکھ لو کہ یہ قرآن کے مطابق صحیح ہے یا غلط۔ تو انہوں نے عوام کو بھڑکانا شروع کر دیا کہ اقتلوہ و حرقوہ۔ پکڑ لو، جانے نہ دو، یہ فتنہ ہے۔ اس کا سر کچل دو۔ مقصد اس سے صرف یہ کہ کہیں ان کی بے بصری کا پول نہ کھل جائے اور جو عیش بغیر محنت کئے حاصل ہیں، ان پر زد نہ پڑے۔ اس کے لئے ان کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ قوم کو سوچنے سے باز رکھا جائے۔ اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ اگر ان کے متبعین نے سوچنا شروع کر دیا تو وہ ان سے باغی ہو جائیں گے۔

لیکن اس سے سلیم! اتنا ہی نہیں ہوتا کہ قوم وقتی طور سوچنا چھوڑ دیتی ہے۔ اس کا اثر بہت دور رس اور اس کے نتائج بڑے تباہ کن ہوتے ہیں۔ فطرت کا قانون یہ ہے کہ اگر کوئی ذی حیات کچھ عرصہ تک اپنے کسی عضو سے کام لینا چھوڑ دے اور یہ روش کچھ نسلوں تک متواتر قائم رہے، تو اس کے بعد وہ عضو ہی معدوم ہو جاتا ہے۔ تمہیں یاد ہے، نئی دھلی میں گول ڈاک خانہ کے قریب ایک اندھا لڑکا بھیک مانگا کرتا تھا۔ لوگوں کا کہنا یہ تھا کہ وہ لڑکا شروع میں اندھا نہیں تھا۔ اس نے اندھا بن کر بھیک مانگنی شروع کی۔ وہ دن بھر اپنی آنکھیں بند کرکے بیٹھا رہتا۔ دو چار سال کے بعد اس کی بینائی سچ مچ جاتی رہی۔ یہی حال قوموں کا ہے جب کوئی قوم، اندھی تقلید کا مسلک اختیار کرکے، غور و فکر کرنا چھوڑ دے تو کچھ مدت کے بعد اس قوم سے غور و فکر کی صلاحیت ہی سلب ہو جاتی ہے۔ تم مجھ سے بار بار پوچھا کرتے ہو کہ مسلمانوں میں ارباب فکر و نظر کا اس قدر قحط کیوں ہے؟ ان کے ہاں صاحبان عقل و بصیرت کیوں

نہیں پیدا ہوتے ؟ جبکہ دنیا کی دوسری قوموں میں ان کی اتنی فراوانی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس قوم نے صدیوں سے فکر و بصیرت سے کام لینا چھوڑ دیا ہے۔ اس لئے، فطرت کے اٹل قانون کے مطابق، ان سے فکر و تدبر کی صلاحیت ہی مفقود ہو گئی ہے۔ آس گول ڈاک خانے والے اندھے کی طرح ان کی بینائی سلب ہو چکی ہے۔ تقلید کا یہی نتیجہ ہوتا ہے۔ اِنَّا جَعَلْنَا فِیْٓ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا فَهِیَ اِلَى الْاَذْقَانِ فَهُمْ مُّقْمَحُوْنَ (۳۶/۸) ۔ ان کی گردنوں میں ایسے طوق ڈال دئیے جاتے ہیں جن سے اُن کے سر اُٹھے کے اُٹھے رہ جاتے ہیں اور وہ اپنی گردن ٹھوڑی سے نیچے کر نہیں سکتے۔ اس لئے انہیں اپنے سامنے کا راستہ دکھائی نہیں دیتا۔ وَ جَعَلْنَا مِنْۢ بَیْنِ اَیْدِیْهِمْ سَدًّا وَّ مِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَیْنٰهُمْ فَهُمْ لَا یُبْصِرُوْنَ۔ (۳۶/۹) ۔ ان کے سامنے بھی روک پیدا ہو جاتی ہے اور ان کے پیچھے بھی۔ ان کی عقلوں پر پردے پڑ جاتے ہیں اور ان کی بینائی سلب ہو جاتی ہے۔ وَسَوَآءٌ عَلَیْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ (۳۶/۱۰)۔ انہیں سمجھانا نہ سمجھانا برابر ہوتا ہے۔ یہ کبھی سیدھا راستہ اختیار نہیں کریں گے۔ اِنَّ مَرْجِعَهُمْ لَاِلَى الْجَحِیْمِ (۳۷/۶۹)۔ ان کی یہ روش انہیں جہنم کی طرف کھینچ کر لے جائے گی۔ اس لئے کہ اِنَّهُمْ اَلْفَوْا اٰبَآءَهُمْ ضَآلِّیْنَ۔ (۳۷/۷۰) ۔ انہوں نے جس گمراہ کن روش پر اپنے باپ دادا کو پایا، اُسی روش پر یہ خود چلے جا رہے ہیں۔ چونکہ ان کی نگاہیں ہمیشہ اسلاف کی طرف لگی رہتی ہیں، اس لئے ان کے ذہن میں ماضی تو درخشندہ اور تابناک ہوتا ہے اور مستقبل تیرہ و تار۔ ان سے جب سنئے، یہ اپنے ماضی کے قصے دہراتے رہیں گے اور اس سے بہت خوش ہوں گے۔ یہ ماضی کو ست جگ (حق و صداقت

کا زمانہ) اور مستقبل کو کل جگ (تباہی کا دور) قرار دیں گے۔ تمہیں یاد ہے، شملہ میں وہ لڑکا — فتو گوجر — جب تمہیں راستہ دکھانے کے لئے سڑک تک جاتا تھا تو لالٹین لے کر تمہارے پیچھے پیچھے چلتا تھا اور تمہیں بار بار کہنا پڑتا تھا کہ روشنی لے کر آگے آگے چلو۔ لالٹین کے پیچھے رکھنے سے، طے کردہ راستہ تو روشن ہو جاتا تھا لیکن سامنے کا راستہ خود تمہارے سائے سے تاریک تر ہو جاتا تھا۔ یہی حالت ماضی پرست قوم کی ہو جاتی ہے۔ اس کے نزدیک گذرا ہوا زمانہ درخشندہ ہوتا ہے اور اپنا زمانہ اور آنے والا دور تاریک۔ یہی وہ جہنمی ذہنیت ہے جس کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ وہاں چہرے اُلٹے ہوتے ہیں۔ یعنی آنکھیں سامنے کی طرف ہونے کی بجائے پیچھے کی طرف ہوتی ہیں۔ يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوْهُهُمْ فِى النَّارِ۔ (۳۳/۶۶)۔ اس کی وجہ کیا ہوتی ہے اس کی تصریح اگلی آیت میں کر دی جہاں فرمایا کہ وہ کہیں گے کہ اِنَّا اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا (۳۳/۶۷)۔ بجائے اس کے کہ ہم اپنی عقل و فکر سے کام لے کر زندگی کی صحیح روش پر چلتے، جو خدا نے متعین کی تھی، ہم اپنے بڑوں کی اطاعت کرتے رہے اور انہوں نے ہمیں یوں گمراہ کر دیا۔ یہی ہیں جن کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ یہ لوگ انسانی سطح سے نیچے گر کر حیوانی سطح پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ "بھیڑ چال" کا محاورہ حیوانی سطح کا آئینہ دار ہے۔ اندھوں کی یہ قطار، انسانوں کا گروہ نہیں بلکہ، حیوانوں کا گلہ ہوتی ہے۔ دیکھو سلیم! قرآن کس قدر واضح الفاظ میں اس حقیقت کو بیان کرتا ہے۔ سورۂ اعراف میں ہے وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ۔ انسان شہری ہوں یا دیہاتی۔ ان کی اکثریت جہنم ہی کے اندر ہوتی ہے۔ اس لئے کہ لَهُمْ

قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۔ ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ سینے میں دل تو رکھتے ہیں لیکن اس سے سمجھنے سوچنے کا کام نہیں لیتے۔ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۔ ان کی آنکھیں بھی ہوتی ہیں لیکن ان سے دیکھنے بھالنے کا کام نہیں لیتے۔ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ۔ ان کے کان بھی ہوتے ہیں، لیکن ان سے سننے کا کام نہیں لیتے ۔ اُوْلٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۔ یہ دیکھنے میں انسان نظر آتے ہیں لیکن درحقیقت حیوانوں کی مانند ہوتے ہیں ۔ بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ۔ اس لئے کہ اُوْلٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ (۷/۱۷۹) ۔ یہ لوگ اس حقیقت سے بے خبر رہتے ہیں کہ انسانیت نام ہی اس کا ہے کہ اپنی عقل و فکر سے کام لیا جائے ۔ اندھوں کی قطار میں چلنے والے، انسان نہیں حیوان ہوتے ہیں ۔ بھیڑ چال، انسانیت کا خاصہ نہیں، حیوانی روش ہے ۔ اسی حقیقت کو سورۂ بقرہ میں بانداز دگر بیان کیا گیا ہے ۔ پہلے یہ کہا کہ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (قرآن) کی اتباع کرو تو یہ کہتے ہیں کہ نہیں! ہم تو اسی مذہب کی اتباع کرتے رہیں گے مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ۔ جس پر ہم نے اپنے آباء و اجداد کو پایا ہے ۔ اس کے جواب میں قرآن نے کہا ہے کہ خواہ تمہارے آباء و اجداد کچھ بھی عقل و شعور نہ رکھتے ہوں اور غلط راستوں پر چلتے رہے ہوں، تم اس پر بھی انہی کی پیروی کرتے رہو گے؟ (۲/۱۷۰) ۔ اس کے بعد ہے وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِىْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً ۔ یہ لوگ جو سیدھے راستے پر چلنے سے انکار کرتے ہیں، ان کی مثال یوں سمجھو جیسے بھیڑ بکریوں کا ایک ریوڑ ہے اور ان کے پیچھے ایک چرواہا ۔

چرواہے نے اپنے بڑے بوڑھوں سے کچھ آوازیں سیکھ رکھی ہیں بلا الفاظ۔ اور کچھ الفاظ یاد کر رکھے ہیں بلا معنی و مطلب۔ وہ یہ آوازیں نکالتا اور الفاظ دھراتا ہے۔ اور بھیڑیں، بکریاں جو ان اشاروں کی عادی ہو چکی ہیں، بلا سوچے سمجھے ادھر اُدھر مڑ جاتی ہیں۔ بس یہی حالت آباء کی تقلید کرنے والوں کی ہے۔ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ (۲/۱۷۱)۔ بہرے، گونگے، اندھے، عقل و خرد سے کام نہ لینے والے جانور۔ انہیں انسان کون کہہ سکتا ہے ؟

اس آیت پر پھر غور کرو سلیم ! کہ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ ما انزل اللہ (قرآن) کی اتباع کرو تو یہ اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ نہیں ! ہم تو اس مذھب و مسلک کی پیروی کرتے رہیں گے جس پر ہمارے آباء و اجداد چلتے رہے ہیں۔ یعنی قرآن، ما انزل اللہ کی اتباع اور مَا اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَاءَنَا (اسلاف کے مسلک) کی اتباع کو ایک دوسرے کے مقابل لایا ہے۔ تم دیکھو گے سلیم ! کہ یہ چیز جس طرح نزول قرآن کے زمانہ میں حقیقت تھی، اسی طرح آج بھی حقیقت ہے۔ ہمارے ہاں بہت سے فرقے ہیں، جن کی کیفیت یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کی تکفیر و تفسیق میں الجھے رہتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود، وہ ایک دوسرے کو برداشت (Tolerate) کرتے ہیں۔ اس لئے کہ ان سب میں قدر مشترک اسلاف کی تقلید ہوتی ہے (فرقہ بنتا ہی اسلاف کی تقلید سے ہے)۔ لیکن اگر کوئی شخص انہیں قرآن کے اتباع کی طرف دعوت دے تو یہ سب پنجے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں اور اسے "دین" کا عظیم فتنہ قرار دیتے ہیں۔ اس کی وجہ وہی ہے جو

قرآن نے بیان کی ہے ۔ مختلف فرقے ، ایک دوسرے سے کتنا ہی اختلاف کیوں نہ رکھیں ، ان میں سے کوئی بھی مَا اَلْفَیْنَا عَلَیْهِ اٰبَاءَنَا کے خلاف نہیں ہوتا ۔ اس کے خلاف آواز اسی کی ہوتی ہے جو قرآن کی طرف دعوت دیتا ہے ۔ یہ آواز ان میں سے کسی کے لئے بھی قابل قبول نہیں ہوتی ۔ اس کی وجہ قرآن نے سورۂ بقرہ کی ایک آیت میں بیان کی ہے ۔ لیکن اس آیت کے سامنے آنے سے پہلے ، ایک اہم نکتہ کا تمہیداً سمجھ لینا ضروری ہے ۔ بچہ اپنی پیدائش کے بعد ، اپنی مملکت میں حکمران ہوتا ہے ۔ جب جی چاہتا ہے سوتا ہے ، جب جی چاہتا ہے جاگتا ہے ۔ بھوک لگتی ہے تو اُس کی ایک آواز (رونے) پر دودھ حاضر ہو جاتا ہے ۔ سردی لگتی ہے تو خود بخود کپڑا اُس کے اُوپر آ جاتا ہے ۔ گرمی لگتی ہے تو پنکھا ہلنے لگ جاتا ہے ۔ وقس علی ھذا ۔ لیکن جوں جوں وہ بڑا ہوتا ہے اُس کے ان اختیارات و اقتدارات میں کمی واقع ہونی شروع ہو جاتی ہے ۔ اب وہ گھر میں اپنے بجائے ایک اور شخصیت کو صاحب اختیار و اقتدار دیکھتا ہے ۔ یہ شخصیت اُس کے باپ کی ہوتی ہے ۔ وہ گھر کا حاکم اعلیٰ ہوتا ہے ۔ وہی کھانے پینے کو دیتا ہے ۔ اُسی کا فیصلہ ہر متنازعہ فیہ معاملہ میں قول فیصل ہوتا ہے ۔ گھر کا ہر فرد اسی سے ہدایت لیتا اور اسی کے اشارات پر چلتا ہے ۔ یہ آسرا بچے کے لئے بہت بڑا آسرا اور یہ سہارا بہت محکم سہارا ہوتا ہے ۔ جس قوم میں بچوں کی تعلیم و تربیت کا صحیح انتظام ہو اس کے بچے ، عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ ، ذہنی پختگی میں بھی بڑھتے جاتے ہیں ، تاآنکہ ایک وقت ایسا آجاتا ہے جب وہ (ذہنی طور پر) باپ کے سہارے کے محتاج نہیں رہتے ۔ لیکن جن قوموں میں بچوں کی تعلیم و تربیت کا صحیح انتظام نہیں ہوتا (اور زوال آمادہ اقوام میں یہی ہوتا ہے) ان کے بچے عمر کے لحاظ سے تو جوان ہو جاتے ہیں لیکن ذہنی اعتبار سے بچے کے بچے ہی رہتے ہیں ۔ اس لئے وہ عمر بھر سہاروں

کے محتاج رہتے ہیں۔ جب تک باپ زندہ ہو، ہر معاملہ میں راہنمائی ور فیصلہ کے لئے اس کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ جب وہ مر جائے تو وہ، زندگی کے ہر دوراہے پر، ان کتابوں کی طرف رجوع کرتے ہیں جن میں ان کے آباء و اجداد کے اقوال اور فیصلے درج ہوں۔ ایسی قوموں کے نزدیک، آباء و اجداد کی عقل سے بڑھ کر، کسی کی عقل اور ان کے فیصلوں سے بہتر، کسی کے فیصلے نہیں ہوتے۔ وہ اسی میں عافیت سمجھتے ہیں کہ اسلاف کے نقش قدم پر آنکھیں بند کر کے چلتے جائیں۔ وہ یہ کچھ کرتے تو اس لئے ہیں کہ ان کا اپنا ذہن ناپختہ ہوتا ہے اور اس میں معاملات کے فیصلے کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی، لیکن چونکہ انسان کا نفس بڑا حیلہ تراش واقع ہوا ہے اس لئے وہ انہیں یہ محسوس ہی نہیں ہونے دیتا کہ وہ ایسا کچھ اپنی ذہنی کمزوری کی وجہ سے کرتے ہیں (کیونکہ اس سے انہیں شکست پندار ہوتی ہے) بلکہ انہیں سجھاتا یہ ہے کہ وہ یہ کچھ اسلاف کے احترام اور بزرگوں کی تعظیم کی وجہ سے کرتے ہیں۔ وہ انہیں کہتا یہ ہے کہ اُن کی تعظیم و احترام کا تقاضا ہے کہ ع

خطائے بزرگاں گرفتن خطا ست

اگر ان کی کسی بات کے متعلق علم بھی ہو جائے کہ وہ غلط ہے، تو بھی اس پر گرفت نہیں کرنی چاہئے، بلکہ سمجھنا یہی چاہئے کہ ان کی غلطی میں بھی مصلحت کا کوئی پہلو ہوگا۔ رفتہ رفتہ اسلاف کا یہ احترام ان کے دل میں اس درجہ راسخ ہو جاتا ہے کہ اگر کوئی شخص اُن کی کسی غلطی کی طرف اشارہ کرے تو اس سے انہیں اسی طرح غصہ آ جاتا ہے جیسے کسی نے ان کے باپ کو گالی دی یا اُن کے معبود کی شان میں گستاخی کی ہو۔ اسی کا نام اسلاف پرستی (Ancestor Worship) ہے، جسے قرآن شرک قرار دیتا ہے۔ یہی

وہ حقیقت ہے جسے اُس نے سورۂ بقرہ کی اس آیت میں بیان کیا ہے جسے درج کرنے سے پہلے میں نے تمہیداً یہ کچھ لکھا ہے ۔ اس میں کہا گیا ہے کہ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ (۲/۱۶۵) ایسے لوگ بھی ہیں جو اللہ کے علاوہ اوروں کو اُسی جیسا معبود بنا لیتے ہیں اور اُن میں ایسی ہی کشش و جاذبیت محسوس کرتے ہیں جیسی خدا میں کرنی چاہئے ۔ اس کے برعکس جو لوگ خدا کے بتائے ہوئے راستے کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں اُن کے لئے قانون خداوندی کی کشش و جاذبیت سب سے بڑھ کر ہوتی ہے ۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (۲/۱۶۵) ۔

قرآن کے متعلق مسلمانوں کی ذہنیت یہ ہو چکی ہے کہ جب اُن کے سامنے اس قسم کی آیات پیش کی جاتی ہیں تو وہ کہ دیتے ہیں کہ یہ یہودیوں کے متعلق ہے ، یہ عیسائیوں کے متعلق ۔ فلاں آیت قریش مکہ کے متعلق نازل ہوئی تھی ۔ فلاں منافقین مدینہ کے متعلق ۔ گویا یہ تمام آیات دوسروں کے متعلق ہیں ۔ ہمارا اُن سے (اور اُن کا ہم سے) کوئی واسطہ نہیں ۔ یہی کچھ ہم اُن آیات کے متعلق کہ دیتے ہیں جن میں قرآن نے اسلاف کی تقلید سے منع کیا ہے ۔ ہم یہ کہ کر اپنے آپ کو مطمئن کر لیتے ہیں کہ یہ آیات یہود و نصاریٰ اور مشرکین مکہ کے متعلق ہیں ، ہمارے متعلق نہیں ۔ حالانکہ قرآن کے یہ قوانین ابدی ہیں اور ہم پر بھی ان کا اسی طرح اطلاق ہوتا ہے ، جس طرح اس کے زمانۂ نزول کے مخاطبین پر ہوتا تھا ۔ لیکن اس کے باوجود ، ہم اسے گوارا ہی نہیں کر سکتے کہ ان آیات کو اپنے اور اپنے اسلاف سے متعلق قرار دیں ۔ اس سے ہمارے دل کو ٹھیس لگتی ہے کیونکہ ہم سمجھتے ہیں کہ اس سے

ھمارے بزرگوں کی سوء ادبی ھوتی ھے ۔ جہاں تک دل کو ٹھیس لگنے کا تعلق ھے ، ان آیات سے جس طرح آپ کے دل کو ٹھیس لگتی ھے اسی طرح اُن لوگوں کے دل کو بھی ٹھیس لگتی ھے جن کے متعلق (آپ سمجھتے ھیں کہ) یہ آیات آئی ھیں ۔ اپنے دل کی ٹھیس کا اس قدر خیال کرنا اور دوسروں کے دل کی ٹھیس کی ذرا بھی پرواہ نہ کرنا ، یہ تو کچھ اچھی ذھنیت نہیں ۔ حقیقت یہ ھے کہ قرآن اپنی تعلیم کے سلسلہ میں " اپنے اور پرائے " میں کچھ فرق نہیں کرتا ۔ بلکہ یوں کہئے کہ ان قوانین کے بیان کرتے وقت " اپنا پرایا " اس کے پیش نظر ھوتا ھی نہیں ۔ وہ ایک اصول بیان کر دیتا ھے اور یہ بتا دیتا ھے کہ جو لوگ اس کے مطابق زندگی بسر کریں گے ان کا انجام یہ ھوگا ، اور جو اس کی خلاف ورزی کریں گے ان کی روش کے عواقب یہ ھوں گے ۔ اس کے بعد وہ دنیا کی ھر قوم (مسلم و غیر مسلم) سے کہتا ھے کہ وہ اسی اصول کی روشنی میں اپنی اپنی روش کا جائزہ لیں اور خود اندازہ کر لیں کہ اس روش کا نتیجہ کیا مرتب ھوگا ۔ اس میں کسی کے دل کو ٹھیس لگنے یا نہ لگنے کا سوال ھی پیدا نہیں ھوتا ؟ لیکن اگر کوئی شخص (یا گروہ) اس بات سے برا منا لیتا ھے کہ قرآن نے اس کی یا اس کے اسلاف میں سے کسی کی غلط روش کو غلط کیوں کہا ھے تو وہ برا منایا کرے ۔ قرآن اس کے جذبات کی رعایت سے غلط کو صحیح کبھی نہیں کہہ سکتا ۔ اس کے ساتھ ھی وہ یہ کہتا ھے کہ اس میں برا ماننے کی بات ھی کچھ نہیں ۔ اگر تم پر (قرآن کی روشنی میں) یہ حقیقت واضح ھو جائے کہ تمہاری فلاں روش غلط ھے تو تم اُسے چھوڑ دو ، اور اگر یہ معلوم ھو جائے کہ تمہارے اسلاف میں فلاں کی روش غلط تھی تو تمہیں اس سے کچھ تعلق نہیں ۔ وہ اپنے معاملات کا آپ ذمہ دار تھا ۔ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۔ یہ (تمہارے اسلاف) گذر چکے ھیں ۔

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۔ جو کچھ انہوں نے کہا اس کی ذمہ داری ان پر ہے ، جو کچھ تم کرتے ہو اس کے ذمہ دار تم ہو ۔ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۲/۱۴۱) تم سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ انہوں نے کیا کیا تھا ؟ اس لئے اس میں تمہارے برا ماننے کی کیا بات ہے ؟

لیکن اسلاف پرستی کا برا ہو کہ وہ انسان کو صداقت پسندی کی طرف آنے ہی نہیں دیتی !

پھر اس حقیقت کا سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ قرآن یہ نہیں کہتا کہ تم اپنے اسلاف کے متعلق یہ فیصلہ کر لو کہ ان کی ہر بات غلط تھی ۔ وہ کہتا صرف یہ ہے کہ ان کی باتوں کو قرآن کی روشنی میں پرکھ کر دیکھ لو ۔ جو باتیں ان میں سے قرآن کے مطابق ہوں ، انہیں صحیح سمجھو ۔ جو اس کے مطابق نہ ہوں ، انہیں غلط سمجھو ۔ اس لئے کہ صحیح اور غلط کا معیار خدا کی کتاب ہے ۔ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى (۲/۱۲۰) ۔ ہدایت تو صرف وہی ہے جو خدا کی طرف سے ملی ہے ۔

اس مقام پر ایک اور اہم سوال سامنے آتا ہے ۔ ان (اسلاف پرست) حضرات کے سامنے جب اسلاف میں سے کسی کی کوئی ایسی بات پیش کی جائے جو قرآن کے خلاف ہو ، تو یہ اس کے جواب میں کہہ دیتے ہیں کہ ان کے سامنے بھی قرآن تھا اور وہ ہم سے بہتر قرآن سمجھتے تھے ۔ لہٰذا جو کچھ انہوں نے کہا ہے (اگرچہ وہ ہمیں قرآن کے خلاف نظر آتا ہے لیکن ہمیں یہی سمجھنا چاہئے کہ) وہ قرآن کے خلاف نہیں ہو سکتا ۔ اس دلیل کو سلیم ! ذرا آگے بڑھاؤ تو یہ

حقیقت نکھر کر سامنے آ جائے گی کہ (اس خیال کے مطابق) قرآن اب ہمارے لئے بے کار ہے ۔ اس لئے کہ قرآن کی ہر آیت کے متعلق اسلاف نے کچھ نہ کچھ لکھ دیا ہے اور چونکہ ہم نے اسی کو قرآن کی تعلیم سمجھنا ہے جسے ان اسلاف نے لکھ دیا ہے ، اس لئے ہمارے لئے ان اسلاف کے نوشتے ضروری رہ گئے ، نہ کہ قرآن ۔ اگر ہمارے پاس یہ نوشتے موجود ہوں اور قرآن نہ ہو ، تو اس سے کچھ کمی واقع نہیں ہوگی ۔ لٰہذا ہمارے لئے قرآن بے کار ہے ۔ اور اس کا عملی ثبوت یہ ہے کہ ہمارے ہاں قرآن کا مصرف صرف اس کی تلاوت (پڑھ لینا) رہ گیا ہے ، عمل اسی پر ہے جو اسلاف نے لکھ دیا ہے ۔ چنانچہ ہمارے زمانے میں جو لوگ قرآن کی تفاسیر لکھتے ہیں ۔ ان میں (زیادہ سے زیادہ) زبان ان کی اپنی ہوتی ہے ۔ مطالب و معانی سب وہی ہوتے ہیں جو اسلاف نے بیان کر دئیے ہیں ۔ اگر کوئی شخص قرآن کا کوئی ایسا مفہوم بیان کرے جو اسلاف کے بیان کردہ مفہوم سے مختلف ہو ، تو اس کی اس کوشش کو مردود ، اور اسے دین کے لئے فتنہ قرار دے دیا جاتا ہے ۔ ہمارے ہاں قرآن کی وہی تفسیر معتبر سمجھی جاتی ہے جو حرفاً حرفاً سلف کے مسلک کے مطابق ہو ۔

قرآن میں بے شمار آیات ہیں جن میں تدبر و تفکر (غور و فکر) کا حکم دیا گیا ہے ۔ قرآن نے یہ نہیں کہا کہ یہ حکم کسی خاص زمانے کے لوگوں کے لئے ہے ۔ اس کے بعد یہ حکم منسوخ سمجھا جائے ۔ لٰہذا تدبر فی‌القرآن کا حکم ہمارے لئے بھی ویسا ہی ہے جیسا ہمارے اسلاف کے لئے تھا ۔ لیکن ان حضرات کے تصور کے مطابق ہمارے لئے یہ حکم منسوخ ہے ۔ تدبر جو کچھ کیا جانا تھا ، اسلاف نے کر لیا ۔ لیکن اگر بغور دیکھا جائے تو انہوں نے بھی تدبر نہیں کیا (بلکہ کسی نے بھی نہیں کیا) اس لئے کہ سب سے پہلے قرآن پر تدبر نبی اکرمؐ نے کرنا تھا ۔ لیکن (ان حضرات کے عقیدہ کے مطابق) حضورؐ کو

قرآن کی تفسیر بھی وحی کے ذریعے بتا دی گئی ۔ اس لئے آپ کے لئے تدبر کی کوئی گنجائش نہ رھی ۔ آپؐ کے بعد ، ھمارے اسلاف کے لئے بھی تدبر کا سوال پیدا نہیں ھوتا تھا کیونکہ قرآن کی تفسیر روایات میں آ چکی تھی ۔ اور روایات کی موجودگی میں تدبر کی گنجائش ھی نہ تھی ۔ اس کے بعد ھم ھیں ۔ اور ھمارے لئے بھی تدبر کی گنجائش نہیں ۔ لہٰذا سوچئے کہ قرآن نے جو تدبر و تفکر کا حکم دیا ھے تو وہ کس کے لئے ھے ؟

* * *

یہ تمہیں معلوم ھی ھے سلیم ! کہ

(۱) خدا نے دین کو قرآن میں مکمل کر دیا اور قرآن کی حفاظت کا ذمہ خود لے لیا ۔ اس کے بعد سلسلۂ نبوت کو ختم کر دیا ۔

(۲) رسول اللہ نے اپنی احادیث (تفسیر قرآن) کا کوئی مجموعہ اُمت کو نہیں دیا ، نہ ھی خلفائے راشدین یا دیگر صحابہؓ نے کوئی ایسا مجموعہ مرتب کیا ۔

[احادیث کے جو مجموعے ھمارے پاس ھیں ان میں بھی تفسیر کا باب بڑا مختصر ھوتا ھے اور ان روایات کے متعلق (امام) احمد بن حنبلؒ کا قول ھے کہ ان کی کوئی اصل نہیں] ۔

اس سے انسان ایک ھی نتیجہ پر پہنچتا ھے اور وہ یہ کہ خدا اور اُس کے رسول نے اُمت کے لئے تدبر کا دروازہ کھلا رکھا ھے ۔ قرآن کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ھے کہ اس میں انسانیت کو پہلی مرتبہ بالغ (Treat) کیا گیا ھے ۔ اس کے معنی یہ ھیں کہ انسان کو زندگی کے محکم اور غیر متبدل اصول دے کر ، آزاد رکھا گیا ھے کہ وہ ان قوانین کی روشنی میں ، اپنے مسائل کا

حل آپ تلاش کرے ۔ اسی کا نام تدبر فی القرآن اور تفکر فی الکائنات ہے ۔

لٰہذا سوچو سلیم ! کہ تدبر و تفکر کے جس دروازے کو خدا اور اس کے رسول نے اس طرح کھلا چھوڑا تھا ، ہماری اسلاف پرستی کے جذبے نے اسے کس بری طرح سے بند کر رکھا ہے ۔ انہوں نے (خدا اور رسول نے) انسان کو بالغ قرار دیا تھا ۔ ہم نے اپنے آپ کو پھر بچہ بنا لیا اور زندگی کے ہر قدم پر فیصلوں کے لئے پیچھے تکنے لگ گئے ۔ اپنی اس سہل انگاری اور عافیت کوشی کا نام اتباع سلف رکھ لیا اور اپنے ذہن کی ناپختگی کو بزرگوں کے احترام کے مقدس نقاب میں چھپانے کی کوشش کرنے لگے اور یوں اپنے آپ کو مطمئن کر لیا کہ ہم زندگی کے صحیح راستے پر چل رہے ہیں ۔ حالانکہ ان بزرگوں نے کبھی یہ نہیں کہا تھا کہ تم نے ہماری بات کو آنکھیں بند کرکے تسلیم کر لینا ۔ آن کے متعلق ایسی روش کا اختیار کرنا ، خود ان کی منشاء کے خلاف ہے اور ناراضگی کا باعث ۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف قرآن نے یہ کہ کر اشارہ کیا ہے کہ اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِیْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ (۲/۱۶۶) ۔ جب وہ لوگ ، جنہیں دوسروں نے اپنا پیشوا بنا لیا تھا ، اپنے ان متبعین سے اظہار بیزاری کریں گے ۔ اور یہ متبعین عذاب خداوندی کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھیں گے اور جن سہاروں کو وہ اپنی نجات کا ذریعہ سمجھتے تھے (یعنی تقلید اسلاف) وہ ایک ایک کرکے ٹوٹتے نظر آئیں گے تو اس وقت انہیں یہ حسرت ہوگی کہ اگر زندگی کا دھارا ایک بار کہیں پیچھے کی طرف مڑ جائے تو پھر ہم اپنے ان پیشواؤں سے اسی طرح اظہار بیزاری کریں جس طرح انہوں نے ہم سے اظہار بیزاری کیا ہے (۲/۱۶۷) ۔ لیکن انہیں معلوم نہیں کہ زندگی کا دھارا پیچھے کی طرف کبھی نہیں

مڑا کرتا۔ زندگی وہ جوئے رواں ہے کہ اس میں جو پانی آگے نکل گیا وہ واپس نہیں آ سکتا۔ زندگی "آواگون کے چکر" (تناسخ) میں نہیں گھومتی۔ یہ سیدھے راستے پر آگے کی طرف چلی جاتی ہے۔ اس لئے ظہور نتائج کے وقت اس کی آرزو کرنا، کہ ہمارے اعمال واپس کر دئیے جائیں تاکہ ہم ان کی اصلاح کر لیں، موہوم خیال اور ناکام آرزو ہوگی۔

بہر حال، میں کہہ رہا تھا سلیم! کہ ہمارے اسلاف میں سے جو فی الواقع صالح تھے انہوں نے یہ کبھی نہیں کہا ہوگا کہ تم ہمارے اقوال کی اندھی تقلید کرتے رہو۔ انہوں نے ہمیشہ یہی کہا ہوگا کہ اطاعت صرف احکام خداوندی کی کی جائے گی۔ تم ہمارے اقوال کو بھی کتاب اللہ کی سند اور تائید کے بغیر مت مانو۔ باقی رہے وہ لوگ جو دیدہ و دانستہ دوسروں کو اپنے پیچھے لگاتے ہیں تاکہ اس سے ان کی "دکانداری" بڑھے، تو قرآن نے کئی ایک مقامات میں اس منظر کا نقشہ کھینچا ہے جب یہ پیشوا اور ان کے متبعین جہنم میں جمع ہوں گے اور وہاں ایک دوسرے کو مطعون کریں گے کہ تم ہماری تباہی کا باعث ہو۔ مثلاً سورۂ ابراهیم میں ہے کہ فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ۔ یہ متبعین اپنے پیشواؤں سے (یہ محکوم اپنے حاکموں سے) کہیں گے کہ ہم تمہارا اتباع کیا کرتے تھے۔ تو کیا تم اس عذاب خداوندی سے جو ہم پر مسلط ہو رہا ہے، ہم کو دور نہیں کرو گے؟ اس کے جواب میں وہ پیشوایان مذہب اور ہادیان سیاست اُن سے کہیں گے کہ لَوْ هَدٰىنَا اللّٰهُ لَهَدَيْنٰكُمْ اگر اس عذاب سے نکلنے کا کوئی راستہ ہمیں دکھائی دیتا تو تمہیں بھی وہ راستہ دکھا دیتے۔ اس وقت تو جس طرح بے بس

اور لاچار تم ہو، ہم بھی ویسے ہی ہیں۔ سَوَآءٌ عَلَيْنَآ أَجَزِعْنَآ أَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِن مَّحِيصٍ (۱۴/۲۱)۔ اب چیخنے چلانے سے کیا حاصل ہے۔ یہاں سے نکل بھاگنے کی کوئی سبیل ہی نہیں۔ اس لئے اس عذاب کو برداشت کرنا ہوگا۔

سورۂ سبا میں ان کے باہمی مکالمات کو ذرا تفصیل سے درج کیا گیا ہے۔ يَقُولُ الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا لِلَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا لَوْلَآ أَنتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِينَ۔ یہ متبعین اپنے سرداروں اور پیشواؤں سے کہیں گے کہ اگر تم نہ ہوتے تو ہم ضرور مومن ہوتے۔ تم ہی نے ہمیں گمراہ کیا۔ قَالَ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا لِلَّذِينَ اسْتُضْعِفُوٓا أَنَحْنُ صَدَدْنَاكُمْ عَنِ الْهُدَىٰ بَعْدَ إِذْ جَآءَكُم۔ بَلْ كُنتُم مُّجْرِمِينَ۔ وہ پیشوایان اور سرداران ان سے کہیں گے کہ تم ہمیں مورد الزام کس منہ سے قرار دیتے ہو؟ خدا کی کتاب تمہارے پاس موجود تھی۔ کیا ہم نے تمہیں اس کے اتباع سے زبردستی روکا تھا؟ م نے خود ہی اس کے اتباع کے بجائے ہمارے پیچھے پیچھے چلنا شروع کر دیا۔ مجرم تم خود ہو اور الزام ہمارے سر دھرتے ہو۔

تم نے دیکھا سلیم! ان پیشواؤں نے انہیں کیا جواب دیا ہے؟ یہ جواب کہ اللہ کی کتاب تمہارے پاس موجود تھی۔ تمہیں کس نے کہا تھا کہ اسے چھوڑ کر ہماری تقلید کرو؟ تم نے خود ہی ہمیں معبود بنا لیا۔ اس میں ہمارا کیا قصور ہے؟ اس کے جواب میں وہ کہیں گے کہ بَلْ مَكْرُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ إِذْ تَأْمُرُونَنَآ أَن نَّكْفُرَ بِاللَّهِ وَنَجْعَلَ لَهُۥٓ أَندَادًا

(۳۴/۳۳) ۔ یہ ٹھیک ہے کہ تم ہمیں ڈنڈے کے زور سے اپنے پیچھے نہیں لگایا کرتے تھے ، لیکن تم دن رات ایسی تدبیریں کیا کرتے تھے جن سے ہم قانون خداوندی سے انکار کرکے تمہیں خدا کا ہمسر بنا لیں۔ ہم ان تدبیروں کے حریف نہیں ہو سکتے تھے اس لئے تمہاری اتباع اختیار کر لیتے تھے ۔ یہ بھی تو جبری اطاعت ہی تھی اگرچہ اس کے لئے جو طریق تم نے اخیار کیا تھا اس میں بظاہر جبر نہیں دکھائی دیتا تھا ۔

سلیم ! اس مکالمہ پر غور کرو اور پھر دیکھو کہ قرآن کس کس انداز و اسلوب سے تبیان حقیقت کرتا ہے ۔ دوسری جگہ ہے کہ یہ عوام (متبعین) کہیں گے کہ رَبَّنَا اِنَّا اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا ۔ اے ہمارے نشو و نما دینے والے ! ہم نے اپنے سرداروں ور پیشواؤں کی اطاعت کی اور انہوں نے ہمیں سیدھے راستے سے گمراہ کر دیا۔ رَبَّنَا اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا (۳۲/۶۰) اے ہمارے پروردگار ! تو انہیں دگنا عذاب دے ۔ ایک ان کی اپنی غلط روی کی وجہ سے اور ایک اس وجہ سے کہ انہوں نے ہمیں گمراہ کیا ، اس لئے انہیں خوشگواریوں اور سعادتوں سے دور رکھ ! بہت دور !!

سورۂ اعراف میں یہی مکالمہ اسلاف اور اخلاف کے درمیان بان کیاگیا ہے اور کہاگیا ہے کہ بعد میں آنے والی نسل اپنی پیشرو نسل کے متعلق کہے گی کہ انہوں نے ہمیں گمراہ کر دیا اس لئے انہیں دگنا عذاب ملنا چاہئے۔ اس کا انہیں جواب ملے گا کہ لِكُلٍّ ضِعْفٌ تم میں سے ہر ایک کو دگنا عذاب ملیگا ۔ پہلی نسل کو اس لئے کہ وہ خود غلط روش پر چلے اور آنے والوں کے لئے غلط روی کا نمونہ بن گئے۔ اور تمہیں اس لئے دگنا عذاب دیا جائے گا کہ تم بھی تو اپنے بعد میں آنیوالوں کے لئے

بری مثال قائم کر گئے ۔ وہ تمہارے اسلاف تھے تو تم بعد میں آنیوالوں کے اسلاف تھے ۔ یہی جواب یہ اسلاف اپنے اخلاف کو دیں گے کہ فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ (۷/۳۹) تمہیں ہم پر کیا فوقیت حاصل ہے جو تم ہمارے لئے دہرا عذاب اور اور اپنے لئے اکہرا عذاب مانگتے ہو ! ہم غلط روش پر چلتے تھے تو تم نے کونسا اپنی آنکھوں سے کام لے کر صحیح راستہ اختیار کر لیا تھا ؟ اس لئے تم اپنے کئے کا پھل پاؤ ، ہمیں مطعون کرنے سے کیا حاصل ہے ؟

تم نے دیکھا سلیم ! قرآن نے اپنے دلکش اور حسین انداز میں کتنی عظیم حقیقت کو واضح کر دیا ہے ۔ جو قومیں اپنی عقل و فکر سے کام لینا چھوڑ کر اسلاف کی تقلید کا مسلک اختیار کر لیتی ہیں ، ان میں غلط روی کا ایک ایسا چکر (Vicious Circle) قائم ہو جاتا ہے جس سے وہ باہر نکل ہی نہیں سکتیں ۔ ہر نسل ، اپنے پیشرووں کے نقوش قدم پر چل کر تباہ ہوتی ہے ، اور اپنے نقوش قدم بعد میں آنے والوں کے لئے چھوڑ جاتی ہے تاکہ وہ بھی انکی طرح تباہی اور بربادی کے جنہم میں گریں ۔ دو چار نسلوں کے بعد ، یہی چیز بطور دلیل پیش کر دی جاتی ہے کہ اگر یہ روش غلط ہوتی تو ہمارے اسلاف صدیوں سے اس پر گامزن کیوں رہتے ؟ اقوام سابقہ میں جب حالت یہاں تک پہنچ جاتی تھی تو خدا کی طرف سے ایک نیا نبی آ جاتا تھا جو انہیں ، اس چکر (Vicious Circle) سے نکال کر ، سیدھے راستے پر لے جانے کی کوشش کرتا تھا ۔ نئے نبی کی ضرورت اس لئے ہوتی تھی کہ وہ لوگ اپنے سابقہ نبی کی کتاب کو بھی مسخ کر دیتے تھے ۔ اس طرح ان کے پاس کوئی ایسا معیار نہیں رہتا تھا جس پر وہ اپنی روش کو از خود پرکھ سکتے ۔ لیکن رسول اللہص کے بعد کوئی

نبی نہیں آئیگا۔ حضورص کی اُمت کے پاس انکی کتاب اپنی اصلی شکل میں محفوظ ہے اور ہمیشہ محفوظ رہیگی ۔ اسلئے انہیں اس چکر سے از خود ہی نکلنا ہوگا۔ اسکا طریقہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم ، اندھوں کی طرح ایک دوسرے کی لکڑی پکڑ کر چلتے رہنے کی بجائے ، کھڑے ہوکر دیکھیں کہ ہم جس روش پر جا رہے ہیں ، خدا کی کتاب اس کے متعلق کیا کہتی ہے ۔ اس چکر سے نکلنے کا یہی راستہ ہے ۔ اگر ہم سے پہلے کسی دور میں ایسا ہو جاتا تو ہم آج اس غلط راستے پر نہ ہوتے ۔ اگر انہوں نے ایسا نہیں کیا تو ہمارے دور میں ایسا ہو جانا چاہئیے تاکہ ہم بھی صحیح راستہ پر چل سکیں اور ہمارے آنے والی نسلیں بھی غلط راستے کو اپنے لئے سند نہ بنا سکیں ۔ اگر ہم نے بھی ایسا نہ کیا تو ہم خود بھی موجودہ جہنم سے نہیں نکل سکیں گے اور آنے والی نسلوں کی غلط روی کے بھی ذمہ دار ہوں گے ۔ کیونکہ ہر دور کی غلط روی ، آنے والوں کے لئے سند میں اضافہ کر دیتی ہے ۔ تم نے (Steel Works) کے کارخانے میں دیکھا تھا کہ جب انجن کو شروع میں (Start) کرتے تھے تو اس کے لئے کافی زور لگانا پڑتا تھا ۔ لیکن اس کے بعد ، اس کا (Fly Wheel) خود اپنے زور دروں (Momentum) سے تیزی پکڑ لیتا تھا اور اس طرح اس کا ہر چکر ، آنے والے چکر کے لئے تقویت کا موجب بن جاتا تھا ۔ یہی کیفیت قوموں کی نفسیات کی ہے ۔ شروع میں غلط راستے پر چلنے کے لئے کچھ دقت ہوتی ہے ۔ لیکن بعد میں ، گذشتہ نسل کی روش ، آنیوالی نسل کے لئے (Momentum) کا کام دیتی ہے ۔ اس چکر کو ختم کرنے کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ کسی دور کے مسلمان کھڑے ہو کر سوچیں کہ ہم کس راستے پر جا رہے ہیں ۔

سلیم! جب اس کام کو کسی دور نے کرنا ہے تو وہ ہمارا ہی دور کیوں نہ ہو؟ میں جانتا ہوں (اور خود میری زندگی کا تجربہ اس پر شاہد ہے) کہ قدامت

پرست طبقہ کی طرف سے اس آواز کی سخت مخالفت ہوگی ۔ اس طبقہ میں بیشتر لوگ ایسے ہوتے ہیں جن میں فکر و تدبر کی صلاحیت ہی نہیں ہوتی ۔ وہ اپنی موجودہ روش کو ، جسے انہوں نے اسلاف کے اتباع میں اختیار کئے ہوتا ہے ، '' نیک نیتی '' سے صحیح روش سمجھتے ہیں ۔ اس لئے اس روش سے ذرا سا بھی ادھر آدھر ہٹنا ان کے نزدیک جنت کی راہ کو چھوڑ کر جنہم کی طرف چلے جانے کے مرادف ہوتا ہے ۔ (لیکن یہ ظاہر ہے کہ کتنی غلط باتیں ہیں جنہیں لوگ نہایت نیک نیتی سے صحیح سمجھتے ہیں ۔ اس لئے ''نیک نیتی'' اس امر کی دلیل نہیں ہو جاتی کہ وہ بات صحیح بھی ہے) ۔ لیکن ان میں کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو جانتے ہیں کہ یہ روش غلط ہے ۔ لیکن چونکہ اس سے ان کے مفاد وابستہ ہوتے ہیں ـــــ اس سے عوام میں نہایت آسانی سے مقبولیت (Popularity) حاصل ہوتی ہے اور دوکانداری کو فروغ ـــــ اس لئے وہ ہر اس آواز کی مخالفت کرتے ہیں جو اس راستے پر تنقیدی نگاہ ڈالنے کی دعوت دے ۔ وہ اس مخالفت میں نہایت اوچھے حربے اختیار کرتے اور کمینے ہتھیاروں پر اتر آتے ہیں ۔

لہذا اس آواز کے لئے بڑی جرأت کی ضرورت ہوتی ہے ۔ اب سوال یہی ہے کہ کیا ہم مقبولیت عامہ کی نگاہ فریب جاذبیتوں اور مخالفت کرنے والوں کی ضرر رسانیوں کے احساس سے ، اس آواز کو جیتے جی اپنے سینے میں اور مرنے کے بعد پھر مٹی میں دبا دیں یا ان تمام بدنامیوں اور نکوھشوں کے علی الرغم ، آنکھیں بند کرکے چلنے والوں سے حضور رسالتمآبؐ کے اتباع میں للکار کر کہیں کہ :

اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ۚ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى

> وَ فُرَادٰی ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا۔ (۳۴/۴۶)
>
> میں تم سے فقط ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ اور وہ یہ کہ تم خدا کے لئے دو دو، ایک ایک، کرکے کھڑے ہو جاؤ۔ اور پھر سوچو!

اگر اس انبوہ کثیر میں سے کچھ لوگ بھی اس آواز پر کھڑے ہو گئے تو سمجھ لو سلیم! کہ اس سے آدھا کام ہو گیا۔ اس لئے کہ جو شخص اندھا دھند چلے جانے کے بجائے، کسی پکارنے والے کی آواز پر رک جائے، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنی روش پر نظر ثانی کے لئے تیار ہے (یا اُسے کم از کم اپنی موجودہ روش کے بارے میں کچھ تردد ضرور لاحق ہو گیا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ رکتا ہی کیوں) اور اس کے بعد اگر اس نے قرآن کی روشنی میں سوچنا شروع کر دیا، تو پھر کام بن گیا۔ ہو نہیں سکتا کہ کوئی شخص قرآن کی روشنی میں غور و فکر کرے اور صحیح راستہ اس کے سامنے نہ آ جائے اور وہ صحیح راستہ اس کے سوا اور کونسا ہے کہ انسان آنکھیں بند کرکے دوسروں کے پیچھے پیچھے نہ چلتا جائے بلکہ، وحی کی روشنی میں خود اپنی آنکھوں سے کام لے کر، خدا کے بتائے ہوئے صراط مستقیم پر چلے۔ یہی مسلک قرآن کا بتایا ہوا ہے جس پر نبی اکرمؐ گامزن تھے ؎

چه خوش بودے اگر مردِ نکوپے ز بندِ پاستاں آزاد رفتے
اگر تقلید بودے شیوهٔ خوب پیمبرؐ هم رهِ اجداد رفتے

والسلام
پرویز

جون ۱۹۵۷ء

آنتیسواں خط

(فرقے کیسے مٹ سکتے ہیں ؟)

ہاں سلیم ! سوال بڑا پریشان کن ہے ۔ لیکن دیکھو کہ قرآن اس کا جواب کتنا اطمینان بخش دیتا ہے ۔ غور سے سنو ۔

۱۔ قرآن نے دین کو مکمل کر دیا اور اس کے بعد مسلمانوں سے کہہ دیا کہ تمہارا شعار زندگی اب یہ ہے کہ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَلَا تَفَرَّقُوْا (۳/۱۰۲) ۔ تم سب کے سب مل کر اس ضابطۂ خداوندی کو محکم طور پر تھامے رہو اور ٹکڑے ٹکڑے مت ہو جاؤ ۔ یہ ہے دین کا اصل الاصول ۔ اسی میں تمہاری فلاح و بہبود کا راز مضمر ہے اور اسی سے خود دین کا (یعنی اس نظام زندگی کا جو تمہارے لئے تجویز کیا گیا ہے) قیام ، تمکن اور استحکام وابستہ ہے ۔ اس آیۂ جلیلہ کے مختلف الفاظ پر غور کرو ، حقیقت اُبھر کر سامنے آتی جائے گی ۔ سب سے پہلے یہ کہ حَبْلِ اللّٰهِ ایک ہے ، ایک سے زیادہ نہیں ۔ دین کا ضابطہ قرآن ہے اور یہی وہ عُرْوَةُ الْوُثْقٰی (۲/۲۵۶) ، وہ محکم سہارا ہے جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا ۔

(لَا انْفِصَامَ لَهَا) کبھی دغا نہیں دے سکتا۔ جو ہر زمانے میں، ہر مقام پر، تمام نوعِ انسان کے لئے واحد اور مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ ذہن انسانی کے وضع کردہ نظام زندگی، زمانے کے تقاضوں کے بدلنے سے، ٹوٹتے اور بنتے، بنتے اور ٹوٹتے رہتے ہیں—زماں زماں شکند آنچہ می تراشد عقل—لیکن یہ ضابطۂ خداوندی زمان اور مکان کی نسبتوں سے بلند اور حدود و قیود کے امتیازات سے ماوراء ہے۔ اس کے اصول، زندگی کی وہ مستقل اقدار ہیں جن میں کبھی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ (۱۰/۶۴)۔

(۲) وَاعْتَصِمُوْا میں جمع کے صیغے (تم سب) اور جَمِيْعًا کی تخصیص سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ دین، خدا اور بندے کے درمیان، انفرادی تعلق کا نام نہیں کہ ہر شخص اپنی اپنی جگہ بیٹھے، اپنے اپنے انداز سے "گیان دھیان" کے ذریعے خدا سے لو لگا لے اور اس طرح اپنی "مکتی" (نجات) کا سامان پیدا کر لے۔ دین، اجتماعی نظام زندگی کا نام ہے جس میں تمام افراد ایک ناقابل تقسیم وحدت کی حیثیت سے رہتے اور ایک طریق پر چلتے ہیں۔ نیز ان کی وجۂ جامعیت بھی دین کا اشتراک ہے۔ اسی سے یہ سب ایک امت بنتے ہیں۔ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا (۲/۱۴۳)۔

۳۔ جَمِيْعًا نے اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا ہے کہ اس دین کے مطابق، زندگی اسی صورت میں بسر ہو سکتی ہے جب پوری کی پوری امت ایک ہی طریق پر چل رہی ہو۔ اگر اس میں مختلف گروہ پیدا ہو گئے اور ہر گروہ نے ایک جداگانہ طریق کی پیروی اختیار کر لی، تو یہ دین باقی نہیں رہ سکتا۔ لَا تَفَرَّقُوْا کے حکم نے اس حقیقت کو اور بھی نمایاں کر دیا۔

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا میں امر (حکم) تھا ۔ یعنی یہ کرو۔ اور لَا تَفَرَّقُوْا میں نہی ہے (کہ یوں نہ کرو) ۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جس بات کو امر اور نہی ، مثبت اور منفی کی حدوں میں گھیر کر بیان کیا جائے ، اس میں نہ کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی رہتی ہے ، نہ مزید تاکید و تائید کی ضرورت۔ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ایک جامع اصول زندگی ہے جس میں کسی اختلاف یا اَستثناء کی قطعاً گنجائش نہیں ۔

۲- قرآن نے یہ بھی بتا دیا ہے کہ یہ کوئی نیا اصول زندگی نہیں جو تمہیں پہلی بار دیا جا رہا ہے - یہی اصول ہے جو پہلے دن سے آج تک ہر نبی کی وساطت سے دیا جا رہا ہے ۔ شَرَعَ لَکُمْ مِّنَ الدِّیْنِ مَا وَصّٰی بِہٖ نُوْحًا وَّالَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ وَمَا وَصَّیْنَا بِہٖٓ اِبْرٰھِیْمَ وَمُوْسٰی وَعِیْسٰٓی ۔ اللہ نے اسی دین (نظام زندگی) کا راستہ تمہارے سامنے کھول دیا ہے جس کا حکم اس نے نوح کو دیا تھا ۔ وہی دین اب تمہاری طرف وحی کیا جاتا ہے۔ اسی کا حکم ابراهیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو دیا گیا تھا ۔

یہ حکم کیا تھا ؟ اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْہِ (۴۲/۱۳) تم سب نے اسی دین کو قائم کرنا اور اس میں کسی قسم کا تفرقہ نہ پیدا کر دینا ۔ یہی وہ دین کی وحدت اورتفرقہ سے اجتناب تھا ، جس سے تمام انبیائے کرامؑ (زمان اور مکان کے اس قدر بُعد اور اختلاف کے باوجود) ایک ”اُمت واحدہ“ بن گئے تھے ۔ وَاِنَّ ھٰذِہٖٓ اُمَّتُکُمْ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً وَّاَنَا

رَبُّکُمْ فَاتَّقُوْنِ (۲۳/۵۲ ، ۲۱/۹۲) اے گروہ انبیاء ! یہ تمہاری جماعت اُمت واحدہ ہے ۔ تمہاری وجۂ جامعیت یہ ہے کہ میں تم سب کا نشو و نما دینے والا ہوں ۔ للہذا تم نے صرف میرے قوانین کی نگہداشت کرنا ۔ یہاں اس حقیقت کو نمایاں کیا گیا ہے کہ اُمت کی وحدت، ضابطۂ زندگی اور قانون حیات کی وحدت پر مبنی ہوتی ہے ۔ جب تک دین ایک رہے گا ، اُمت بھی ایک رہے گی ۔ یا جب تک اُمت ایک ہوگی ، اس کا دین بھی ایک ہوگا ۔ جب اُمت میں تفرقہ پڑ جائے گا تو دین بھی ایک نہیں رہے گا ، الگ الگ ہو جائے گا ۔ اور چونکہ دین ایک نا قابل تقسیم وحدت ہے ، اس لئے ” الگ الگ دین “ کے معنی یہ ہیں کہ اصل دین باقی نہیں رہا ۔

۳۔ کسی اُمت (قوم ، جماعت) میں تفرقہ پیدا کر دینا کتنا بڑا جرم ہے اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگاؤ جسے خدا نے سورۂ طٰہٰ میں بیان کیا ہے ۔ حضرت موسیٰؑ کچھ دنوں کے لئے باہر تشریف لے جاتے ہیں اور بنی اسرائیل کو حضرت ہارونؑ کی زیر نگرانی چھوڑ جاتے ہیں ۔ جب آپ واپس آتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ قوم نے گوسالہ پرستی اختیار کر رکھی ہے ۔ اس کا جو اثر حضرت موسیٰ کی طبیعت پر ہو سکتا تھا، ظاہر ہے ۔ وہ غصے سے لال پیلے ہو جاتے ہیں اور اپنے بھائی سے پوچھتے ہیں کہ مَا مَنَعَکَ اِذْ رَاَیْتَھُمْ ضَلُّوْا (۲۰/۹۲) جب تم نے دیکھا تھا کہ یہ لوگ گمراہ ہو رہے ہیں ، تو وہ کونسی بات تھی جس کی وجہ سے تم نے انہیں (اس روش سے) روکا نہیں ؟ اب سنو کہ حضرت ہارونؑ اس کا کیا جواب دیتے ہیں ۔ یاد رہے کہ حضرت ہارونؑ بھی خدا کے رسول ہیں ، عام آدمی نہیں ہیں ۔ وہ جواب میں کہتے ہیں کہ اِنِّیْ خَشِیْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَیْنَ بَنِیْ اِسْرَاۗئِیْلَ

وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِیْ (۲۰/۹۴) ”مجھے یه اندیشه گذرا که تو آ کر یه که دے که (اے هارونؑ) تو نے بنی اسرائیل میں تفرقه ڈال دیا اور میرے فیصله کا بھی انتظار نه کیا؟ تم نے سوچا سلیم! حضرت هارونؑ نے کیا کہا؟ انہوں نے کہا که اگر یه لوگ، جہالت کی وجه سے، کچھ وقت کے لئے مورتی کی پوجا کرنے لگ گئے تھے، تو میرے نزدیک یه اتنا بڑا جرم نہیں تھا جتنا بڑا جرم ان میں تفرقه پیدا کر دینا تھا۔ یه جواب ایک نبی کی طرف سے دیا جاتا هے اور دوسرا نبی اس سے مطمئن هو جاتا هے۔ [جیسا که ذرا آگے چل کر بتایا جائے گا، قرآن نے خود فرقه بندی (تفرقه) کو شرک قرار دیا هے]۔ اب ظاهر هے که گوساله پرستی بھی شرک تھی اور تفرقه انگیزی بھی شرک۔ لیکن تفرقه انگیزی کا شرک ایسا شدید اور سنگین تھا که اس سے بچنے کے لئے گوساله پرستی کے شرک کو روا رکھا جا سکتا تھا۔ چنانچه قرآن اس پر شاهد هے که گوساله پرستی کے جرم کا ازاله توبه سے هوگیا۔ فَتَابَ عَلَيْكُمْ إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ (۲/۵۴)۔ لیکن جب انہوں نے باهمی تفرقه پیدا کر لیا اور اس طرح اُمت واحده کی بجائے مختلف گروهوں اور پارٹیوں میں بٹ گئے وَقَطَّعْنٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اُمَمًا (۷/۱۶۸)، تو ان پر تباهی اور بربادی، ذلت و خواری، محرومی و محتاجی کا ایسا عذاب مسلط هو گیا جو هر جگه سائے کی طرح ان کے پیچھے لگ رهتا تھا۔ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْا (۳/۱۱۱)۔

۴۔ جیسا که اوپر کہا جا چکا هے، هر رسول کا پیغام یه تھا که ”دین کو قائم کرو اور باهمی تفرقه مت پیدا کرو“۔ هر رسول اس پیغام کے

ذریعے ، ایک جماعت ، ایک امت متشکل کر کے جاتا ۔ اس کی امت کچھ وقت تک تو متحد رہتی لیکن اس کے بعد اس میں گروہ بندیاں اور فرقہ سازیاں شروع ہو جاتیں ۔ یہ کیوں ہوتا ؟ قرآن اس کی وجہ یہ بتاتا ہے کہ وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ (۴۲/۱۴ ، ۴۵/۱۷) یعنی خدا کی طرف سے اَلْعِلْمُ (وحی) آ جانے کے بعد ، جس کا مقصد تمام اختلافات کو مٹا دینا ہے ، باہمی تفرقہ کی گنجائش ہی نہیں رہتی ۔ لیکن اس وحی کے وارث ، باہمی ضد اور ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے اور ایک دوسرے پر چڑھ دوڑنے کے جذبہ کی وجہ سے مختلف فرقے بنا لیتے ۔ یعنی اس گروہ بندی اور فرقہ سازی کی وجہ یہ نہیں تھی کہ انہیں دین کی کسی حقیقت کے سمجھنے میں غلطی لگ جاتی تھی یا کوئی شق مشتبہ اور مبہم رہ جاتی تھی ۔ خدا کی طرف سے دئیے ہوئے علم میں اشتباہ و ابہام کا کیا کام ؟ یہ فرقہ سازی محض ہوس اقتدار کی تسکین کے لئے ہوتی تھی ۔ ان میں سے جن لوگوں کے دل میں لیڈر بننے کا شوق چراتا وہ اپنا فرقہ الگ بنا لیتے ۔ پھر ہر فرقہ دوسرے فرقہ سے آگے نکل جاتا اور اس پر غالب آ جانا چاہتا ۔ اس سے باہمی کشمکش اور سرپھٹول شروع ہو جاتی اور یوں اس امت واحدہ کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ۔ اور اس کے ساتھ ہی دین بھی اس تشتت و افتراق کے پردوں میں گم ہو جاتا ۔ اس سے یہ حقیقت بھی ہمارے سامنے آ گئی کہ فرقہ بندی علم و بصیرت اور دلائل و براہین کی بنا پر وجود میں نہیں آتی ۔ اس کی بنیاد جذبات پر ہوتی ہے ۔ یہ الگ بات ہے کہ ہر فرقہ کے لوگ اپنے فرقہ کے بر سر حق ہونے کے ثبوت میں دلائل پیش کرتے دکھائی دیتے ہیں ۔ اور وہ کونسا جذباتی فیصلہ ہے جس کی تائید میں عقل فسوں ساز دلائل مہیا نہیں کر دیتی !

۵- نزول قرآن کے وقت دنیائے مذاهب کی یہی کیفیت تھی - (واضح رہے کہ دین تو ایک هی هوتا هے لیکن جب فرقه بندی میں اس کے ٹکڑے هو جاتے هیں تو انهیں مذاهب کہا جاتا هے) قرآن نے اپنے نزول کا مقصد یه بتایا هے که وه ان تمام اختلافات کو مٹا کر، خدا کا دین قائم کرے گا اور فرقوں اور گروهوں میں بٹے هوئے انسانوں کو ایک اُمت واحده میں تبدیل کر دے گا- وَمَآ أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ إِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوْا فِيْهِ - (اے رسول) تجھ پر یه کتاب صرف اس لئے نازل کی گئی هے که جن امور میں یه لوگ باهمی اختلاف کرتے هیں، تو انهیں کھول کر بیان کر دے- اس کے بعد، جو لوگ اس دین کی صداقت کو تسلیم کر لیں گے، یه کتاب انهیں زندگی کے صحیح راستے کی طرف راه نمائی کرے گی اور اس طرح ان کے لئے موجب رحمت بن جائے گی - وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (۱۶/۶۴) یعنی تبیان حقیقت تو تمام انسانوں کے لئے یکساں هوگی لیکن هدایت اور رحمت صرف انهی کے لئے هوگی جو اس کی صداقت پر ایمان لے آئیں گے -

اس سے یه حقیقت نکھر کر سامنے آ گئی که قرآن کا مقصد وحید اختلافات کو مٹا کر دین کی وحدت کا قیام هے اور اختلافات کا مٹ جانا خدا کی رحمت هے- اسی نقطه کی وضاحت دوسرے مقام پر ان الفاظ میں کر دی گئی که وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً - اگر یه مقصود هوتا که تمام انسانوں کو مجبور کرکے ایک راستے پر چلایا جائے تو خدا کے لئے ایسا کرنا کچھ مشکل نہیں تھا- اس نے جس طرح دیگر حیوانات کو اس انداز سے پیدا کیا هے که هر نوع کا فرد اپنی نوع اور جماعت کے ساتھ رهتا هے، اس سے کبھی

اختلاف نہیں کرتا (مثلاً تمام بھیڑیں ایک نہج سے زندگی گذارتی ہیں اور تمام شیر ایک ہی راستے پر چلتے ہیں) اسی طرح وہ انسانوں کو بھی جبلّی طور پر ایک ہی راستے پر چلنے پر مجبور کر دیتا ۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا ۔ اس نے انسانوں کو فکر و عمل کی آزادی دے رکھی ہے ۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ چاہیں تو اتحاد اور اتفاق کی زندگی بسر کریں اور چاہیں تو تشتت و افتراق پیدا کر لیں ۔ لیکن اس کے ساتھ ہی انہیں بتا دیا گیا ہے کہ تشتت و افتراق کی زندگی عذاب کی زندگی ہے اور ” ایک اُمت “ بن کر رہنے کی زندگی رحمت اور سعادت کی زندگی ۔ لیکن یہ وحدت اسی صورت میں حاصل ہو سکتی اور قائم رہ سکتی ہے کہ تم اپنے دل کی رضامندی سے اور علٰی وجہِ الْبصیرت خدا کی کتاب کو اپنا ضابطۂ حیات بنا لو ۔ اگر تم نے ایسا کر لیا تو تم نے زندگی کے مقصد کو پا لیا ۔ چنانچہ جو آیت اُوپر درج کی گئی ہے اس کا اگلا حصہ یہ ہے کہ وَلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ۔ ان لوگوں کے سوا جو وحی کے مطابق زندگی بسر کرنے سے خدا کی رحمت کے سزاوار بن جائیں ، باقی سب ایک دوسرے سے اختلاف کرتے رہیں گے ۔ حالانکہ انہیں پیدا اس لئے کیا گیا تھا کہ یہ (اپنی رضا اور رغبت سے) اُمت واحدہ بن کر رہیں وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ (۱۱ / ۱۱۸-۱۹) ۔

اس آیت سے یہ حقیقت سامنے آ گئی کہ :

(۱) مقصود تخلیق انسانی یہ ہے کہ تمام انسان ایک اُمت (ایک عالمگیر برادری) بن کر رہیں اور باہمی اختلافات پیدا نہ کریں ۔

(۲) یہ اختلافات صرف وحئی خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے سے مٹ سکیں گے ۔ یہ زندگی رحمت کی زندگی ہے ۔

(٣) جو لوگ وحی کے مطابق زندگی بسر نہیں کریں گے ان کے اختلافات مٹ نہیں سکیں گے ۔ یہ عذاب کی زندگی ہوگی ۔

ان حقائق کی وضاحت کے بعد ، مسلمانوں سے کہ دیا گیا کہ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ ۔ دیکھنا ! تم نے بھی کہیں ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے ، خدا کی طرف سے واضح حقائق مل جانے کے بعد، فرقے بنا لئے اور آپس میں اختلافات کرنے لگ گئے وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ (٣/١٠٤) ۔ یہ لوگ ، جو فرقوں میں بٹ جاتے ہیں اور آپس میں اختلاف کرنے لگ جاتے ہیں ، ان پر سخت عذاب مسلط کر دیا جاتا ہے ۔ اس کے بعد کی دو آیات میں قرآن نے بتایا ہے کہ اختلاف اور تفرقہ کی زندگی در حقیقت ، ایمان کے بعد کفر کی زندگی ہے اور رو سیاہی کا موجب ۔ اس کے برعکس ، وحدت و ائتلاف کی زندگی سے سرخروئی نصیب ہوتی ہے اور خدا کی رحمت ۔ يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ ۔ فَأَمَّا الَّذِينَ اسْوَدَّتْ وُجُوهُهُمْ ۔ أَكَفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ ۔ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ۔ وَأَمَّا الَّذِينَ ابْيَضَّتْ وُجُوهُهُمْ فَفِي رَحْمَةِ اللَّهِ ۔ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ (٣/١٠٥-١٠٦) ۔

ان آیات سے بھی ظاہر ہے کہ فرقہ بندی اور باہمی اختلافات کی زندگی لعنت اور عذاب کی زندگی ہے اور خدا کی رحمت اُن پر ہوتی ہے جو ایک اُمت بن کر رہتے اور اختلافات سے بچتے ہیں ۔

ضمناً یہ بھی دیکھو ! کہ قرآن نے اختلاف اور افتراق کا نتیجہ عذاب عظیم

بتایا ہے۔ ''عظیم'' کا لفظ جس باب سے آیا ہے اس میں دوام اور استمرار کا پہلو مضمر ہوتا ہے۔ یعنی یہ عذاب وقتی اور ہنگامی نہیں ہوگا بلکہ استمراری اور دوامی ہوگا۔ جب تک فرقہ بندی رہے گی یہ عذاب بھی مسلط رہے گا۔

۶۔ قرآن نے اس سے بھی آگے بڑھ کر، مسلمانوں سے کہ دیا کہ وَلَا تَكُونُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ۔ دیکھنا! کہیں تم توحید پرست ہو جانے کے بعد پھر مشرک نہ بن جانا!

یہ چیز بڑی تحیّرانگیز اور (بظاہر) ناقابل فہم تھی کہ مسلمان، ایک خدا پر ایمان لانے کے بعد، مشرک کس طرح بن سکتے ہیں؟ کیا یہ بتوں کو پوجنا شروع کر دیں گے؟ قران کہتا ہے کہ نہیں، شرک بتوں ہی کی پرستش نہیں۔ جیسا کہ ہم بنی اسرائیل کی گوسالہ پرستی کے قصے میں دیکھ آئے ہیں، بت پرستی تو ''شرک خفی'' (کم درجہ کا شرک) ہے۔ ''شرک جلی'' اور ہے۔ اس کی وضاحت میں بتا دیا گیا کہ مشرک ہو جانے سے مطلب یہ ہے کہ وَلَا تَكُونُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا۔ یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈال دیا اور فرقے بن گئے۔ اس فرقہ بندی سے ہوتا یہ ہے کہ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ (۳۰ ـ ۳۱ - ۳۲)۔ ہر فرقہ اس خیال میں مگن رہتا ہے کہ میں حق پر ہوں اور باقی فرقے باطل پر ہیں۔ فرقہ پرستی کی یہ ایسی نفسیات ہے جس کا مشاہدہ ہم ہر وقت کر سکتے ہیں۔ اس آیت میں كُلُّ حِزْبٍ کے ٹکڑے کو خاص طور پر ذہن میں رکھو کیونکہ یہ ایک اہم حقیقت کا پردہ کشا ہے جس کا ذکر آگے چل کر آئے گا۔

بہر حال ، قرآن نے اُمت واحدہ سے کھلے کھلے الفاظ میں کہہ دیا کہ اگر تم نے دین میں فرقے پیدا کر لئے تو یہ توحید نہیں ، شرک ہوگا اور کوئی فرقہ یہ کہہ کر اس سے بری الذمہ نہیں ہو سکے گا کہ ہم اصلی اور حقیقی اسلام پر قائم ہیں اور دوسرے فرقے باطل پر ہیں ۔ اسی بنا پر رسول اللہؐ سے کہہ دیا گیا کہ اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ وَ کَانُوْا شِیَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِیْ شَیْءٍ (٦/١٦٠) ۔ جو لوگ اپنے دین میں تفرقہ پیدا کر دیں اور ایک فرقہ بن کر بیٹھ جائیں ، اے رسولؐ ! تجھے ان سے کوئی تعلق نہیں ۔ یعنی فرقے بنانے والوں سے نہ خدا کا کوئی تعلق ہے (کیونکہ وہ توحید پرست نہیں رہتے ، مشرک ہو جاتے ہیں) اور نہ ہی خدا کے رسولؐ کا ان سے کوئی واسطہ ، کیونکہ رسولؐ نے تو ایک دین قائم کیا اور ایک اُمت بنائی تھی ۔ یہ الگ اُمت بنا لینے والے ، در حقیقت ایک متوازی دین (نظام زندگی) کے حامل ہو گئے اس لئے انہیں اس رسول سے کیا تعلق ؟

اس مقام پر ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ رسول اللہؐ نے ایک اُمت بنائی جو دین حقّہ پر قائم تھی ۔ اس اُمت میں سے ایک فرقہ نکل کر الگ ہو گیا ۔ اب ظاہر ہے کہ یہ نیا فرقہ شرک کے جرم کا مرتکب اور باطل پرست ہے ۔ بقیہ اُمت جو اپنے مسلک پر قائم ہے ، اُسے ایک فرقہ ٹھہرا کر اسی جرم کا مرتکب قرار دے دینا تو کسی صورت میں درست نہیں ہو سکتا ؟ یہ اعتراض اہم ہے ، لیکن اس کا جواب یا اس مشکل کا حل ذرا آگے چل کر سامنے آئے گا ۔

۷۔ سورۂ روم کی جس آیت میں کہا گیا ہے کہ وَ لَا تَکُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ ..... اس سے پہلے ہے وَ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ ۔ صلٰوۃ

کو قائم رکھو اور مشرکین میں سے نہ ہو جاؤ۔ یعنی ان میں سے نہ ہو جاؤ جنہوں نے دین میں فرقے پیدا کر دئیے۔ اس سے ظاہر ہے کہ دین میں نظام صلوٰۃ وہ بنیادی حقیقت ہے کہ جب تک یہ قائم رہے، فرقے نہیں بن سکتے - یہی وجہ ہے جو قرآن نے کہا ہے کہ جب انبیاء کے جانے کے بعد ان کی اُمت فرقوں میں بٹ جاتی ہے تو وہ حقیقت صلوٰۃ کو ضائع کر دیتی ہے اور اپنے اپنے جذبات کے پیچھے لگ جاتی ہے - فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ (۱۹/۵۹) - اس کی زندہ شہادت خود ہماری اپنی حالت ہے۔ ہماری کیفیت یہ ہے کہ وہی صلوٰۃ جسے قرآن نے وحدت اُمت کا محکم ذریعہ بتایا تھا، آج فرقوں کی تمیز و تفریق کی علامت بن گئی ہے - چنانچہ اگر تم نے دیکھنا ہو کہ فلاں شخص کس فرقے سے متعلق ہے تو یہ دیکھو کہ وہ نماز کس طرح پڑھتا ہے ؟ (یہی وجہ ہے کہ جب طلوع اسلام کے خلاف اس کے مخالفین نے یہ پروپیگنڈہ شروع کیا کہ یہ ایک نیا فرقہ ہے تو انہیں اپنے اس دعوے کی تائید میں یہ الزام بھی تراشنا پڑا کہ یہ لوگ تین وقت کی نماز پڑھتے ہیں اور ایک رکعت میں ایک ہی سجدہ ضروری سمجھتے ہیں - گویا انہوں نے ثابت یہ کرنا چاہا کہ چونکہ ان کی نماز اور فرقوں سے مختلف ہے اس لئے یہ ایک نیا فرقہ ہے - حالانکہ یہ سب بہتان تراشی اور افترا پردازی تھی - نہ طلوع اسلام کوئی الگ نماز تجویز کرتا ہے، نہ الگ فرقہ بناتا ہے - جس کے نزدیک فرقہ سازی شرک ہو، وہ بھلا خود فرقہ کیسے بن جائے گا ؟) -

بہر حال، یہ تو جملۂ معترضہ تھا - میں کہہ یہ رہا تھا کہ قرآن نے صلوٰۃ کو امت واحدہ کے لئے وجۂ جامعیت قرار دیا تھا - یہی وجہ تھی کہ جب خود رسول اللہ ص کے زمانے میں بعض تفرقہ انگیزوں نے ایک نئی مسجد تعمیر

کی تو قرآن نے جس شدت سے اس کی مخالفت کی اس کا اندازہ سورۂ توبہ کی متعلقہ آیات سے لگ سکتا ہے۔ سنو! اور غور سے سنو!! کہ قرآن اس باب میں کیا کہتا ہے وَالَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا۔ جن لوگوں نے اس غرض سے مسجد تعمیر کی کہ اس سے ملت اسلامیہ اور خود دین کو نقصان پہنچایا جائے۔ وَكُفْرًا۔ اور کفر کی حمایت کی جائے یا کفر کی روش اختیار کی جائے۔ وَتَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ یعنی اس غرض سے کہ مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کیا جائے۔ تم اس مسجد کو مسجد سمجھتے ہو ؟ یہ مسجد نہیں۔ اِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ۔ یہ وہ کمین گہ ہے جس میں بیٹھ کر وہ شخص جو اس سے پہلے خدا اور رسول (نظام خداوندی) کا دشمن تھا، ملت پر تیر اندازی کریگا۔ یعنی یہ مسجد نہیں۔ یہ وہ قلعہ ہے جس کے اندر خدا اور رسول کے دشمن پناہ لے کر دین کے قصر مشید کو منہدم کرنے کی مذموم کوشش کریں گے۔ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَا اِلَّا الْحُسْنٰى۔ یہ قسمیں کھا کھا کر کہیں گے کہ اس مسجد کی تعمیر سے ہمارا ارادہ بجز بھلائی کے اور کچھ نہیں۔ ہم دین کی تخریب تھوڑا چاہتے ہیں ؟ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ۔ تم ان کی باتوں میں نہ آ جانا۔ خدا گواہ ہے کہ یہ یکسر جھوٹے ہیں۔ لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا۔ اے رسول! تم نے اس مسجد میں ایک قدم بھی نہ رکھنا۔ یہ مسجد تو یوں سمجھو کہ دوزخ کے کنارے پر کھڑی ہے۔ جس نے اسے بنایا ہے اور جو اس میں داخل ہوگا، یہ ان سب کو لے کر جہنم کے عمیق گڑھے میں جا گریگی (۹/۱۰۷-۱۰۹) چنانچہ تاریخ اسکی شہادت دیتی ہے کہ رسول اللہ ص نے صحابہ رض کو بھیج کر اس مسجد کو منہدم

کرا دیا۔

اس واقع سے تم اندازہ لگاؤ سلیم! کہ اسلام میں فرقہ بندی کس قدر شدید اور سنگین جرم ہے، کہ (اور تو اور) اگر کسی مسجد کی تعمیر سے بھی فرقہ بندی کی جھلک پڑتی ہے تو اس مسجد کا گرا دینا ضروری ہو جاتا ہے۔ مسجد گرائی جا سکتی ہے لیکن فرقہ کی طرح نہیں پڑنے دی جا سکتی۔ کیونکہ فرقہ بندی بہ نص صریح شرک ہے۔ اور شرک جلی۔

———:o:———

۸- یہ تھیں وہ کھلی کھلی ہدایات جو وحدت امت کے سلسلہ میں مسلمانوں کو دی گئیں۔ انہی ہدایات کی بنا پر نبی اکرمؐ نے اُمت واحدہ کی تشکیل فرمائی۔ یہ وہ اُمت تھی جس کا نظام ایک تھا۔ ضابطۂ زندگی ایک تھا۔ مرکز ایک تھا۔ دین ایک تھا۔ راستہ ایک تھا۔ نصب العین ایک تھا۔ ان میں نہ کسی قسم کا اختلاف تھا نہ افتراق۔ یہی تھی وہ جماعت جس کے متعلق خدا نے کہا ہے کہ فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا (۳/۱۰۲) اللہ نے ان کے دلوں کو ایک دوسرے میں مدغم کر دیا اور دین کے ذریعہ انہیں ایک دوسرے کا بھائی بنا دیا۔ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ۔

اس کے بعد اس امت پر کیا گذری؟ یہ ایک حدیث ہے دلخراش اور داستان ہے جگر سوز۔ اس کے لئے، تفصیل میں گئے بغیر، قرآن کے الفاظ میں صرف اتنا سن لو کہ وَمَا تَفَرَّقُوا إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ (۴۲/۱۴) جس طرح امم سابقہ نے، وحی کے مل جانے کے بعد،

باھمی ضد اور سرکشی کے جذبے سے دین میں فرقے بنا ڈالے تھے ، یہ بھی فرقوں میں بٹ گئے ۔ قرآن کے اس قدر واضح ، بیّن اور صریح احکام و ھدایات ، تنبیہات و تاکیدات کی موجودگی میں ، امت کا فرقوں میں بٹ جانا یقیناً ایک تحیر انگیز واقعہ ہے ۔ لیکن اس حقیقت سے کسے انکار ہو سکتا ہے کہ اُمت فرقوں میں بٹی اور یہ فرقے اب تک موجود ھیں ۔ س مقام پر رہ رہ کر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ فرقوں میں بٹنے والے لوگ اپنی س روش کے جواز میں بالآخر کوئی تو دلیل پیش کرتے ھی ھوں گے ؟ جی ھاں ! وہ دلیل پیش کرتے ھیں ۔ غور سے سنو کہ وہ دلیل کیا ہے ؟ وہ کہتے ھیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا ہے کہ اِخْتِلَافُ اُمَّتِیْ رَحْمَةٌ ۔ (میری امت میر اختلاف رحمت ہے) ۔ تم نے سوچا سلیم ! کہ یہ بات کیا ھوئی ؟ یعنی وھی اختلاف جس کے متعلق قرآن نے واضح الفاظ میں کہا تھا کہ وہ خدا کا عذاب ہے ، باعث کفر ہے ، شرک ہے ۔ اسی اختلاف کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ (معاذ اللہ) رسول اللہ نے اسے باعث رحمت قرار دیا ہے ! جو شخص ذرا بھی قرآنی تعلیم سے مس رکھتا ھو ، وہ بلا ادنیٰ تامّل کہہ دے گا کہ عربی زبان کا یہ فقرہ کبھی رسول اللہؐ کا ارشاد نہیں ھو سکتا ۔ حضورؐ نے کبھی ایسا نہیں فرمایا ھوگا ۔ یہ ناممکن ہے کہ خدا ایک چیز کو عذاب قرار دے اور اس کا رسول اسے رحمت بتائے ۔ لیکن آپ یہ کچھ کہتے رھئے ۔ فرقہ پرست اپنی بات پر اڑے رہیں گے کہ نہیں ! رسول اللہؐ نے ایسا فرمایا اور ضرور فرمایا تھا ۔ یہ محض اس لئے کہ اسے حدیث رسول اللہؐ قرار نہ دیا جائے تو پھر فرقہ بندی کے جواز کی راہ کوئی نہیں رہ جاتی ۔ لیکن وہ جو قرآن نے کہا ہے کہ جو لوگ حقیقت کو طوعاً (بہ طیب خاطر) نہیں مانتے ، حقیقت اُن سے اپنے آپ کو کرھاً (مجبوراً) منوا لیتی ہے ۔ اس کی شہادت حال ھی میں ھمارے سامنے آئی ہے ۔ ھوا یہ کہ مرزایوں کے خلاف یہ اعتراض

کیا گیا کہ انہوں نے ایک نیا فرقہ بنا کر امت میں اختلاف پیدا کر دیا ہے۔ اس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ اگر ہمارے کسی عمل سے امت میں اختلاف پیدا ہو گیا ہے تو امت کو اس کے لئے ہمارا شکر گذار ہونا چاہئے، نہ کہ شکوہ سنج۔ اس لئے کہ حضورؐ نے فرمایا ہے کہ اختلاف امتی رحمة۔ لہٰذا ہمارا یہ نیا فرقہ امت کے لئے مزید رحمتوں کا باعث ہے۔

تم سوچو سلیم! کہ ان کے اس جواب کا جواب الجواب کیا ہو سکتا تھا؟ اس کے جواب میں (جمیعت اہل حدیث کے ترجمان ”الاعتصام“ کو) مجبوراً کہنا پڑا کہ ”اختلاف امتی رحمة“ کوئی حدیث ہی نہیں۔ اس لئے اسے سند میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن سلیم! اب اس فقرے کو حدیث نہ قرار دینے سے کیا حاصل؟ اس نے جس قدر تباہی مچانی تھی اس ایک ہزار برس میں مچا دی۔ اس نے امت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئیے۔ انہیں فرقوں اور گروہوں میں تقسیم کرکے مستقل جنگ و جدال کا سامان پیدا کر دیا۔ اس نے ان کی سلطنتیں تباہ کر دیں۔ ان کی شوکت و عظمت کو برباد کر دیا۔ ان کی دنیا اور عاقبت دونوں خراب کر دیں۔ ایسی عظیم ہلاکتوں اور تباہیوں کے بعد اگر اس حقیقت کا اعتراف کیا گیا کہ یہ فرمان رسولؐ نہیں ہے تو اس سے ان نقصانات کی تلافی کیا ہوگی؟ اس قسم کی ہیں سلیم! وہ وضعی حدیثیں جن کے متعلق میں کہا کرتا ہوں کہ یہ عجمی سازش کا نتیجہ ہیں اور یہ ہے وہ جرم جس کی پاداش میں مجھے گردن زنی اور کشتنی قرار دیا جاتا ہے۔

بہر حال، یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ فرقہ بندی کے جواز میں ”اختلاف امتی رحمة“ کو بطور دلیل پیش کیا گیا۔ لیکن اس میں ایک سقم تھا اور وہ یہ کہ اس کی رو سے تمام فرقے موجب رحمت، فلہٰذا حق پر قرار پا جاتے تھے اور فرقہ بندی اسے کبھی گوارا ہی نہیں کر سکتی کہ

ہر فرقے کو سچا سمجھا جائے۔ لہٰذا اس کے لئے ایک اور حدیث وضع کی گئی جس میں کہا گیا کہ حضور نے فرمایا تھا کہ میری امت میں تہتر فرقے ہوں گے۔ ان میں سے ایک فرقہ ناجی ہوگا۔ باقی سب جہنمی ہوں گے۔ تم نے غور کیا سلیم! کہ اس میں ''ایک فرقہ'' کی استثناء نے کس طرح ہر فرقہ کو مطمئن کر دیا کہ وہ بر سر حق ہے اور باقی سب باطل پر ہیں۔ قرآن نے فرقوں کے متعلق کہا تھا کہ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ہر فرقہ اس زعم ل میں رهتا ہے کہ وہ حق پر ہے۔ یعنی قرآن نے کلَ حزب (تمام فرقے) کہہ کر اس چور دروازے کو بند کر دیا۔ جس کے راستے فرقہ پرستی کا جھوٹا اطمینان داخل ہو سکتا تھا۔ لیکن اس وضعی روایت نے ''ایک فرقہ کی استثناء'' سے اس دروازے کو چوپٹ کھول دیا۔ چنانچہ ہماری ہزار سالہ تاریخ اس پر شاہد ہے کہ، اسی استثناء کی آڑ میں، ہر فرقہ اپنے آپ کو ناجی اور دوسرے فرقوں کو جہنمی قرار دینے کے ''جہاد عظیم'' میں مصروف چلا آ رہا ہے اور ان کے خون کے چھینٹوں کو اپنے لئے وجہ سرخروئی سمجھ رہا ہے۔ چنانچہ خود ہمارے ہاں آجکل جو کچھ ہو رہا ہے وہ اس داستان رنگیں کی زندہ شہادت ہے۔ علاوہ ان فسادات کے جو مختلف فرقوں میں برپا ہوتے رہتے ہیں، آئے دن اس قسم کی خبریں اخبارات میں شائع ہوتی رہتی ہیں کہ فلاں مقام پر فلاں فرقہ کے متبعین نے فلاں فرقہ کے امام کو قتل کر دیا اور فلاں مقام پر فریق مخالف کے خطیب کو مار دیا گیا۔ یہ اس امت کے ''دیندار'' طبقہ کا حال ہے جسے بہ نص صریح بتایا گیا تھا کہ

مَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَاؤُهٗ جَهَنَّمُ
خَالِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ

عَذَابًا عَظِیْمًا ($\frac{۴}{۹۳}$) ۔

> جو مسلمان کسی دوسرے مسلمان کو عمداً قتل کر دے تو اس کی سزا جهنم هے جس مین وہ رهے گا ۔ اس پر الله کا غذاب اور اس کی لعنت هوگی ۔ اور اس کے لئے الله نے سخت عذاب تیار کر رکھا هے ۔

———: o :———

همارے یه فرقے اب تک مسجدوں کی چاردیواری یا مناظرہ کے میدانوں تک محدود تھے اور اس قسم کی آوازیں بهر حال سننے میں آتی رهتی تھیں که فرقه بندی بڑے نقصان کا باعث هے ۔ مسلمانوں کو باهمی اتحاد اور اتفاق سے رهنا چاهیے ۔ لیکن اب همارے هاں ایک ایسی تبدیلی واقع هوئی هے جس سے فرقوں کی پوزیشن یکسر بدل گئی هے ۔ هماری جمهوریهٔ اسلامیهٔ پاکستان نے جو دستور مرتب کیا هے، اور جسے خیر سے اسلامی دستور قرار دیا گیا هے، اس میں ''مسلمانوں کے ان مسلمه فرقوں'' کو آئینی سند عطا کر دی گئی هے ۔ یعنی اسلامی دستور اور اس میں فرقوں کی آئینی حیثیت ! یا ویلنا ویا للعجب !! یه وہ دستور هے جس پر هماری مذهبی جماعتوں نے چراغاں کیا تھا* ۔

چیست یارانِ طریقت بعد ازیں تدبیر ما ؟

(۹) اب سوال یه هے که ان حالات میں کیا کیا جائے ؟ فرقے بهر حال موجود هیں اور ان میں سے کوئی بھی اپنے آپ کو مٹانے کے لئے تیار نہیں ۔ هر فرقه ، فرقے مٹانے کی تدبیر یه بتاتا هے که دوسرے فرقے اپنے آپ کو اس فرقے میں شامل کر لیں ۔ اور یه ظاهر هے که اس کے لئے کوئی فرقه بھی تیار

---

* لله الحمد که یه دستور اکتوبر ۱۹۵۸ء میں منسوخ هو گیا ۔

نہیں ۔ للہذا سوال یہ ہے کہ اس مشکل کا حل کیا ہے ؟ یہ سوال بڑا اہم اور بڑا نازک ہے اس لئے اس پر گہرے غور و فکر کی ضرورت ہے ۔

(۱) قرآن کا دعویٰ ہے کہ وہ ہر قسم کے اختلافات کو مٹانے کے لئے آیا ہے ۔

(۲) اس پر ہمارا ایمان ہے ۔

(۳) قرآن ہمارے پاس اپنی اصلی شکل میں موجود ہے ۔

اب تم سوچو کہ اگر ہم اس کے بعد بھی یہ کہتے ہیں کہ ہمارے اختلافات مٹ نہیں سکتے اور فرقے ختم نہیں ہو سکتے تو اس کی زد کہاں جا کر پڑتی ہے ؟ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ (معاذاللہ) قرآن میں اب اس کی صلاحیت نہیں کہ وہ اختلافات کو مٹا سکے ۔ میں یہ پوچھتا ہوں کہ کیا ہم میں سے کوئی بھی ایسا کہنے کی جرآت کر سکتا ہے ؟ لیکن اگر ہم یہ کہتے ہیں کہ اب ہمارے فرقے مٹ نہیں سکتے تو اس کے معنی اس کے سوا اور کیا ہو سکتے ہیں کہ ہم عملاً اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ قرآن کا یہ دعویٰ صحیح نہیں کہ وہ فرقوں کو مٹا سکتا ہے ! اگر قرآن کی صداقت پر ہمارا ایمان ہے تو ہمیں سب سے پہلے اس خیال کو دماغ سے نکال دینا ہوگا کہ قرآن کے ہوتے ہوئے فرقے نہیں مٹ سکتے ۔ یاد رکھئے ! قرآن کا ہر دعویٰ سچا ہے اور اس میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ اختلافات کو مٹا دے ۔ اس کے بعد سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ وہ طریق کیا ہے جس کے مطابق قرآن اختلافات کو مٹاتا ہے ؟

آج سے کچھ عرصہ پیشتر ہمارے ہاں (پنجاب میں) ایک جماعت* پیدا ہوئی جس کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ خالص قرآن پر عمل کرے گی اور اس طرح

---

* فرقۂ اہل قرآن ۔

مسلمانوں میں پیدا شدہ اختلافات کو مٹا دے گی۔ یہ مقصد بڑا نیک اور یہ دعویٰ بہت مبارک تھا۔ لیکن اس کا جو عملی نتیجہ ہمارے سامنے آیا وہ اس سے بالکل مختلف تھا۔ اس سے سابقہ فرقوں کا مٹنا تو کجا، ان میں ایک اور فرقے کا اضافہ ہو گیا۔ ہمارے لئے ان حضرات کی نیت پر شبہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ لیکن چونکہ اختلافات مٹانے کے لئے قرآن نے جو طریق بتایا تھا وہ ان کی نگاہوں سے اوجھل رہا، اس لئے ان کی یہ کوشش ناکام رہی۔ بد قسمتی یہ کہ اس ناکامی نے خود قرآن کے مشن کو بڑا نقصان پہنچایا۔ اس طرح کہ اب اگر کسی سے کہا جاتا ہے کہ ہمارے اختلافات قرآن کی رو سے مٹ سکتے ہیں تو وہ اس کے جواب میں طنزاً اور یا ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہہ دیتا ہے کہ صاحب! یہ نسخہ بھی آزمایا جا چکا اور ناکام ثابت ہو چکا ہے۔ یعنی ان حضرات کی ناکامی نے خود قرآن کے متعلق یہ خیال پیدا کر دیا کہ (معاذاللہ) اس میں اس کی صلاحیت ہی نہیں رہی کہ یہ اختلافات کو مٹا سکے۔

۱۰۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن ان اختلافات کے مٹانے کا کیا طریق بتاتا ہے؟

سب سے پہلے تو یہ سمجھ لو کہ قرآن یہ کہتا ہے کہ وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهُ اِلَى اللهِ (۳۲/۱۰)۔ جس معاملہ میں بھی تمہیں اختلاف ہو اس کا فیصلہ (حکم) اللہ کی طرف سے ہونا چاہئے۔ اس میں "حکم" کا لفظ غور طلب ہے۔ یعنی یہ انفرادی چیز نہیں کہ دو آدمیوں میں کسی مسئلہ میں اختلاف ہو اور وہ اپنے طور پر قرآن سے فیصلہ لینے کے لئے بیٹھ جائیں۔ متنازعہ فیہ امور میں حکم یا فیصلہ ہمیشہ تیسرے مقام سے ملا کرتا ہے،

اسے حَکم یا ثالث کہتے ہیں ۔ اسی مقصد کے لئے قرآن نے رسول اللہ ص سے کہا تھا کہ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِيٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا (٤/٦٥)۔ تیرا رب اس حقیقت پر شاهد ہے کہ یہ کبھی صاحب ایمان نہیں کہلا سکتے جب تک یہ اپنے اختلافی امور میں تجھے اپنا (فیصلہ دینے والا) تسلیم نہ کریں ۔ اور پھر جو فیصلہ یہاں سے صادر ہو اس کے خلاف اپنے دل میں بھی کوئی گرانی محسوس نہ کریں ، بلکہ اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں ۔

یعنی قرآن سے فیصلہ انفرادی طور پر نہیں لیا جائے گا بلکہ اس کے لئے ایک زندہ اور محسوس ثالث اور حاکم کی ضرورت ہو گی ۔ اس فیصلہ کرنے والی اتھارٹی کو قرآن میں ”اللہ اور رسول ص“ کی جامع اصطلاح سے تعبیر کیا گیا ہے ۔ چنانچہ اس آیت سے چند آیات پہلے ہے يَا اَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا اَطِيعُوا اللّٰهَ وَاَطِيعُوا الرَّسُولَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۔ اے جماعت مومنین ! تم اللہ اور رسول کی اطاعت کرو اور تم میں سے جنہیں (اللہ اور رسول ص کی طرف سے) صاحب اختیار بنایا جائے ان کی اطاعت کرو ۔ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُولِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ...(٤/٥٩)۔ اور اگر تم میں کسی معاملہ میں اختلاف پیدا ہو جائے تو (اسے اپنے طور پر حل کرنے کی کوشش نہ کرو بلکہ) اسے ”اللہ اور رسول ص“ کی طرف لوٹا دو ۔ اگر تم ایسا کرو گے تو سمجھا جائیگا کہ تمہارا اللہ اور آخرت پر ایمان ہے۔ اس کے معنی صاف طور پر یہ ہیں کہ دو افراد میں اختلاف تو ایک طرف، اگر افسران ماتحت کے کسی فیصلہ سے بھی اختلاف ہو تو اسے قرآنی نظام کی

مرکزی اتھارٹی (اللہ اور رسولؐ) کی طرف لوٹا دو، یہی شرط ایمان ہے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے گا تو یہ کفر ہو جائے گا۔

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ قرآن نے تفرقہ اور اختلاف کو کفر سے تعبیر کیا ہے۔ اس کفر سے محفوظ رہنے کی عملی شکل یہ بتائی گئی ہے کہ اُمت کے پاس قرآن ہو اور قرآن کی روشنی میں فیصلہ دینے والا رسولؐ۔ چنانچہ سورۂ آل عمران میں ہے وَكَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَاَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيَاتُ اللّٰهِ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ (۳/۱۰۰) تم کس طرح کفر میں مبتلا ہو سکتے ہو جب کہ حالت یہ ہے کہ:

(۱) تمہارے پاس کتاب اللہ موجود ہے۔ اور

(۲) اس کے ساتھ تم میں اُس کا رسولؐ موجود ہے۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ جب تک اُمت میں (۱) قرآن اور (۲) رسولؐ موجود ہو، فرقے پیدا نہیں ہو سکتے۔

(۳) اس سے ہمارے سامنے ایک اور سوال آ گیا۔ اور وہ یہ کہ قرآن کی ان آیات سے تو یہ معلوم ہوا کہ رسول اللہؐ کی موجودگی (یعنی زندگی) تک اُمت نے فرقوں سے بچے رہنا تھا، لیکن آپ کے بعد فرقوں سے محفوظ رہنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ کیونکہ فرقوں سے بچنے کے لئے قرآن اور رسولؐ دونوں کی موجودگی کی ضرورت تھی اور جب ان میں سے ایک جزو (رسولؐ) موجود نہ رہا تو اس حفاظت کی شکل بھی باقی نہ رہی۔

قرآن کہتا ہے کہ تم نے بات کو صحیح طور پر نہیں سمجھا۔ تم اس خیال میں ہو کہ ''رسولؐ کی موجودگی'' سے مراد یہ ہے کہ جب تک محمد رسول اللہؐ

تم میں زندہ موجود ہیں اس وقت تک یہ شکل باقی رہے گی ۔ جب وہ وفات پا جائیں گے تو پھر "رسول" موجود نہیں رہے گا ۔ یہ بات غلط ہے ۔ یہ سلسلہ رسول ص کی طبعی زندگی سے مشروط نہیں، اس کے بعد بھی قائم رہے گا ۔ چنانچہ سورۂ آل عمران میں یہ کہہ کر اس کی صراحت کر دی گئی کہ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۔ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۔ اَفَاِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰی اَعْقَابِكُمْ ۔ محمد ص بجز ایں نیست کہ اللہ کا رسول ہے ۔ اس سے پہلے بہت سے رسول (اپنا فریضۂ پیغام رسانی ادا کرنے کے بعد) دنیا سے چلے گئے ۔ سو اگر (کل کو) یہ وفات پا جائے یا قتل کر دیا جائے، تو کیا تم (یہ سمجھ کر کہ یہ نظام اسکی زندگی تک محدود تھا) پھر اپنی سابقہ روش کی طرف لوٹ جاؤ گے؟ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰی عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا (٣/١٣٣) جو (رسول کی وفات پر) اپنی سابقہ روش پر لوٹ جائے گا تو وہ اللہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا (اپنا ہی کچھ بگاڑے گا) ۔

اس سے بات بالکل واضح ہو گئی ۔ یعنی یہ کہ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ سے مراد رسول اللہ ص کی طبعی زندگی نہیں ۔ آپ کی وفات کے بعد بھی یہ سلسلہ بدستور باقی رہ سکتا تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے حضور ص کو خَاتَمُ النَّبِيّٖنَ کہا ہے ۔ یعنی نبوت آپ کی ذات پر ختم ہو گئی ۔ لیکن "رسالت*" آپ کے بعد بھی جاری رہے گی ۔ نبوت کے معنی ہیں خدا کی طرف سے وحی پانا اور رسالت سے

---

* رسالت سے میری مراد دین کو آگے پہنچانا یا اسے عملاً قائم کرنا ہے ۔ اس سے مراد خدا کی طرف سے وحی حاصل کرکے لوگوں تک پہنچانا نہیں ۔ اس قسم کی رسالت حضور ص کے بعد ختم ہو گئی ہے ۔

مراد ہے اس وحی کو آگے پہنچانا۔ اس کے مطابق نظام قائم کرنا۔ متنازعہ فیہ امور میں فیصلے دینا، وغیرہ وغیرہ۔ چنانچہ جب رسول اللہؐ وفات پا گئے، تو اُمت میں کہرام مچ گیا۔ ایسا ہونا فطری امر تھا۔ شدت جذبات میں، بعض لوگوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ جس نظام کو رسول اللہؐ نے قائم فرمایا تھا، اب وہ ختم ہو گیا کیونکہ اس کے لئے وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ کی شرط تھی۔ اس غلط فہمی کو رفع کرنے کے لئے حضرت ابوبکر صدیقؓ برسرِ منبر تشریف لائے اور ''فیکم رسولہ'' کا قرآنی مفہوم اس انداز سے سمجھا دیا کہ اس سے بہتر انداز کوئی ہو نہیں سکتا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ اَيُّهَا النَّاسُ! مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يَعْبُدُ مُحَمَّدًا فَاِنَّهٗ قَدْ مَاتَ۔ وَمَنْ كَانَ يَعْبُدُ اللّٰهَ فَاِنَّهٗ حَيٌّ لَا يَمُوْتُ۔ اے لوگو! جو تم میں سے محمدؐ کی محکومیت اختیار کئے تھا اسے معلوم ہونا چاہئے کہ اس کا معبود وفات پا گیا ہے۔ لیکن جو خدا کی محکومیت اختیار کئے تھا تو اس کا معبود زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اس کے بعد آپ نے وہی آیت پڑھی جو اُوپر بیان کی جا چکی ہے۔ یعنی وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ..... اس سے حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آ گئی۔ سمجھ گئے سلیم! کہ رسول اللہؐ کی وفات کے بعد یہ نظام کس طرح قائم رہے گا۔ چنانچہ وہ اُٹھے اور اُنہوں نے فوراً خلیفۃ الرسولؐ (یعنی رسول اللہ کے جانشین) کا انتخاب کیا اور اس طرح رسول اللہؐ کی وفات سے جو خلا پیدا ہو گیا تھا اُسے پر کر لیا۔ اس لئے کہ یہ ظاہر ہے کہ کسی کے جانشین کی موجودگی، خود اس کی اپنی موجودگی ہوتی ہے۔ اس طرح اُمت میں ''قرآن اور رسولؐ'' بدستور موجود رہا۔

اس مقام پر اتنا اور واضح کر دینا ضروری ہے کہ رسول اللہؐ کی وفات کے بعد فریضۂ رسالت کی ادائیگی در حقیقت پوری اُمت کے ذمے عائد ہوتی تھی۔

اس لئے کہ قرآن نے واضح الفاظ میں بتا دیا تھا کہ:

(۱) کتاب اللہ کی وارث امت ہے، نہ کہ کوئی ایک فرد۔ سورۂ فاطر میں ہے وَالَّذِیْ اَوْحَیْنَا اِلَیْکَ مِنَ الْکِتٰبِ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ۔ اِنَّ اللّٰهَ بِعِبَادِهٖ لَخَبِیْرٌ بَصِیْرٌ۔ اللہ وہ ہے جس نے تیری طرف (اے رسولؐ) یہ کتاب نازل کی جو ان حقیقتوں کو سچ کر دکھانے والی ہے، جو اس کے سامنے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ رسولؐ کے بعد کیا ہوگا؟ اس کے لئے اس خدا نے جو اپنے بندوں کے تمام حالات سے با خبر ہے کہا یہ کہ ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْکِتٰبَ الَّذِیْنَ اصْطَفَیْنَا مِنْ عِبَادِنَا ($\frac{۳۵}{۳۱ - ۳۲}$)۔ پھر ہم نے اس کتاب کی وراثت کے لئے اپنے بندوں میں سے (اس امت کو) منتخب کر لیا ہے۔ یعنی پہلی بات یہ ہے کہ قرآن کی وارث پوری امت ہے۔ اس کے بعد آگے بڑھئے۔

۲- رسول اللہؐ کا فریضہ یہ تھا کہ یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْکَرِ ($\frac{۷}{۱۵۷}$)۔ وہ معروف کا حکم دیتا تھا اور منکر سے روکتا تھا۔ اب یہی فریضہ امت کی طرف منتقل ہو گیا۔ چنانچہ سورۂ آل عمران میں ہے کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ …… ($\frac{۳}{۱۰۹}$) تم بہترین امت ہو جسے نوع انسان کی فلاح و بہبود کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ تمہارا فریضہ یہ ہے کہ تم معروف کا حکم دو۔ اور منکر سے روکو۔

دیکھا سلیم! ان حقائق سے واضح ہے کہ رسول اللہؐ کی جانشین درحقیقت

پوری کی پوری اُمت ہے ۔ عملی انتظام کی سہولت کے لئے اُمت اپنے میں سے بہترین فرد کو اپنا نمائیندہ بنا کر اس سلسلہ کو قائم رکھتی ہے ۔ اس طرح اُمت میں ”کتاب اور رسول“ بدستور باقی رہتے ہیں ۔ ان کی موجودگی میں اختلافات کے رونما اور فرقوں کے پیدا ہونے کا امکان ہی نہیں رہتا ۔ چنانچہ تاریخ اس پر شاہد ہے کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں نہ کوئی اختلاف پیدا ہوا، نہ کسی فرقے نے جنم لیا ۔ اس لئے کہ اس دور میں کوئی ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ کسی اختلافی معاملہ کے تصفیہ کے لئے افراد اُمت از خود فیصلہ کرنے پر بیٹھ گئے ہوں ۔ اختلافی امور میں مرکزی اتھارٹی کی طرف رجوع کیا جاتا تھا اور اس کے فیصلوں کی اطاعت سب پر لازم تھی ۔

یہیں سے ہمیں اُس سوال کا جواب مل جاتا ہے جس کی طرف میں نے شروع میں اشارہ کیا تھا ۔ یعنی یہ سوال کہ اُمت ایک طریق پر قائم ہے ۔ کچھ لوگ اس طریق سے اختلاف کرکے الگ فرقہ بنا لیتے ہیں ۔ اس صورت میں اُمت دو فرقوں میں بٹ گئی ۔ جن لوگوں نے الگ فرقہ بنا لیا ، وہ تو یقیناً مجرم ہیں ۔ لیکن جو پہلے طریق پر قائم رہے اُنہیں تو مجرم نہیں قرار دیا جا سکتا ؟ بالکل ٹھیک ہے ۔ یہ ہے وہ دلیل جسے ہر فرقہ کی طرف سے یہ کہہ کر پیش کیا جاتا ہے کہ ہم اصلی اور حقیقی اسلام پر قائم ہیں اور الگ فرقے دوسروں نے بنائے ہیں ۔ لیکن ایسا کہنے میں اس حقیقت کو فراموش کر دیا جاتا ہے کہ جب تک ” فیکم رسولہ “ کی کیفیت رہے ، یہ صورت جسے یوں بیان کیا جاتا ہے ، پیدا نہیں ہو سکتی ۔ اُس وقت اگر کوئی جماعت اُمت سے اختلاف کرے گی تو رسولؐ کا جانشین ، قرآن کے اس حکم کے ماتحت کہ ، اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا

دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ (٦/١٦٠) اس امر کا اعلان کردے گا کہ اُمت کو نئے فرقہ سے کوئی سروکار نہیں ۔ لہذا وہ آمت کا فرقہ کہلا ہی نہیں سکے گا ۔ اُسے مسلمانوں سے کچھ واسطہ ہی نہیں رہے گا ۔ وہ اسلام کے دائرہ سے خارج ہوگا ۔ اس لئے آمت ، آمت واحدہ ہی رہے گی ۔

بہر حال یہ تھی وحدت آمت کی وہ عملی شکل جسے قرآن نے رسول اللہص کی وفات کے بعد تجویز کیا تھا اور جسے حضورص کی وفات کے بعد اختیار کیا گیا ۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد یہ صورت قائم نہ رہی ۔ خلافت کی جگہ ملوکیت نے لے لی ۔ سلاطین نے اپنی مصلحتوں کے ماتحت ، سیاست کو مذہب سے الگ کر لیا ۔ اس یکسر غیر قرآنی تقسیم کی رو سے ، سیاست سے متعلق امور کے فیصلے بادشاہ خود کرتے تھے ۔ باقی رہی شریعت ، سو اس کے متعلق اس کے سوا کوئی صورت ہی نہ تھی کہ لوگ انفرادی طور پر فیصلے کرتے ۔ اس ضمن میں ایک اور دشواری سامنے آئی ۔ قرآن نے ''اللہ اور رسولص'' کی اطاعت کا حکم دیا تھا ۔ ''اللہ اور رسولص'' کا جو مفہوم قرآنی نظام میں لیا جاتا تھا ، اس مفہوم کی اب گنجائش ہی نہ تھی ۔ اس لئے کہ اب وہ نظام ہی باقی نہ تھا ۔ لہذا اب '' اللہ اور رسول '' کی اطاعت کا کوئی نیا مفہوم لیا جانا ناگزیر ہو گیا ۔ اللہ کی اطاعت کے متعلق تو سمجھ لیا گیا کہ اس سے مراد کتاب اللہ کی اطاعت ہے ۔ لیکن رسولص کی اطاعت کس طرح کی جائے ، یہ سوال مشکل تھا ۔ اس کے حل کے لئے اس کے سوا کوئی اور صورت نظر نہیں آتی تھی کہ حضورص کی احادیث کی طرف رجوع کیا جائے ۔ زمانۂ خلافت میں چونکہ اطاعت رسولص کا عملی مفہوم سامنے تھا اس لئے احادیث کے جمع اور مرتب کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی تھی ۔ لیکن اب اس کی ضرورت پڑ گئی ۔ لہذا احادیث کے مجموعے مرتب کئے گئے ۔ اب '' اللہ اور رسولص '' کی اطاعت کا طریقہ یہ قرار پایا کہ

قرآن اورحدیث کی رو سے متنازعہ فیہ امور کے فیصلے انفرادی طور پر کئے جائیں۔ ان انفرادی فیصلوں میں اختلاف ناگزیر تھا۔ اس لئے مختلف فرقوں کے نزدیک ’’قرآن اور حدیث‘‘ کے فیصلے مختلف ہو گئے۔ ان اختلافات کو مٹانے کے لئے مناظرے اور مباحثے شروع ہو گئے۔ اس کا جو نتیجہ نکلا وہ ہمارے سامنے ہے۔ یعنی — مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی — چنانچہ آج حالت یہ ہے کہ اُمت میں بیسیوں فرقے موجود ہیں اور ہر فرقہ خدا اور رسولؐ کی اطاعت کا مدعی اور حقیقی اسلام پر کاربند ہونے کا دعویدار ہے۔ اور چونکہ اختلافات مٹانے والی کوئی زندہ اتھارٹی موجود نہیں، یعنی ’’فیکم رسولہ‘‘ کی شکل باقی نہیں، اس لئے کوئی فیصلہ نہیں دے سکتا کہ کون غلط کہتا ہے اور کون صحیح؟

میرا خیال ہے سلیم! بلکہ اب ہم خود بخود اس مقام تک پہنچ گئے ہیں جہاں ہمیں اس سوال کا جواب مل جائے کہ اُمت میں وحدت پیدا کرنے کی شکل کیا ہے؟ اس کی شکل یہ ہے کہ جس نظام کے گم ہو جانے سے فرقہ بندی شروع ہوئی تھی اس نظام کو پھر سے قائم کر دیا جائے۔ اس کے لئے پہلا قدم یہ ہے کہ اس فکر کو عام کیا جائے کہ فرقوں کی موجودگی اور اسلامی زندگی دو متضاد چیزیں ہیں جو، قرآن کی رو سے، ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔ اور فرقوں کو مٹا کر اسلامی زندگی پیدا کرنے کا طریق، قرآنی نظام کے قیام کے سوا اور کوئی نہیں۔ میرے سامنے یہی مقصد ہے اور اسی کے حصول کے لئے میں مصروف جد و جہد ہوں۔

لیکن اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ اب قرآنی نظام کے قیام کا کوئی امکان نہیں، تو اسے کم از کم اپنے آپ کو اس فریب میں مبتلا نہیں رکھنا چاہئے کہ ہماری موجودہ زندگی اسلامی زندگی ہے۔ یا (فرقوں کے باوجود)

اسلامی ہو سکتی ہے۔ مجھے اس کا احساس ہے کہ موجودہ مسلمان اس حقیقت کو سامنے لانے کے لئے بآسانی تیار نہیں ہوں گے۔ وہ اسے کبھی تسلیم نہیں کرنا چاہیں گے کہ فرقوں کی موجودگی میں اسلامی زندگی بسر نہیں ہو سکتی۔ ان کے نزدیک قابل قبول یہی مسلک ہوگا کہ تمام فرقوں میں سے ایک فرقہ حق پر ہے۔ ان میں سے ہر ایک کو اطمینان حاصل ہو جاتا ہے کہ جس فرقہ سے میں متعلق ہوں، وہ حق پر ہے۔ لٰہذا اس کے مطابق زندگی، اسلامی زندگی ہے۔ جو نظریہ ان سے اس اطمینان کو چھینتا ہے، وہ ان کے نزدیک قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ انہیں اس کے خلاف غصہ آتا ہے۔ لیکن ان کا یہ غصہ خود قرآن کے خلاف ہونا چاہئے جو فرقہ بندی کو شرک قرار دیتا ہے، نہ کہ اس کے خلاف جو قرآن کی اس تعلیم کو ان کے سامنے پیش کرتا ہے۔ یا تو انہیں یہ ثابت کرنا چاہئے کہ قرآن کی تعلیم یہ نہیں۔ اور اگر یہ اس کی تردید نہیں کر سکتے تو پھر ان کے برافروختہ ہوجانے سے قرآنی حقیقت تو اپنی جگہ سے بدل نہیں جائے گی۔ یاد رکھو سلیم! جب تک ہم اس تلخ حقیقت کو گوارا نہیں کر لیتے کہ فرقہ بندی کی زندگی قطعاً اسلامی زندگی نہیں، ہم قرآن کے بتائے ہوئے صراط مستقیم پر نہیں آ سکتے۔ قرآن کی رو سے صراط مستقیم ایک ہی ہے۔ جب اُمت مختلف راستوں پر چل نکلے تو پھر وہ صراط مستقیم کسی کے سامنے بھی نہیں رہتا۔ سورۂ انعام میں اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

وَأَنَّ هٰذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا فَاتَّبِعُوهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيلِهِ۔ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ

(٦/١٥٣) یاد رکھو! میرا یہی ایک سیدھا راستہ ہے۔ پس تم سب اس کا اتباع کرو۔ اس کے سوا دوسرے راستوں پر نہ چلو۔ وہ راستے تمہیں اس صراط مستقیم

سے متفرق اور پراگندہ کر دیں گے ۔ اللہ نے تمہیں اس کا حکم دیا ہے تاکہ تم دین کی نگہداشت کرو اور تفرقہ بازی کی تباہیوں سے بچو ۔

اس وقت تک میں نے صرف مذہبی فرقوں کے متعلق گفتگو کی ہے ، سیاسی پارٹیوں کے متعلق کچھ نہیں کہا ۔ لیکن ان کے متعلق کچھ جداگانہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں ۔ اسلام میں مذہب اور سیاست الگ الگ شعبے نہیں ۔ اس لئے تفرقہ ، مذہبی فرقوں کی شکل میں ہو یا سیاسی پارٹیوں کی صورت میں ، اس کی حیثیت یکساں ہے ۔ قرآن کی رو سے سیاسی پارٹی بازی کتنا بڑا جرم ہے اس کا اندازہ اس سے لگاؤ کہ حضرت موسیٰؑ سے (عطائے نبوت کے بعد) کہا گیا کہ ہم نے تمہیں ایک خاص مشن کے لئے منتخب کیا ہے ۔ اس لئے اب اس مہم کے سر کرنے کے لئے تیار ہو جاؤ اور فرعون کو اس کی دست درازیوں سے روکو ۔ فرعون کا وہ جرم کیا تھا جس کی وجہ سے اس کے خلاف اس قدر اہم اور شدید کارروائی کی ضرورت پڑ گئی ؟ حضرت موسیٰؑ سے کہا گیا کہ اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِی الْاَرْضِ ۔ فرعون نے سخت سرکشی اختیار کر رکھی ہے، اس نے اودھم مچا رکھا ہے ، اس نے انسانیت کو تباہ کر دیا ہے ! اس نے کیا یہ ہے کہ جَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا (۲۸/۴) اس نے باشندگان ملک کو پارٹیوں میں تقسیم کر دیا ہے ۔

تم نے غور کیا سلیم ! کہ پارٹی بازی عدالت خداوندی میں کتنا بڑا سنگین جرم ہے ۔ سورۂ انعام میں ہے کہ جس قوم پر ، اس کے جرائم کی پاداش میں خدا کا عذاب مسلط ہوتا ہے اس کی شکلیں مختلف ہوتی ہیں ۔ قُلْ

هُوَ الْقَادِرُ عَلٰى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ - کبھی تو یہ ہوتا ہے کہ اس قوم پر اس قسم کے حاکم مسلط ہو جاتے ہیں جو ظلم و استبداد سے ان کا کچومر نکال دیتے ہیں - اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ کبھی یہ ہوتا ہے کہ قوم کے نچلے طبقہ (عوام) میں اضطراب اور عدم اطمینان اس شدت تک پہنچ جاتا ہے کہ وہ قانون شکنی اور فساد انگیزی پر اُتر آتے ہیں اور اس طرح معاشرہ کا نظام تہ و بالا ہو جاتا ہے - اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ یا ایسا ہوتا ہے کہ خواص اور عوام مل کر مخلوط پارٹیاں بنا لیتے ہیں - ہر ایک لیڈر اپنے اپنے پیچھے کچھ بھیڑیں لگا لیتا ہے اور پھر یہ پارٹیاں ایک دوسرے سے لڑتی رہتی ہیں - اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ (٦/٦٥) - غور کرو کہ ہم کس طرح مختلف پہلوؤں کو سامنے لا کر حقیقت کو واضح کرتے ہیں تاکہ یہ لوگ بات کو سمجھ سکیں -

لہٰذا مذہبی فرقے ہوں یا سیاسی پارٹیاں، قرآن کی رو سے دونوں خدا کا عذاب ہیں - لیکن پارٹیوں کا مٹانا ایسا مشکل نہیں ہوتا - ایک عمدہ نظام میں پارٹیوں کو آسانی سے ختم کیا جا سکتا ہے - اصل دشواری مذہبی فرقوں کے مٹانے میں پیش آتی ہے کیونکہ اس کی مخالفت میں عوام کے مقدس جذبات کو اُبھارا جاتا ہے - اس کا علاج سوائے قرآنی نظام کے احیاء کے اور کچھ نہیں - ؎

وہی دیرینہ بیماری، وہی نا محکمی دل کی
علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی

کیوں سلیم ! قرآن کا بتایا ہوا علاج سمجھ میں آیا ؟ اس سے اطمینان ہوا یا نہیں ؟ ہوگا کیوں نہیں ، تم تو قلب سلیم رکھتے ہو۔

اچھا خدا حافظ !

والسلام
پرویز
جنوری ۱۹۵۸ء

———— : 0 : ————

(باقی خطوط کے لئے تیسری جلد ملاحظہ فرمائیے)

سلیم کے نام خطوط

کی تیسری جلد

عنقریب شائع ہو جائے گی - پہلے خیال تھا کہ یہ سلسلہ دو جلدوں میں مکمل ہو جائے گا - لیکن ابھی بہت سے خطوط باقی ہیں جو تیسری جلد میں شائع کئے جائیں گے - عنوانات ملاحظہ ہوں -

۱- علماء کون ہیں ؟
۲- تصوف کی تاریخ -
۳- صوفیائے کرام -
۴- تصوف اور قرآن -
۵- قوموں کے تمدن پر جنسیات کا اثر -
۶- تقدیر امم کیا ہے ؟
۷- فقط ایک بار دیکھا ہے -
۸- ہماری تاریخ -
۹- اسلام آگے کیوں نہ چلا ؟

ہو سکتا ہے کہ اس جلد کی اشاعت کے وقت تک ان میں کچھ اور خطوط کا اضافہ ہو جائے - تفصیل کے لئے ایک کارڈ لکھئے -

طابع :
زریں آرٹ پریس لاہور
۶۱ - ریلوے روڈ،

شائع کردہ
اِدارۂ طلوعِ اسلام ۲۵-بی-گلبرگ-لاہور

Author Parv
Title S
MH1 .P276sr